تاریخِ پاکستان اور حکمرانوں کا کردار

شیخ الحدیث مولانا محمد علی جانباز دامت برکاتہم



مکتبہ رحمانیہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب ....

- عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد آپ لوڈ (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشرواشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

☆ تنبیه ☆

- کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔
- ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی وشرعی جرم ہے۔

﴿اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں﴾

- نشرواشاعت، کتب کی خرید وفروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔

kitabosunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّأُولِي الْأَبْصَارِ

یقیناً اس میں عقل والوں کے لیے بڑی عبرت ہے

تاریخ پاکستان اور حکمرانوں کا کردار

شیخ الحدیث مولانا محمد علی جانباز دامت برکاتہم



www.KitaboSunnat.com

مکتبہ رحمانیہ
ناصر روڈ سیالکوٹ
Ph:052-4591911
Mob:03006161913

نام کتاب

تاریخِ پاکستان اور حکمرانوں کا کردار

تالیف

شیخ الحدیث مولانا محمد علی جانباز دامت برکاتہم

سال اشاعت	اگست 2007ء
ناشر	مکتبہ رحمانیہ
طبع	اوّل
تعداد	1100
قیمت	

ملنے کے پتے

مکتبہ نعمانیہ: اردو بازار گوجرانوالہ

مکتبہ قدوسیہ: رحمان مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور

نعمانی کتب خانہ: اردو بازار لاہور

والی کتاب گھر: اردو بازار لاہور

مکتبہ رحمانیہ ناصر روڈ سیالکوٹ
Ph:052-4591911
Mob:03006161993

۹۹-۰۰

فہرست

شیخ الحدیث مولانا محمد علی جانباز حفظہ اللہ

ولادت باسعادت:

مولانا محمد علی جانباز حفظہ اللہ ۱۹۳۴ء میں مشرقی پاکستان کے ضلع فیروزپور (بھارت) کے قصبہ بُدھو چک میں پیدا ہوئے۔آپ کے والد محترم کا نام حاجی نظام الدین ہے اور آپ کا تعلق راجپوت وٹو برادری سے ہے۔

تعلیم کا آغاز:

مولانا محمد علی جانباز حفظہ اللہ نے تعلیم کا آغاز اپنے قصبہ ہی کی مسجد سے کیا۔ یہاں آپ کے استاد مولانا محمد رحمۃ اللہ علیہ تھے۔قرآن مجید کے ساتھ ساتھ علوم دینیہ کی ابتدائی کتابیں بھی انہیں سے پڑھیں اور بعد ازاں اپنے استاد محترم محمد رحمۃ اللہ علیہ کی ترغیب پر ۱۹۵۱ء میں آپ مدرسہ تعلیم الاسلام اوڈانوالہ ضلع فیصل آباد میں داخل ہوئے۔ یہاں پر آپ نے فضیلۃ الشیخ حضرت مولانا محمد صادق خلیل رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یعقوب قریشی رحمۃ اللہ علیہ سے مختلف فنون کی کتابیں پڑھیں۔ ۱۹۵۳ء میں آپ جامعہ اسلامیہ گوجرانوالہ میں تشریف لے گئے۔ وہاں پر آپ نے شیخ العرب والعجم استاد العلماء حضرت العلام حافظ محمد محدث گوندلوی رحمۃ اللہ علیہ اور استاد العلماء محدث العصر حضرت الشیخ مولانا ابوالبرکات احمد مدراسی رحمۃ اللہ علیہ سے کسب فیض کیا۔ یہاں سے فراغت کے بعد ۱۹۵۸ء میں جب جامعہ سلفیہ کا باقاعدہ آغاز ہوا تو آپ حضرت العلام حافظ محمد گوندلوی رحمۃ اللہ علیہ کے ہمراہ جامعہ سلفیہ فیصل آباد تشریف لے گئے۔ جامعہ سلفیہ میں آپ نے حافظ محمد گوندلوی رحمۃ اللہ علیہ سے صحیح بخاری، مؤطا امام مالک، حجۃ اللہ البالغہ، سراجی اور کئی ایک کتابوں کا درس لیا۔ حافظ محمد گوندلوی

رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ آپ نے جامعہ سلفیہ میں ہی فضیلۃ الشیخ حضرت مولانا شریف اللہ خان سواتی اور حضرت مولانا پروفیسر غلام احمد حریری رحمۃ اللہ علیہ سے بھی استفادہ کیا۔ اور اسی اثنا میں آپ نے پنجاب یونیورسٹی سے فاضل عربی اور فاضل فارسی کے امتحانات بھی پاس کیے۔

تدریس کی ابتداء:

فارغ التحصیل ہونے کے بعد ۱۹۵۸ء میں حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک پر آپ نے جامعہ سلفیہ فیصل آباد سے ہی اپنے تدریسی دور کا آغاز کیا۔

۱۹۶۲ء میں مولانا جانباز سیالکوٹ تشریف لے آئے۔ یہاں پر آپ نے پہلے پہل مدرسہ دارالحدیث جامع مسجد اہلحدیث ڈپٹی باغ میں درس وتدریس شروع کی دو سال بعد یہ مدرسہ ڈپٹی باغ والی مسجد سے مسجد اہل حدیث ابراہیمی میانہ پورہ منتقل ہو گیا۔ اور مدرسہ کا نام دارالحدیث سے تبدیل ہو کر جامعہ ابراہیمیہ رکھا گیا اور مولانا محمد علی جانباز حفظہ اللہ کے درس وتدریس کا سلسلہ جاری وساری رہا اور آپ کی شب وروز کی محنت کی وجہ سے جامعہ ابراہیمیہ ترقی کے منازل طے کرتا رہا۔

۱۹۷۰ء میں مولانا محمد علی جانباز حفظہ اللہ نے جامعہ ابراہیمیہ کو جامع مسجد اہل حدیث محلہ لاہوری شاہ ناصر روڈ پر منتقل کیا۔ ۱۹۷۹ء تک آپ اسی مسجد میں درس وتدریس کا کام سرانجام دیتے رہے اور ۱۹۸۰ء میں جامعہ ابراہیمیہ کو مستقل طور پر الگ عمارت میں منتقل کیا اور بعد میں اس کا نام ابراہیمیہ سے تبدیل کر کے جامعہ رحمانیہ رکھا گیا۔ جو الحمد للہ ابھی تک اللہ کے فضل وکرم اور مولانا محمد علی جانباز حفظہ اللہ کی انتھک محنت اور کاوش کی وجہ سے کتاب وسنت کی تعلیمات کو پھیلانے کے لیے سرگرم عمل ہے۔

مضمون نگاری:

مولانا محمد علی جانباز ؒ نے اپنے زمانہ طالب علمی میں ہی مضمون نگاری کا آغاز کر دیا تھا۔ چنانچہ آپ نے مختلف موضوعات پر جماعت اہل حدیث کے رسائل و جرائد میں مضامین کا سلسلہ شروع کیا۔

تصانیف:

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد علی جانباز ؒ نے مختلف مضامین کے علاوہ مختلف عنوانات پر مستقل کتابیں بھی لکھی ہیں جن میں سے شُہرہ آفاق کتاب اِنجاز الحاجہ شرح ابن ماجہ (۱۲ جلدیں) ،اہمیت نماز، صلوۃ المصطفیٰ ﷺ، معراجِ مصطفیٰ، آلِ مصطفیٰ ﷺ، توہین رسالت کی شرعی سزا، اَحکامِ نکاح، اَحکامِ طلاق، حُرمتِ مُتعہ بجوابِ جواز متعہ اور تاریخ پاکستان اور حکمرانوں کا کردار قابل ذکر ہیں۔

مولانا کی شخصیت:

نابغہ عصر، فضیلۃ الشیخ، شیخ الحدیث، حضرت مولانا محمد علی جانباز ؒ جماعت اہلحدیث کے ممتاز عالمِ دین ہونے کے ساتھ ساتھ محقق، مؤرخ، مجتہد، فقیہ، ادیب اور دانشور ہیں۔ آپ کی ذات محتاجِ تعارف نہیں۔ آپ بلند پایہ خصوصیات کے حامل ہیں تمام علومِ دینیہ پر آپ کو یکساں دسترس حاصل ہے، تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ، اسماء الرجال، تاریخ وسیر، منطق وفلسفہ، لغت وادب اور صرف ونحو پر آپکو کامل عبور حاصل ہے۔ حدیث اور اسماء الرجال پر آپ کی نگاہ وسیع ہے۔ فقہ مذاہب اربعہ کے ساتھ ساتھ فقہ جعفریہ سے بھی آپ کو خوب شناسائی حاصل ہے۔

علومِ اِسلامیہ میں جامع الکمالات ہونے کے ساتھ ساتھ مولانا صاحب عادات

وخصائل کے اعتبار سے نہایت پاکیزہ انسان ہیں۔ عزت وشرافت اور قناعت آپ کی سیرت کا جوہرِ خاص ہے۔ زُہد وورع، تقویٰ وطہارت اور شمائل واخلاق میں سلف صالحین اور علماءِ ربانیین کے اوصاف کے حامل ہیں۔

عبادت وریاضت میں بھی آپ اپنی مثال آپ ہیں اور سب سے بڑھ کر آپ کی جو امتیازی خصوصیت ہے وہ یہ ہے کہ آپ متبع سنت ہیں اور سنتِ رسول ﷺ سے بہت زیادہ شغف رکھتے ہیں۔

مولانا جانباز حفظہ اللہ ایک کریم النفس اور شریف الطبع شخصیت کے حامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپکی تمام تر محنتوں اور کاوشوں کو شرف قبولیت سے نوازے اور آپ کا سایہ شفقت ہمارے سروں پر تادیر قائم ودائم رکھے۔ آمین

طالب دعا

حافظ محمد اشتیاق

۰۳۲۱۷۱۹۳۴۴۹

مارچ ۲۰۰۷ء جامعہ رحمانیہ، سیالکوٹ

مقدمہ

الحمد للہ وکفی والصلوۃ والسلام علی سید الأنبیاء والمرسلین وعلی اصحابہ اجمعین.

ہندوستان کے مسلمان یہ دل سے خواہش رکھتے تھے اور جانتے تھے کہ ان کی فلاح صرف اور صرف دینِ اسلام پر ہی چل کر ممکن ہے یہی ان کی زندگی کی سرخروئی کا موجب ہے اور آخرت کے درجات بھی اسی بنا پر ان کا مقدر بن سکتے ہیں۔ چنانچہ ان کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ ایک ایسا الگ وطن حاصل کیا جائے جس میں اسلامی احکامات پر چل کر اپنی زندگی بسر کرسکیں۔ جہاں اسلامی قوانین کا بول بالا ہو اور وہ اس وطن کو اپنی خواہشات کے مطابق اسلام کا قلعہ بنا دیں غرض کہ پاکستان بنانے کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ مسلمانانِ برصغیر اپنے لیے ایک الگ مسلم ریاست کا قیام عمل میں لائیں جہاں وہ اسلامی نظریہ کے مطابق اپنی زندگیاں گزار سکیں۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی مدد فرمائی اور انہوں نے اپنی خواہش کے مطابق الگ وطن بے پناہ جانی و مالی قربانیاں دینے کے بعد حاصل کیا۔ لیکن ہم نے اللہ کا شکر ادا نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ﴾. [ابراهیم:۷]

”اور جب سنا دیا تمہارے رب نے اگر تم شکر کرو گے تو میں تمہیں اور دوں گا اور اگر ناشکری کرو گے تو میرا عذاب بھی سخت ہے۔“

یہی وجہ ہے کہ پاکستان کی شکل میں عطیہ خداوندی ہمیں ملا۔ لیکن ہم نے یہاں نہ تو اللہ کا قانون نافذ کیا اور نہ ملک وقوم کے لیے ہم نے کوئی کام کیا۔ اسی وجہ سے ہم

اپنی نالائقی کی بنا پر آدھے ملک سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا ہے شکر کرو گے تو میں اور زیادہ نعمتوں سے نوازوں گا یہ زیادتی نعمتوں کی مقدار میں بھی ہوسکتی ہے اور ان کے بقاء و دوام میں بھی۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص کو شکر ادا کرنے کی توفیق ہوگئی وہ کبھی نعمتوں اور برکات سے محروم نہ ہوگا۔ (تفسیر مظہری)

ہم نے چونکہ اللہ کی بغاوت اور نافرمانی کی اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں سزا دی کہ نصف ملک ہم سے چھن گیا ہم نے اس عطیہ خداوندی کی ناشکری کر کے اپنے آپ کو تباہی اور بربادی میں ڈالا موجودہ حکومت بھی کافرانہ نظام کو یہاں رائج کرنا چاہتی ہے تحفظ نسواں بل جواب پاس کیا ہے یہ صریح کتاب وسنت کے خلاف ہے علماء اور پبلک کے احتجاج کے باوجود دونوں ایوانوں سے پاس کروالیا ہے اب ڈر ہے کہ اگر ہم اسی روش پر چلتے رہے تو باقی ماندہ پاکستان سے بھی ہم ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔

بدقسمتی سے یہاں جتنے بھی حکمران آئے ہیں سب بدکردار اور لٹیرے تھے جنہوں نے ملک کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا یہ ملک اور قوم دونوں کے ہی دشمن تھے ہم نے اس کتاب (تاریخ پاکستان) میں ان کا بھیانک کردار قوم کے سامنے رکھا ہے اور ملک کے دولخت ہونے کے اسباب پر بھی روشنی ڈالی ہے تاکہ قوم ہوش میں آئے اور آئندہ ایسے بدکردار ملک اور قوم کے دشمنوں کو پاکستان کی قسمت سے کھیلنے کا موقعہ نہ دے۔

محمد علی جانباز

۲۱-۰۱-۲۰۰۷

تحریک پاکستان

جنوبی ایشیا میں عرب تاجر صدیوں قبل تجارت کی غرض سے آتے رہتے تھے اور یہاں ان کی نو آبادیاں بھی قائم تھیں۔ تاہم جنوبی ایشیا میں مسلمانوں کی پہلی حکومت ۷۱۲ء میں محمد بن قاسم کی سندھ میں فتوحات سے قائم ہوئی۔ اس کے بعد مختلف مسلمان خاندانوں کی حکومت ۱۸۵۷ء تک قائم رہی۔ آخری مسلمان حکومت مغلیہ خاندان کی تھیں۔ مغلیہ خاندان کے بادشاہ اورنگ زیب عالم گیر کی وفات کے بعد اس کے نااہل جانشین اس عظیم الشان سلطنت کو سنبھال نہ سکے۔ آپس کی نااتفاقی اور خانہ جنگی نے انہیں اس حد تک کمزور کر دیا کہ مرہٹوں اور سکھ اقوام نے بغاوت کر دی اور پورے ملک میں افراتفری پھیلادی۔ اسلامی سلطنت کا شیرازہ بری طرح بکھر کر رہ گیا جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مغلیہ بادشاہوں کے دور میں تجارت کی غرض سے آئے ہوئے یورپی تاجروں نے سازشوں کے ذریعے ملکی انتظام اپنے کنٹرول میں لینا شروع کر دیا اور بالآخر ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو یرغمال بنا کر دہلی کے تخت پر قبضہ کر لیا۔ ۱۸۵۷ء میں ہندوستان کا اقتدارِ تاج برطانیہ کو منتقل ہو گیا۔

مسلمان سینکڑوں سال سے ہندوستان پر حکومت کرتے آرہے تھے اور انگریزوں نے اقتدار بھی چونکہ مسلمانوں سے ہی حاصل کیا تھا۔ اس لیے ۱۸۵۷ء میں ہند کے باشندوں نے غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف جو بغاوت کی اس کا بڑا ذمہ دار بھی مسلمانوں کو ہی سمجھا گیا۔ یہی وجہ تھی کہ بغاوت کچلنے کے بعد انگریزوں نے ہندوؤں کی شہ پر مسلمانوں سے ترجیحاً برا سلوک کرنا شروع کر دیا اور انہیں ہر شعبہ زندگی میں کم تر سے کم تر رکھنے کی پالیسی اختیار کی گئی۔ مسلمانوں نے انگریزوں سے نفرت کے سبب

ہندوستان میں نئے قائم شدہ نظام کو قبول کرنے سے انکار کر دیا جو کہ برطانوی حکومت کے تابع تھا جبکہ ہندوؤں نے اس نئے نظام سے بھرپور فائدہ اٹھانا شروع کر دیا۔ تو مسلمانوں کی معاشی پستی اور حکمرانوں سے دوری نے انہیں اس معاشرے میں جہاں وہ صدیوں سے حکومت کرتے آرہے تھے دوسرے درجے کا شہری بنا کر رکھ دیا۔ ان حالات میں مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقے میں مسلمانوں کی اس حالتِ زار پر تشویش پیدا ہوئی۔ اس سلسلے میں سب سے اہم کام سر سید احمد خان نے انجام دیا۔ انہوں نے مسلمانوں کو اس پستی سے نکالنے کی کوشش کی اور ان کی مایوسی کو دور کرنے کے اقدامات کیے۔

● سر سید احمد کی تحریک:

اسلامیانِ ہند کی تاریخ میں یہ دور یقیناً ایک تاریک دور تھا۔ جب ہر طرف گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا تو اس تاریک دور میں روشنی کی ایک کرن پھوٹی اور یہ تھی سر سید احمد خان بانی علی گڑھ کی شخصیت۔ انہوں نے نہ صرف مسلمانوں کی ناگفتہ بہ صورت حال کا جائزہ لیا بلکہ ان کے لیے ٹھوس لائحہ عمل پیش کیا۔ اس لائحہ عمل کا مقصد مسلمانوں کو بیدار کرنا اور ترقی کی شاہراہ پر گامزن کرنا تھا۔ اس طرح سر سید احمد خان نے ہندوستان کی سیاست میں مسلم علیحدگی کی بنیاد ڈالی جو نصف صدی بعد مطالبہ پاکستان کی صورت اختیار کر گئی۔

● مسلمان اور جداگانہ انتخاب کا مطالبہ (شملہ وفد)

یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو ۳۵ مسلمان رہنماؤں پر مشتمل ایک وفد نے وائسرائے ہند لارڈ منٹو سے شملہ میں ملاقات کی اور مطالبہ کیا کہ مستقبل میں متوقع اصلاحات کے تحت مجلس قانون ساز میں مسلمانوں کو ایک علیحدہ قوم کی حیثیت سے جداگانہ انتخاب کا حق

دیا جائے اور مجلس میں ان کی نشستیں متعین اور مخصوص کی جائیں اس وفد کو شملہ وفد کہا جاتا ہے۔

• قیام مسلم لیگ

دسمبر ۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ میں سرکردہ مسلم رہنماؤں کا ایک اجتماع ہوا اس اجتماع میں آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد رکھی گئی۔ اس جماعت نے تقریباً اکتالیس سال کی جدوجہد کے بعد پاکستان حاصل کیا۔

• ہندو مسلم اتحاد

منٹو مارلے اصلاحات کے کچھ عرصہ بعد واقعات نے نیا رخ اختیار کرلیا اور ۱۹۱۰ء میں ہندو مسلم اتحاد کے لیے کوششیں شروع ہوگئیں۔ چنانچہ اگلے سال ہی احمد آباد میں منعقدہ سالانہ اجلاس کے بعد ہندو اور مسلمان رہنماؤں نے دونوں قوموں کے اتحاد کے بارے میں مذاکرات کیے۔

• ترکی کی حمایت

۱۹۱۱ء میں اٹلی نے افریقہ میں ترکی کے افریقی مقبوضہ علاقے طرابلس پر حملہ کر کے قبضہ کرلیا۔ برصغیر کے مسلمانوں نے جب یہ خبر سنی تو انہوں نے ترکی کی حمایت کا اعلان کردیا۔

• کانپور کا واقعہ

ابھی بلقان کی جنگ جاری تھی کہ ۲۷ جولائی ۱۹۱۳ء کو مچھلی بازار کانپور کی ایک مسجد کے بیرونی حصہ کو اس بنا پر شہید کردیا گیا کہ وہ سڑک کی تعمیر میں حائل تھا۔ سانحۂ کانپور دراصل مسلمانانِ ہند کے زخموں پر نمک پاشی کے مترادف تھا۔ مسلمانوں نے

احتجاج کیا تو ان پر فائرنگ کر کے ۴۳ مسلمانوں کو شہید کر دیا گیا۔

● محمد علی جناح اور مسلم لیگ

اکتوبر ۱۹۱۳ء میں مولانا محمد علی جوہر کی دعوت پر مسٹر محمد علی جناح مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔

● مسلم لیگ، کانگرس معاہدہ

مسٹر محمد علی جناح نے مسلم لیگ کی صدارت سنبھالنے کے فوراً بعد کانگرس پر زور دیا کہ دونوں قومیں آئینی مسائل پر اتحاد کر لیں۔

● میثاق لکھنؤ

۱۹۱۶ء میں ایک بار پھر کانگرس اور مسلم لیگ کے اجلاس ایک ہی وقت اور ایک ہی مقام پر منعقد ہوئے جہاں دونوں جماعتوں نے ہندو مسلم مصالحت کے لیے ایک فارمولا منظور کیا۔ یہ فارمولا تاریخ میں میثاق لکھنؤ کے نام سے مشہور ہے۔ میثاق لکھنؤ ہر اعتبار سے محمد علی جناح کی کاوشوں کا نتیجہ تھا۔

● رولٹ ایکٹ

برطانوی حکومت نے برصغیر پر اپنی گرفت ڈھیلی ہوتی ہوئی دیکھی تو مارچ ۱۹۱۹ء میں سڈنی رولٹ کی سربراہی میں ایک کمیشن قائم کیا۔ اس کمیشن نے رولٹ ایکٹ منظور کیا جس میں کہا گیا تھا کہ سیاسی حقوق و مراعات کی بحالی کا مطالبہ کرنے اور اجتماعی مظاہروں میں حصہ لینے والوں کے خلاف سخت کاروائی کی جائے۔

● تحریک خلافت (۱۹۱۹ء۔۱۹۲۴ء)

۱۹۱۹ء میں دہلی میں خلافت کانفرنس منعقد ہوئی جس میں خلیفہ اور ترکی کے ساتھ

برطانوی حکومت کے ناروا سلوک پر احتجاج کرنے کے لیے ایک تحریک چلانے کا فیصلہ کیا گیا جسے بعدازاں تحریکِ خلافت کا نام دیا گیا۔

انتہا پسند ہندو تحریکیں

(۱) آریہ سماج کا بانی مول چند یا مولا شنکر تھا جسے دیانند سرسوتی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

(۲) برہمو سماج کا بانی راجہ رام موہن رائے۔

آریہ سماج کے مقاصد: (۱) ہندومت کا احیاء (۲) ہندوستان صرف ہندوؤں کے لیے..... ان مقاصد کو ویدوں کی تعلیم کے ذریعہ حاصل کرنا۔

برہمو سماج کے مقاصد: (۱) ہندومت کی اصلاح (۲) ہندومت کا احیاء۔

مسٹر محمد علی جناح کے چودہ نکات

۱۹۲۸ء میں موتی لال نہرو نے ایک رپورٹ مرتب کی جسے نہرو رپورٹ کہتے ہیں اس میں تجاویز دہلی کو مسترد کر دیا گیا۔ مزید مسلمانوں کے جداگانہ حقِ نیابت کو جسے ۱۹۱۶ء کے لکھنؤ پیکٹ میں کانگرس خود اصولی طور پر تسلیم کر چکی تھی۔ اسے مسترد کرنے کی سفارش کی گئی۔ چونکہ یہ رپورٹ مکمل طور پر ہندو ذہنیت کی عکاسی کرتی تھی، اس لیے مسٹر جناح نے اس نہرو رپورٹ کو قبول نہیں کیا اور آپ نے مسلمانوں کا نقطہ نظر پیش کرنے کے لیے چند رہنما اصول مرتب کیے جو ''مسٹر جناح کے چودہ نکات'' کے نام سے مشہور ہوئے۔ وہ یہ ہیں:

۱۔ آئندہ آئین وفاقی طرز کا ہو جس میں صوبوں کو زیادہ سے زیادہ خود مختاری دی جائے۔

۲۔ تمام صوبوں کو ایک ہی اصول پر داخلی خود مختاری دی جائے۔

۳۔ تمام مجالس قانون ساز اور دیگر منتخب اداروں میں اقلیتوں کو مؤثر نمائندگی دی جائے اور یہ خیال رکھا جائے کہ کوئی اکثریت اقلیت میں نہ بدل جائے۔

۴۔ مرکزی مجلسِ قانون ساز میں مسلمانوں کی نمائندگی ایک تہائی سے کم نہ ہو۔

۵۔ جداگانہ انتخاب کا اصول ہر فرقہ پر لاگو ہوگا۔ البتہ اگر کوئی فرقہ چاہے تو اپنی مرضی سے مخلوط انتخاب، قبول کر سکتا ہے۔

۶۔ اگر کبھی صوبوں کی حدود میں تبدیلی کرنا مقصود ہو تو اس بات کا خیال رکھا جائے کہ اس تبدیلی کا مسلم اکثریت والے صوبوں یعنی پنجاب، بنگال اور شمالی مغربی سرحدی صوبہ پر اثر نہ پڑے۔

۷۔ تمام فرقوں کو یکساں اور مکمل مذہبی آزادی حاصل ہو۔

۸۔ اگر کوئی مسودہ قانون کسی خاص فرقے سے متعلق ہو اور اس فرقے کے تین چوتھائی ممبران اسمبلی اس مسودہ قانون کے خلاف رائے دیں تو اسے مسترد قرار دیا جائے۔

۹۔ سندھ کو بمبئی سے الگ کر دیا جائے۔

۱۰۔ صوبہ بلوچستان اور شمال مغربی سرحدی صوبہ میں دوسرے صوبوں کی مانند اصلاحات نافذ کی جائیں۔

۱۱۔ آئین میں یہ بات واضح کر دی جائے کہ مسلمانوں کو تمام ملازمتوں میں ان کی اہلیت کے مطابق حصہ دیا جائے گا۔

۱۲۔ مسلمانوں کو ہر قسم کا مذہبی ثقافتی تحفظ دیا جائے۔

۱۳۔ صوبائی اور مرکزی علاقوں میں مسلمانوں کو کم از کم ایک تہائی نمائندگی دی جائے۔

۱۴۔ وفاق میں شامل صوبوں کی منظوری کے بغیر مرکزی آئین میں کوئی ردو بدل نہ کیا جائے۔

• دہلی مسلم تجاویز (۱۹۲۷ء)

۱۹۲۲ء سے شروع ہونے والا عشرہ برصغیر کی تاریخ میں نہ صرف ایک خونچکاں عشرہ ہے بلکہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے بڑی اہمیت کا حامل بھی ہے۔ اسی عشرہ میں کئی اتحاد کانفرنسیں بھی طلب کی گئیں اور ہندو مسلم مفاہمت کے لیے کئی تجاویز سامنے آئیں جن میں دہلی مسلم تجاویز اہم ترین تھیں۔

• تجاویز کا مقصد

۱۔ سندھ کو بمبئی سے جدا کرنا۔

۲۔ پنجاب اور بنگال میں نیابت کا تناسب آبادی کے مطابق کرنا۔

• نہرو رپورٹ ۱۹۲۸ء

۱۔ رپورٹ میں جداگانہ انتخابات کو ختم کر کے مخلوط انتخابات کا طریقہ اختیار کرنے کی تجویز پیش کی گئی۔

۲۔ تجویز میں کہا گیا کہ مرکز میں مسلمانوں کو ۲۵/ افیصد نشستیں دی جائیں۔

• آل انڈیا مسلم کانفرنس

مولانا محمد علی جوہر نے ۳۱ دسمبر ۱۹۲۸ء کو تمام مسلم پارٹیوں کی ایک آل انڈیا کانفرس دہلی میں منعقد کرائی۔

• کیبنٹ مشن

کیبنٹ مشن نے جنوبی ایشیا کے لوگوں کو نمائندگی دینے کے لیے منصوبہ پیش کیا۔

کیبنٹ مشن نے جنوبی ایشیا کو تین حصوں میں تقسیم کیا تھا۔

گروپ نمبر ا: یو پی، بہار، اڑیسہ، سی پی، بمبئی، مدراس

گروپ نمبر۲: پنجاب، سندھ اور سرحد

گروپ نمبر۳: بنگال اور آسام

● گول میز کانفرنس

برطانوی حکومت نے برطانیہ اور ہندوستان کی بڑی بڑی سیاسی جماعتوں کے نمائندوں پر مشتمل ۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۲ء گول میز کانفرنس منعقد کراتے ہوئے تین اجلاس منعقد کیے۔

● گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ

۱۹۳۵ء میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ مرتب کیا گیا۔اس ایکٹ میں جہاں صوبائی خودمختاری کا مطالبہ تسلیم کیا گیا وہیں مسلمانوں کے چند بنیادی حقوق بھی تسلیم کر لیے گئے۔

● ۱۹۳۷ء کے انتخابات

۱۹۳۷ء کے انتخابات میں آل انڈیا کانگرس نے انتخابات جیتے اور سات صوبوں میں وزارتیں تشکیل دیں۔

● پہلی شملہ کانفرس

جون ۱۹۴۵ء میں برطانوی حکومت نے مرکزی سطح پر ایک عارضی حکومت کے قیام کی تجویز پیش کی۔شملہ میں تمام پارٹیوں پر مشتمل ایک کانفرس طلب کی جو شملہ کانفرس کے نام سے مشہور ہوئی۔

● کرپس تجاویز

۱۹۴۶ء کو لارڈ کرپس نے آئین مرتب کرنے سے متعلق سودمند تجاویز پر بحث کی

جو کہ کرپس تجاویز کے نام سے مشہور ہوئیں۔

● قراردادِ دہلی

اپریل ۱۹۴۶ء میں مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کامیاب ہونے والے ارکان کا دہلی میں ایک اجتماع ہوا جس میں حصول پاکستان کے سلسلے میں ہر قسم کی قربانی دینے کا عہد کیا گیا۔ نیز ایک قرارداد بھی منظور کی گئی جسے قرارداد دہلی کا نام دیا گیا۔

● ۳ جون کا منصوبہ

۳ جون ۱۹۴۷ء کے منصوبے کی رو سے قرار پایا کہ برصغیر پاک و ہند کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے جنہیں شروع میں نوآبادیاتی حیثیت حاصل ہو۔ پنجاب اور بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اس کام کے لیے دو حد بندی کمیشن قائم کیے جائیں سرحد اور سلہٹ میں استصواب کرایا جائے' سندھ اور آسام کی اسمبلیاں اپنے صوبوں کے مستقبل کا فیصلہ کریں' ریاستیں جس ملک میں چاہیں، شامل ہو سکتی ہیں۔

● ۳ جون کے منصوبے کے اہم نکات

۱۔ متحدہ ہندوستان کو دو حصوں (پاکستان اور بھارت) میں تقسیم کر دیا جائیگا۔

۲۔ آسام کے مسلم اکثریت کے ضلع سلہٹ کے مستقبل کا فیصلہ بھی استصواب رائے سے ہوگا۔

● ریفرنڈم

۳ جون ۱۹۴۷ء کے منصوبے کی رو سے صوبہ سرحد اور سلہٹ میں استصواب

رائے نیز بلوچستان میں شاہی جرگے اور کوئٹہ میونسپلٹی کی منصوبہ بندی مسلم لیگ کے لیے ایک چیلنج تھا۔ مسٹر جناح کی قیادت میں مسلمانوں نے اس چیلنج کو قبول کیا۔ جس سے وہ بطریق احسن سرخرو ہوئے۔ ان علاقوں نے پاکستان کے حق میں ووٹ دے کر پاکستان میں شمولیت کا فیصلہ کیا۔

● قانون آزادی ہند

۱۸ جولائی ۱۹۴۷ء کو برطانوی پارلیمنٹ نے منصوبہ تقسیم ہند کو تسلیم کر کے اسے قانون بنادیا' جو قانون آزادی ہند ۱۹۴۷ء کہلاتا ہے۔ اس کی رو سے ۱۵/ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان اور بھارت کی آزاد مملکتیں قائم کرنا قرار پائیں' جنہیں نوآبادیاتی رتبہ حاصل ہوگا' نیز برطانوی ہند پر برطانوی راج ختم ہو جائے گا۔ قانون آزادی ہند کی اہم دفعات درج ذیل تھیں۔

۱۔ برطانوی ہند کو دو آزاد ریاستوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔

۲۔ ۱۸ مارچ تک ہر دو ممالک کے اپنے اپنے گورنر جنرل کو اپنے اپنے ملک میں ضروری ترامیم کا حق حاصل ہوگا۔

۳۔ تاج برطانیہ کو یہ حق نہیں ہوگا کہ بھارت یا پاکستان کی مقننہ کے منظور کردہ قوانین کو نامنظور کر دے۔ یہ اختیار صرف متعلقہ گورنر جنرل کو حاصل ہوگا۔

● ریڈ کلف ایوارڈ

ہندوستان کی آزادی کے ایکٹ مجریہ ۱۹۴۷ء کے تحت قائم ہونے والے باؤنڈری کمیشن کا سربراہ ریڈ کلف تھا۔ یہ ایوارڈ ۳۰/ جون ۱۹۴۷ء کو قائم ہوا۔

● ریڈ کلف ایوارڈ کی ناانصافیاں

۱۔ پنجاب کی حد بندی میں ریڈ کلف نے مسلم اکثریت کی تحصلیں بٹالہ، گورداسپور،

فیروز پور اور زیرہ بھارت میں شامل کر دیں۔

۲۔ جموں وکشمیر پر بھارت کا قبضہ کروانے کے لیے گرداسپور کے ذریعہ بھارت کو راستہ مہیا کیا گیا۔

۳۔ مغربی پنجاب کی کئی نہروں کے ہیڈ ورکس بھارت کو دے دیئے گئے۔

۴۔ بنگال میں کلکتہ کا شہر اور بندرگاہ، ضلع مرشد آباد اور ندیہ کے علاقے بھارت کو دیئے گئے۔

● اثاثوں کی تقسیم

اثاثوں کی تقسیم میں بھارت نے پاکستان کے ساتھ زیادتیاں کیں۔

ا۔ محفوظ سرمائے میں پاکستان کا حصہ ایک ارب روپے بنتا تھا، اس میں ۲۰ کروڑ دیا، باقی دینے سے انکار کر دیا۔

۲۔ کل اسلحہ کا ۳/۱ فیصد پاکستان کو ملنا تھا جسے دینے سے انکار کر دیا گیا۔

● بھارت کا ناجائز قبضہ

بھارت نے ان ریاستوں پر زبردستی قبضہ کیا:

ا۔ ریاست جموں وکشمیر ۲۔ حیدر آباد دکن ۳۔ جونا گڑھ ۴۔ منادر اور منگرول۔

● پاکستان کا قیام

۲۷ رمضان المبارک ۱۳۶۶ھ بمطابق ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کا قیام وجود میں آیا۔ (کون کیا ہے؟ ص ۱۱۶ تا ۱۲۳)

پاکستان کے لیے ابتدائی مشکلات

مسلمانان ہند نے الگ خطہ پاک تو حاصل کر لیا اگرچہ اس ٹکڑے کو مسلمانوں

کے حوالے کرنے میں بھی کفار نے اپنی مسلمانوں کے ساتھ روایتی نا انصافی اور بددیانتی کا مظاہرہ کیا لیکن مسلمانوں نے صبرو شکر کر کے ان سے نجات ہی میں اپنی عافیت جانی۔ نوزائدہ مملکت بے شمار مشکلات کا شکار تھی جن میں سے کچھ کا ذکر نیچے کیا جا رہا ہے۔

مہاجرین کا مسئلہ!

پاکستان تو بن گیا لیکن مہاجرین کو اپنے وطن میں لانا بھی ایک بہت بڑا مسئلہ بن گیا تھا۔ لاکھوں نہیں بلکہ کروڑ سے زائد مسلمان مہاجر بن چکے تھے۔ مسلمان اپنا گھر بار، مال و اسباب سب کچھ چھوڑ کر اپنے وطن کی طرف چل نکلے وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ تاریخ کا کربناک موڑ ان کے سامنے تھا جب وہ منزل پا کر بھی منزل تک پہنچنے سے محروم رہے۔ مسلمانوں کے لٹے پٹے قافلے جب اک نئی امنگ اور امید کا دامن تھامے نئے آزاد اسلامی ملک کی جانب رختِ سفر باندھے کھڑے تھے کہ ہندو اور سکھوں نے اپنی فطرت کے عین مطابق ان بے سروسامانی کے عالم میں گھروں سے چند ضروریات زندگی سمیٹے مہاجرین کے ساتھ وہ وہ سلوک کرنا شروع کر دیا جس کو دیکھتے ہوئے ایک حساس اور باشعور انسان کسی طور بھی اپنے حواس قائم رکھنے میں کامیاب نہیں رہ سکتا۔

راستے کی مشکلات طے کرنے کے بعد جب تقریباً ایک کروڑ سے بھی زائد مہاجرین پاکستان میں داخل ہوئے تو حکومت پاکستان کے لیے سب سے بڑا مسئلہ ان کی آبادکاری کا تھا جو کہ وسائل کی کمی کی وجہ سے بے حد مشکل دکھائی دیتا تھا۔

(پاکستان کا مطلب کیا؟ ص ۵۵)

مملکت کی سربراہی کا مسئلہ

برصغیر کی تقسیم کا منصوبہ پیش کرتے وقت لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے تجویز پیش کی کہ اسے دونوں مملکتوں ہندوستان اور پاکستان کا مشترکہ گورنر جنرل بنایا جائے۔ کانگرس نے تو یہ تجویز مان لی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ ماؤنٹ بیٹن کا جھکاؤ انہیں کی طرف ہے۔ تاہم جب پاکستان کے گورنر جنرل کا عہدہ مسٹر جناح نے اٹھایا تو ماونٹ بیٹن نے اپنی توہین محسوس کی اور مسلمانوں کے ساتھ مزید دشمنی دل میں پالنے لگا۔ ایک اور مسئلہ جو پاکستان کے استحکام میں رکاوٹ تھا، درج ذیل ہے۔

تقسیم ہند میں جلدی

برطانوی وزیر اعظم کے اعلان کے مطابق جون ۱۹۴۸ء تک برصغیر کے باشندوں کو اقتدار منتقل کرنا تھا لیکن ماؤنٹ بیٹن کو وائسرائے بنا کر ہندوستان بھیجنے پر وہاں کے حالات دیکھتے ہوئے اس نے ۳ جون ۱۹۴۷ء کو برصغیر کی تقسیم اگست ۱۹۴۷ء میں کرنے کا اعلان کیا، حقیقت میں اتنے تھوڑے وقت میں ماؤنٹ بیٹن پاکستان کو جلدی میں سنبھلنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ دو ماہ کے قلیل وقت میں پاکستان کے راہنماؤں کے لیے تقسیم سے پیدا ہونے والے مسائل کا اندازہ لگانا اوران پر قابو پانا مشکل ہوگیا۔

کانگرس کی پاکستان دشمنی

کانگرس نے تقسیم ہند کو رکوانے کے لیے ہر جائز و ناجائز حربہ آزمایا۔ انگریزوں کو یونین جیک تلے ہندوستان کو متحد کرنے کا کارنامہ یاد دلا کر اسے قائم رکھنے کی درخواست کی اور خود متحدہ قومیت کا تصور دے کر کچھ مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب بھی ہوگئی۔ لیکن ان حربوں کے باوجود کانگرس تقسیم

رکوانے میں ناکام رہی۔ کانگرس نے ملک کی تقسیم کو مجبوراً مان تو لیا لیکن پاکستان کو کبھی بھی دل سے تسلیم نہ کیا۔ نہرو نے اس موقع پر کہا کہ تقسیم عارضی ہے اور بہت جلد پاکستان بھارت میں شامل ہونے کی درخواست کرے گا' اور اکھنڈ بھارت وجود میں آئے گا۔ اکھنڈ بھارت کی راہ ہموار کرنے کے لیے پاکستان کے لیے اتنی مشکلات پیدا کی گئیں تاکہ پاکستان گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جائے لیکن ان شاء اللہ یہ وقت کبھی نہیں آئے گا جب بھارت اپنے مذموم عزائم پورے کر سکے۔

ریڈ کلف کی بددیانتی

بنگال اور پنجاب کے ہندو مسلم اکثریتی علاقے الگ کرنے کے لیے دو کمشنز مقرر کیے گئے تھے ایک پنجاب اور دوسرا بنگال کے لیے اس کا مشترکہ چیئرمین برطانیہ کا ایک وکیل ریڈ کلف مقرر کیا گیا۔ اختلاف کی صورت میں چیئرمین کا فیصلہ حتمی طے کیا گیا۔ ریڈ کلف نے مسلمانوں سے ناانصافی کا موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا اور پنجاب میں ضلع گورداسپور، انبالہ، زیرہ اور فیروز پور کی تحصیلیں ہندوستان کے حوالے کر دیں جبکہ بنگال میں مرشد آباد اور ندیا کے علاقے جہاں مسلم اکثریت تھی وہ بھی ہندوؤں کے حوالے کر کے پاکستان کو تنازعہ کشمیر اور تنازعہ نہری پانی جیسے مسائل سے دوچار کر کے اپنی مسلم دشمنی پر مہر ثبت کر دی۔

ہندوستان میں مسلم کش فسادات

ہندوستان کی تقسیم کے اعلان کے ساتھ ہی برصغیر میں ہندو' مسلم فسادات عروج پر پہنچ گئے۔ دہلی، بہار نواکھلی اور کلکتہ زبردست فسادات کی لپیٹ میں تھے۔ تقسیم ہند کا باضابطہ اعلان ہونے کے ساتھ ہی سکھوں نے بھی اپنے مفادات کی جنگ شروع کر دی اور پنجاب میں وسیع پیمانے پر تبادلہ آبادی شروع کر دی تاکہ

مشرقی پنجاب خالص سکھ ریاست بن کر منظر پر ابھرے۔ اس طرح دہلی سے پنجاب تک کا علاقہ فسادات کی لپیٹ میں آ گیا۔ مشرقی پنجاب میں ہندوؤں اور سکھوں نے ظلم و بربریت کی ایسی ایسی کہانیاں رقم کیں جس پر تاریخ انسانی کا سر شرم سے جھک جاتا ہے اور نسلِ انسانی کی روح کانپ اٹھتی ہے۔

عورتوں کی بازیابی

مہاجرین کی منتقلی کے وقت ہزاروں نوجوان لڑکیاں اور عورتیں ہندو اور سکھوں کے ہاتھ بے آبرو کر دی گئیں۔ اور ہزاروں جوان لڑکیوں کو (سکھوں نے) اغوا کر لیا۔ جس پر حکومت پاکستان نے قیام پاکستان کے بعد ان نوجوان لڑکیوں کی بازیابی کے لیے کوششیں کیں لیکن بے غیرت ہندو بنیوں نے اس سلسلے میں کوئی تعاون نہ کیا۔ اس طرح ہزاروں مظلوم عورتیں اور بچے ان کے رحم و کرم پر رہ گئے۔

صنعتی مسائل

پاکستان کے قیام کے وقت تمام صنعتیں ہندوؤں کے قبضے میں تھیں ہندوؤں نے تقسیم سے پہلے ہی اپنا سرمایہ اور کارکن بھارت منتقل کر لیے تھے اور جو چند کارخانے پاکستان کے حصے میں آئے تھے ہندو یہاں سے جاتے وقت ان کارخانوں کو بھی ناکارہ کر گئے۔ اسی لیے ان کارخانوں کو دوبارہ چالو کرنے میں خاصا وقت لگا۔

انتظامی مسائل

ہندوستان میں تمام دفاتر اور انتظامی ڈھانچہ ان کو بالکل تیار ملا جبکہ پاکستان کو تمام دفاتر اور انتظامی ڈھانچے کی از سر نو تشکیل کرنا تھی۔ دفاتر میں ساز و سامان اور عملے میں چونکہ مسلم افسروں کی کمی تھی۔ اس لیے انگریز افسر متعین کر کے انتظامی امور چلانے کے لیے ان سے کام لیا گیا۔

وسائل کی کمی

نئی مملکت کو ایسے مسائل سے دوچار کیا گیا تھا تاکہ جن سے بچنے کے لیے ان کے پاس کوئی راستہ نہ ہو اور نوزائدہ مملکت اپنے پاؤں پر کھڑی ہی نہ ہو سکے۔ لیکن بفضل تعالیٰ پاکستان نے بہت جلد اپنے مسائل پر قابو پالیا اور اپنے الگ تشخص کو برقرار رکھنے کے لیے زندگی کی دوڑ میں آگے ہی آگے نکلنے لگا۔

دستوری مسائل

دیگر مسائل کے ساتھ ساتھ پاکستان کو نئے دستور کا مسئلہ بھی درپیش تھا چونکہ تحریکِ پاکستان میں نظریہ پاکستان کی جو تشریح کی گئی تھی اس کے مطابق پاکستان کی نئی حکومت کا دستور نظریہ اسلام پر بننا ضروری تھا تاکہ اسلامی دستور کے مطابق اسلامی معاشرے کی بنیاد ڈالی جا سکے۔ تاہم نئی مملکت کے لیے نیا دستور فوری طور پر تیار نہ کیا جا سکا۔ جس کی وجہ سے پاکستان کے لیے اپنے مسائل اور مشکلات پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔ تاہم ۱۹۳۵ء کے ایکٹ میں مناسب ترامیم کر کے اس کو لاگو کر دیا گیا۔ جس کے نتیجے میں پاکستان کو بہت سی مشکلات نے آگھیرا۔

اثاثوں کی تقسیم

متحدہ ہندوستان کے پاس ۴ ارب کا محفوظ سرمایہ تھا جس میں سے ایک چوتھائی پر مسلمانوں کا بھی حق تھا لیکن بھارت کی حکومت یہاں بھی اپنی فطرت بے ایمانی پر صرف پانچ فیصد یعنی بیس کروڑ دینے پر راضی ہوئی۔ اور اس کے بدلے میں قرضہ جات کا بیس فیصد پاکستان کے ذمہ ڈالنے کی کوشش کی گئی تاہم بعد میں دونوں ملکوں کی طرف سے مذاکرات میں پچھتر کروڑ پاکستان کو دینے پر رضامندی ہوئی۔ مگر ۲۰ کروڑ دینے کے بعد بھارت کی نیت میں پھر فتور آگیا۔ مگر اس کے بعد گاندھی کے احتجاج

کرنے پر بھارت کو پاکستان کے حصے کی باقی رقم بھی ادا کرنا پڑی۔

فوجی سازوسامان کی تقسیم

برطانوی حکومت فوج کی تقسیم کے خلاف تھی اوراس نے کوششیں کیں تا کہ پاکستان مشترکہ دفاع کوتسلیم کرلےلیکن مسٹر جناح نے ایسا نہ کیا پاکستان کے حصے میں جوفوجی سازوسامان کا ایک تہائی طے پایا بھارت نے اس میں بھی طرح طرح کی رکاوٹیں کھڑی کیں۔تاہم کمانڈرانچیف اکن لیک کے احتجاج پر بھارت نے ناقابلِ استعمال سازوسامان اورتھوڑی مقدار میں اسلحہ پاکستان کے حوالے کردیا اورفوج کی منتقلی ۱۹۴۸ءتک ممکن ہوئی۔

نہری پانی کا مسئلہ

ریڈ کلف کے غیر منصفانہ اورغلط ایوارڈ کی بدولت دریائے راوی پر مادھوپور کا ہیڈورکس اوردریائے ستلج پر فیروزوالا ہیڈورکس بھارت کو چلے گئے۔یہاں سے نکلنے والی نہریں مغربی پنجاب کے علاقے کوسیراب کرتی تھیں۔اپریل ۱۹۴۸ءکو بھارت نے اچانک نہروں کاپانی کم کردیا تاکہ پاکستان کی زراعت تباہ ہوجائے۔پاکستان یہ مسئلہ اقوام متحدہ میں لے گیا آخر ۱۹۶۰ءمیں یہ مسئلہ عالمی بنک کی مدد سے سندھ طاس معاہدے کی شکل میں حل ہوا۔

مسئلہ پختونستان

سرحد کے عوام کوریفرنڈم کے ذریعہ فیصلہ کرناتھا کہ وہ پاکستان کے ساتھ الحاق چاہتے ہیں یابھارت کے ساتھ' تاہم سرحدی عوام نے بھارت کے خلاف ووٹ دیااور پاکستان کے حق میں فیصلہ سنادیا تاہم کچھ سیاسی راہنماؤں کے اکسانے پر سرحدی عوام نے ایک آزادریاست پختونستان کا مطالبہ کرکے پاکستان کے مسائل میں ایک اور

مسئلے کا اضافہ کر دیا۔

ریاستوں کے الحاق کا مسئلہ

قیام پاکستان کے وقت ۵۶۲ ریاستوں میں سے صرف ۱۴ پاکستان کے ساتھ متصل تھیں۔ قانون آزادی ہند کے تحت ہندوستان کی خودمختار ریاستوں کو یہ حق تھا کہ اپنی جغرافیائی حیثیت اور رعایا کی خواہش کے احترام میں پاکستان اور ہندوستان میں سے جس کے ساتھ چاہیں الحاق کر لیں۔ لیکن بھارت نے موقع ملتے ہی جو ریاستیں پاکستان کے ساتھ الحاق چاہتیں تھیں ان پر فوج کشی کر کے انہیں ہضم کر لیا۔ ریاست جوناگڑھ اور حیدر آباد ریاست کی مثال ہمارے سامنے ہے۔

معاشی مسائل

تقسیم سے پہلے زندگی کے ہر شعبے میں ہندوؤں کو فوقیت حاصل تھی۔ بنک کاری، صنعت و حرفت، زراعت غرض کہ ہر شعبے میں ہندوؤں کا غلبہ تھا اور پاکستان کے قیام سے پہلے ہی انہوں نے اپنا سرمایہ اور کارکن ہندوستان منتقل کر لیے جبکہ دوسری طرف پاکستان کو ہر شعبے کو نئے سرے سے شروع کر کے ملکی استحکام کی بنیادوں کو استوار کرنا پڑا۔ یعنی زندگی کو نئے سرے سے شروع کیا گیا۔ ہر میدان میں ہر موڑ سے اور ہر سطح سے۔

مسئلہ کشمیر

خطہ کشمیر کے ساتھ پاکستانی مسلمانوں کی وابستگی جذباتی اور بے بنیاد نہیں بلکہ یہ وابستگی دینی اور ایمانی بنیادوں پر ہے۔ ۱۹۴۷ء میں جب ہندوستان اور پاکستان کے نام سے دو الگ ملک وجود میں آئے تو ایک ملک رام راج کے لیے قائم ہوا تھا اور دوسرا ملک اللہ کی وحدانیت اور اسلام کی سربلندی کے لیے قائم ہوا تھا اور پاکستانی مسلمانوں کی اس تحریک میں کشمیریوں نے بھرپور ساتھ دیا تھا اور الحاق پاکستان کو اپنی منزل قرار

دیا تھا۔

مسلم کانفرنس جو کہ جموں و کشمیر کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت تھی اس نے پاکستان کے قیام سے ۲۶ دن پہلے ۱۹ جولائی کو الحاق پاکستان کی قرارداد پاس کر کے کشمیر کو پاکستان کی ریاست قرار دے دیا تھا لیکن تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ یہ تعلق اس سے بھی کہیں پہلے قائم ہو چکا تھا۔ قیام پاکستان سے پہلے جب پنجاب کے مسلمان سکھوں کے ظلم سہہ رہے تھے اور دوسری طرف مرہٹے اور انگریز مسلمانوں کے علاقے نگل رہے تھے اس وقت بھی کشمیریوں نے پنجاب کے مسلمانوں کو رنجیت سنگھ سے آزادہ دلوانے کے لیے عملی کوششوں میں حصہ لیا۔ پھر جب مسلمانوں نے انگریزوں کے خلاف تحریک شروع کی تو اہل کشمیر نے اپنے علاقے اس مقصد کے لیے مہیا کیے۔ اس تحریک کے نفس قدسیہ سید احمد، شاہ اسماعیل شہید اور ان کے دیگر رفقاء کے بارے میں دنیا صرف یہی جانتی ہے کہ انہوں نے انگریزوں اور سکھوں کے خلاف علم جہاد بلند کیا تھا لیکن اس جماعت مجاہدین کی اور اہل کشمیر کی آپس محبت، عقیدت و احترام کو کم ہی لوگ جانتے ہیں۔ ۱۸۱۹ء میں جب رنجیت سنگھ نے کشمیر پر قبضہ کیا تو اس جماعت مجاہدین نے ان کی آزادی کے لیے بھرپور کوشش کی۔ دنیائے اسلام کے عظیم مفکر سید ابوالحسن زروی اپنی کتاب سیرت سید احمد شہید میں لکھتے ہیں۔

سید صاحب نے جو جماعت تیار کی اس میں جہاد اصغر بھی تھا اور جہاد اکبر بھی، اللہ کے لیے محبت اور اللہ کے لیے نفرت بھی، عبادت بھی اور اسلامی غیرت بھی، تلوار بھی قرآن بھی، مسجد میں تسبیحات بھی اور میدان جنگ میں تکبیر مسلسل بھی، یہ سب اس دینی شعور کا نتیجہ تھا جو سید احمد کی صحیح تربیت کی وجہ سے جماعت مجاہدین میں راسخ ہو چکا تھا۔

مولانا مودودی سید احمد اور شاہ اسماعیل شہید کی تحریک کے متعلق لکھتے ہیں کہ اگرچہ ہندوستان میں مسلمانوں کی ترکتازیوں کا سلسلہ پہلی صدی ہجری کے آخر سے

شروع ہو گیا تھا اور تیرھویں صدی تک جاری رہا لیکن صحیح معنوں میں اسلامی جہاد یہاں پر صرف ایک ہی مرتبہ ہوا جس کے رہبر سید احمد اور شاہ اسماعیل شہید تھے۔ پہلی لڑائیاں نہ تو خالصتاً دینی تھیں نہ ان میں میں اسلامی قوانین جنگ کی پابندی کی گئی اور نہ ہی خلافت اسلامیہ یہاں قائم ہو سکی۔ لیکن پوری ۱۲ سو سال کی تاریخ میں اللہ کے یہ بندے ایسے نظر آتے ہیں جنہوں نے صرف اس لیے جنگ کی کہ اللہ کی زمین پر اللہ کا قانون نافذ ہو، فاسقین اور فجار کی جگہ صرف صالحین کی فوج تیار کی گئی اور جہاں ان کو حکمرانی کا موقع ملا وہاں خلفائے راشدین کی طرز کی حکومت قائم کی۔ دنیوی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو ہندوستان میں مسلمانوں کی پچھلی عظیم الشان فتوحات اور سلطنتوں کے مقابلے میں بہت حقیر نظر آتا ہے لیکن اسلامی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو ہندوستان کی ۱۲ سو سالہ تاریخ کا یہ سب سے درخشاں پہلو ہے۔

اس عظیم تحریک کے رہبر سید احمد ۲۹ نومبر ۱۷۸۶ء کو بریلی میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کے ساتھ سپاہیانہ کھیلوں کا بھی شوق تھا۔ ۱۷، ۱۸ سال کی عمر میں والد کی وفات کے بعد لکھنو اور پھر وہاں سے دہلی پہنچے۔ وہاں شاہ عبدالعزیز کے ہاتھ پر بیعت کی۔ چند سال بعد نواب دریکاں کے لشکر میں جہادی نقطہ نظر سے بھرتی ہو گئے لیکن جب نواب دریر خان نے انگریزوں سے صلح کر لی تو نواب دریر خان کو خیر باد کہہ دیا۔ سید احمد چھ سال نواب دریر خان کے لشکر میں رہے اور خوب عسکری تربیت حاصل کی۔ جب نواب دریر خان سے علیحدگی کے بعد تیسری دفعہ دہلی آئے تو شاہ عبدالعزیز نے اکبری مسجد میں قیام کا بندوبست کیا۔ یہیں خاندان ولی اللہ کے چشم و چراغ شاہ اسماعیل اور دیگر جید شیوخ کرام نے سید احمد کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی۔ اس وقت حالات یہ تھے کہ انگریزوں کے سامراجی سائے پھیل رہے تھے مغل تاجدار کی حکومت لال قلعہ تک رہ گئی تھی۔ جنوبی اور وسطی ہندوستان میں مرہٹوں کی مار دھاڑ اور دریائے ستلج سے پشاور تک

کے علاقے پر سکھ قابض تھے۔ سید احمد اپنے رفقاء سمیت راجپوتانے، مارواڑ، سندھ، بلوچستان، افغانستان سے ہوتے ہوئے نومبر ۱۸۲۶ء کو پشاور پہنچے۔ یہاں بڑی تعداد میں لوگ آپ کے منتظر تھے۔ تین دن پشاور میں قیام کر کے ہشت نگر اور خویشگی سے ہوتے ہوئے ۱۸ دسمبر ۱۸۲۶ء کو نوشہرہ میں پڑاؤ ڈالا۔ وہاں سے رنجیت سنگھ کے نام اعلامیہ جاری کیا کہ یا تو اسلام قبول کرے یا جزیہ کی ادائیگی کرے اور دونوں باتوں کو قبول نہ کرنے کی صورت میں جنگ کے لیے تیار رہے اور کہا کہ ''یاد رکھو! تمہیں شراب سے اتنی محبت نہیں ہوگی جتنی ہمیں راہ حق میں شہید ہونے سے ہے'' اکوڑہ خٹک میں سکھوں سے پہلا معرکہ ہوا جس میں ایک ہزار سکھ مارے گئے جبکہ ۷۱ مجاہد شہید ہوئے جس سے مجاہدین کی سکھوں پر دھاک بیٹھ گئی۔

اب سید احمد کے ہاتھ پر بیعت امامت بھی کی گئی اور برصغیر کی تاریخ یں پہلی اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی گئی اور صرف دو ماہ میں اسی (۸۰) ہزار سرفروش سید احمد کے جھنڈے تلے جمع ہو چکے تھے۔ رنجیت سنگھ سمجھ گیا کہ اتنی بڑی تعداد سے میدان جنگ میں مقابلہ کرنا ممکن نہیں اس لیے اس نے عیاریوں اور لالچ کا حربہ آزمایا۔ جس کی بنا پر خوانین پشاور یار محمد خان اور سلطان محمد خان رنجیت سنگھ کے ہاتھ بک گئے۔ اور سید احمد کو زہر دے کر ہلاک کرنے کی کوشش کی گئی۔ پھر شیدو کی جنگ میں عین موقع پر کوانین پشاور کی علیحدگی، سیدین کا رنجیت سنگھ کے فرانسیسی جرنل سے مقابلہ، جنگ زیدہ، یار محمد خان کا قتل، جنگ ہایار، پشاور کی فتح، سید احمد کے مقرر کردہ قضاۃ اور خوانین پشاور کے غداروں کا قتل عام اور اس کے بعد قافلہ جہاد کی پشاور سے ہجرت ثانیہ، یہ سب واقعات لمبی داستان ہیں اور بے شمار صفحات کے متقاضی ہیں۔ الغرض مولانا نظام الدین چشتی، مظفر آباد کے رئیس راجہ سلطان احمد خان، زبردست، فیض طلب خان اور حبیب اللہ خان نے اپنے اپنے وفود سید احمد کی خدمت میں بھیجے کہ آپ کشمیر کے

پہاڑوں میں کسی محفوظ جگہ قیام کر کے کشمیر، پونچھ، کاغان، پکھلی، ہزارہ اور پنجاب کو سکھوں کی غلامی سے نجات دلائیں۔ بلکہ زبردست خان تو جماعت مجاہدین کے تعاون سے سکھ فوج کے خلاف باقاعدہ گوریلا کاروائیوں کا آغاز کر چکے تھے۔

عازم کشمیر ہونے سے ایک سال پہلے باغ کے ایک جری مسلم شمس الدین رنجیت سنگھ کے خلاف علم بغاوت بلند کر چکے تھے۔ ان وجوہات کی بنا پر سید احمد کشمیر کو اپنا بیس کیمپ بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ مئی ۱۸۳۱ء کو بالاکوٹ میں سید احمد اپنے رفقاء سمیت خیمہ زن ہوئے لیکن مقامی لوگوں کی مخبری کی وجہ سے سکھوں نے بلندی پر مورچہ بنالیا۔ اور وہاں سے مسلمانوں کے خلاف لڑائی کا آغاز کر دیا۔ مجاہدین پورے جذبے سے لڑے لیکن نشیب میں ہونے کی وجہ سے سید احمد اور شاہ اسماعیل سمیت ان کے سینکڑوں رفقاء شہادت کے منصب پر فائز ہوئے۔ ان کی شہادت کے بعد یہ تحریک ختم نہیں ہوئی بلکہ ڈیڑھ صدی تک انگریزوں کے خلاف انہوں نے علم بغاوت بلند رکھا۔ سید احمد اور شاہ اسماعیل کی شہادت کے بعد کچھ عرصہ تحریک مولانا نصیر الدین کے ہاتھ میں رہی۔ چونکہ ان حضرات کی شہادت کشمیر میں ہوئی تھی اس لیے ان کے خلفاء نے بھی کشمیر کو اپنا مرکز بنائے رکھا۔ ۱۸۳۱ء سے ۱۸۴۷ء تک مجاہدین نے سکھوں کے قدم کشمیر اور اس کے اردگرد (پونچھ، کرال، کاغان، پکھلی، ہزارہ اور مظفر آباد) میں جمنے نہ دیئے۔ ۱۸۴۳ء میں سید احمد کے خلیفہ مولانا ولایت علی۔ نے اپنے چھوٹے بھائی مولانا عنایت علی کو اس تحریک کی رہنمائی پر مامور کیا۔ اور ستھانہ کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنا کر باقاعدہ متوازی اسلامی حکومت کی بنیاد رکھی۔ مارچ ۱۸۴۶ء کو جب انگریزوں نے ۷۵ لاکھ روپیہ کے عوض کشمیر کا علاقہ راجہ گلاب سنگھ کے حوالے کیا تو مجاہدین ہند نے مولانا عنایت علی کی سرپرستی میں ایک تاریخی جرگی منعقد کیا جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ کشمیر اور اس کے گرد نواح کے علاقوں کو سکھوں اور ڈوگروں کے وجود سے پاک کر کے

یہاں خلافت راشدہ کا نظام علی منہاج النبوۃ قائم کیا جائے۔ راجہ گلاب سنگھ نے متوازی حکومت کی معاون اقدام کی تادیب کے لیے ایک لشکر بھیجا اور کدال کے علاقہ ناڑہ میں ایک قلعہ بھی تعمیر کیا لیکن مجاہدین کی بروقت کاروائی کی بنا پر سپہ سالار سمیت ایک فرد بھی زندہ نہ بچ سکا۔

متوازی حکومت کی سرپرستی میں مجاہدین کی کاروائیاں تیز ہونے لگیں۔ سکھ جہاں ہوتے مارے جاتے اور جو بچے وہ راتوں رات بھاگ کر حسن ابدال پہنچ گئے۔ یہ تحریک بڑی تیز رفتاری سے کشمیر کی طرف بڑھ رہی تھی کہ ناگہاں انگریز بیچ میں کود پڑے۔ انہوں نے سکھ فوج مل کر اسلامی فوج کا مقابلہ شروع کر دیا۔ لیکن امیر المجاہدین مولانا عنایت علی مقامی قبائل کے تعاون سے بمقام علی میرا سکھوں اور انگریزوں کی متحدہ فوج کو شکست دی۔ اپریل اور مئی ۱۸۴۸ء میں میجر ریسٹ، انڈرسن اور جھنڈا سنگھ کی فوجوں کی شکست دی۔ جس کے نتیجے میں گڑھی حبیب اللہ، شنکیاری، بھیر کنڈ، اگرور، مظفر آباد اور دیگر علاقے سرنگوں ہوئے۔ مظفر آباد مین رئیس سلطان حسین خان نے دوسرے سلمانوں سرداروں کی طرح حوصلہ پا کر سکھ اقتدار کے خلاف بغاوت کر رہی تھی۔ امیر المجاہدین مقصود علی کی کمان میں دو سو مقامی فوجی اور مجاہدین کا دستہ مظفر آباد بھیج دیا۔ شدید لڑائی کے بعد مظفر آباد سکھوں کے تسلط آزاد ہو گیا۔ فتح گڑھ سکھوں کا آخری مرکز رہ گیا تھا مجاہدین نے اس کا بھی محاصرہ کر لیا اور سکھوں کو شکست فاش دے کر فتح گڑھ پر فتح حاصل کی اور فتح گڑھ کا نام بدل کر اسلام گڑھ رکھ دیا۔ اس کے بعد مجاہدین نے باقاعدہ اسلامی حکومت قائم کی۔ جس کی باقاعدہ مجلس شوریٰ تھی۔ فوج تھی اور ریاست کی سرحدیں متعین تھیں، ریاست کی خارجہ پالیسی کے دو بڑے بنیادی اصول تھے۔ ان میں سے ایک یہ تھا کہ سکھوں اور انگریزوں کے خلاف فتح تک جہاد اسی پالیسی کی بنا پر اسلامی ریاست کے کابل اور کشمیر کے ساتھ

دوستانہ روابط استوار ہوئے جب انگریز نے کشمیر کو راجہ گلاب سنگھ کے ہاتھ بیچ ڈالا تو وہاں کے گورنر شیخ امام الدین نے امیر المجاہدین کے حکم پر کشمیر کو گلاب سنگھ کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ اسلامی ریاست انگریزوں کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹک رہی تھی۔ چنانچہ جیسے ہی گلاب سنگھ نے مجاہدین کے خلاف مدد چاہی تو انگریز فوراً تیار ہو گئے۔

انگریز کمانڈر ہندی لارنس خود فوج لے کر جموں پہنچا اور امام الدین کو شیشے میں اتار لیا اور بغیر لڑائی کے کشمیر گلاب سنگھ کے قبضے میں چلا گیا۔ اس کے بعد گلاب سنگھ کی فوج انگریز کی سربراہی میں اسلام گڑھ کی طرف بڑھنے لگی۔ انگریز نے علاقے کے اکثر مقامی لوگوں کو لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ جنہوں نے ۲۴ دسمبر کے معرکہ میں سکھوں کا بھرپور ساتھ دیا۔ سکھ اور انگریز مل کر بھی مجاہدین کو شکست نہیں دے سکتے تھے لیکن اپنوں کی غداری کی وجہ سے مجاہدین کو شکست کا سامنا پڑا۔ بہت سے مجاہدین شہید ہو گئے۔ امیر المجاہدین مولانا عنایت علی اور مولانا ولایت علی گرفتار کر لیے گئے اور آبائی وطن عظیم آباد (پٹنہ) میں نظر بند کر دیئے گئے۔ اپنوں کی غداری کی وجہ سے کشمیر کی آزادی اور اسلامی رسایت کی تکمیل کا خواب پورا نہ ہو سکا۔ اس کے باوجود جماعت مجاہدین کا تعلق کشمیر سے قائم رہا۔ اور قیام پاکستان کے بعد جب بھارت نے اپنی فوجیں کشمیر میں داخل کیں تو جماعت مجاہدین پھر کشمیر کی آزادی کے لیے سرگرم عمل ہو گئی۔ اس وقت جماعت مجاہدین کے آخری امیر مولانا فضل الٰہی وزیر آبادی تھے وہ اپنے ساتھیوں سمیت میدان جہاد میں کود پڑے۔ قیام پاکستان سے پہلے ان کا مرکز چمرقند تھا۔ یہاں مولانا فضل الٰہی کا بہت اثر ورسوخ تھا۔ جہاد کا اعلان ہوتے ہی مولانا فضل الٰہی نے یہاں کے تمام مجاہدین کو کشمیر پہنچنے کا حکم دیا۔ اور ساتھ ہی پاکستان میں موجود اپنے رفقاء غازی عبدالکریم، چمرقندی غازی عبدالغنی قصوری، حافظ محمد یوسف

کھڑوی کو جہاد کشمیر کی تحریک کو منظم کرنے کا حکم دیا اس موقعہ پر سردار عبدالقیوم خان نے مولانا فضل الٰہی کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی۔ کشمیر کا ایک بہت بڑا حصہ آزاد ہوگیا اور سری نگر بھی چند میل کے فاصلے پر تھا جسے بچانے کے لیے بھارت نے اپنی پوری فوجی طاقت جموں و کشمیر میں جھونک دی مگر ہر طرف سے اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ سرینگر کو ہاتھوں سے نکلتا دیکھ کر بھارت نے UNO میں دہائی دی اور سیز فائر کرانا چاہا۔ مولانا فضل الٰہی نے جب دیکھا کہ پاکستانی حکومت سیز فائر کو تسلیم کرنے والی ہے تو انہوں نے لیاقت علی خان سے ملاقات کر کے حالات سے آگاہ کیا اور سیز فائر کرنے سے منع کیا نیز کہا کہ وہ بے شک اپنی افواج کشمیر سے واپس بلالیں باقی ہم جانیں اور بھارت لیکن لیاقت علی خان نے ان کے مشورہ کی پرواہ نہ کی اور سیز فائر کو تسلیم کرلیا۔ اس صدمے سے مولانا فضل الٰہی بیمار ہوگئے اور اسی بیماری میں وہ فوت ہوگئے۔ آخری ایام میں انہوں نے لیاقت علی خان کے اس فیصلے کے مضمرات اور آئندہ کے لیے پاکستان پر اس کے اثرات کی وضاحت کے لیے ایک تاریخی مکتوب "غلطی ہائے عدیم المثال" کے عنوان سے تحریر کیا۔ ۵ مئی ۱۹۵۱ء کو مولانا فضل الٰہی کا انتقال ہوا آخری وصیت کے مطابق ان کو بالاکوٹ میں سید احمد شہید کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

مئی کا مہینہ ہمیں ہر سال بالاکوٹ کے ان شہداء کی یاد دلاتا ہے جنہوں نے برصغیر سے انگریزوں کے انخلاء اور وطن کی آزادی کے لیے اپنی جانیں قربان کیں۔

یہی وجہ ہے کہ کشمیری عوام آج بھی اپنی زندگی کی بقا اور ہندو سے اپنی حریت کی جنگ لڑنے میں مصروف ہیں۔ ان کی زندگیوں کا سب سے بڑا اور اہم مقصد ہی ہندوستانیوں سے نجات بن چکا ہے۔ جس کے لیے وہ آئے دن نت نئے مظالم کا اک نئے جوش، عزم اور حوصلے سے مقابلہ کررہے ہیں۔ ہندوستانی فوج دلیر، بہادر

اور شجاعت کی زندہ جاوید تصویر کشمیریوں کی آزادی کی جنگ کو کچلنے کے لیے کوئی ایسا حربہ نہیں جو نہ آزما چکے ہوں۔ لیکن عظمت کے مینار کشمیری حریت پسند اپنی لاشوں کے پہاڑ سے گزر کر ہر روز ہندوستانی چوہوں کا شیروں کی طرح مقابلہ کر رہے ہیں۔

مندرجہ بالا مسائل نے پاکستان کے قیام کے فوراً بعد ہی استحکام پاکستان میں بہت سی رکاوٹیں کھڑی کر دیں جو کہ ایک سوچی سمجھی سازش کا حصہ تھیں۔ جو کفار زندگی کے ہر موڑ پر مسلمانوں کو زچ کرنے کے لیے ہر آن تیار رکھتے ہیں۔ قیام پاکستان کے وقت بھی طرح طرح کے مسائل صرف اس لیے کھڑے کیے گئے تا کہ پاکستان کہیں مستحکم ہو کر اپنے وجود کو ہمیشہ کے لیے قائم رکھنے میں کامیاب ہی نہ ہو جائے جو کہ ہندو بنئے کی برداشت سے باہر بات تھی۔

پاکستان کے حکمران ۱۹۴۷ء تا حال

(۱) مسٹر محمد علی جناح بطور پہلے گورنر جنرل (۱۹۴۷ء تا ۱۹۴۸ء)

قیام پاکستان کے بعد ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو بانی پاکستان مسٹر محمد علی جناح نے ملک کے پہلے گورنر جنرل کی حیثیت سے حلف اٹھایا۔ آپ کی پہلی کابینہ کے ارکان درج ذیل تھے:

(۱)	لیاقت علی	(وزیر اعظم، وزیر خارجہ)
(۲)	ملک غلام محمد	(وزیرِ خزانہ)
(۳)	سردار عبد الرب نشتر	(وزیرِ مواصلات)
(۴)	راجہ غضنفر علی	(وزیرِ خوراک)
(۵)	اسماعیل ابراہیم چندریگر	(وزیرِ تجارت)
(۶)	فضل الرحمٰن	(وزیرِ اطلاعات و تعلیم)

(۷) جوگندرناتھ منڈل (وزیرِ قانون، محنت)

پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی:

۱۹۴۵ء کے انتخابات کے نتیجے میں برصغیر کی جو دستور ساز اسمبلی منتخب کی گئی' اس کے ۶۹ ارکان کا تعلق پاکستان میں شامل ہونے والے علاقوں سے تھا۔ اس طرح پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی ۶۹ ارکان پر مشتمل تھی۔ بعدازاں اس میں بہاولپور' خیرپور اور بلوچستان کی ریاست قلات کے ارکان کی شمولیت سے تعداد ۷۹ ہوگئی۔ اس اسمبلی کے ۴۴ ارکان کا تعلق مشرقی پاکستان' ۱۷ کا تعلق پنجاب' ۳ کا تعلق صوبہ سرحد' ۱۵ کا تعلق بلوچستان اور پنجاب کی ریاستوں سے تھا۔

(۲) پاکستان کی ابتدائی مشکلات:

تقسیم ہند کے بعد بھارت نے پاکستان کے لیے طرح طرح کے مسائل پیدا کر دیئے جن کا مقصد نوزائیدہ ریاست کو انتظامی اور معاشی لحاظ سے ناکام کرنا تھا۔ پاکستان کی ابتدائی مشکلات درج ذیل تھیں:

(۱) کانگرس کے رہنماؤں نے پاکستان کے ساتھ معاندانہ رویہ اختیار کیا۔

(۲) پاکستان کو اپنا حکومتی ڈھانچہ تشکیل دینا پڑا۔ کراچی کو دارالخلافہ قرار دے کر سول سروس قوانین مرتب کیے گئے۔

(۳) لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے جانبدارانہ رویہ اختیار کیا اور بھارت کو کشمیر پر قبضہ کرنے میں پوری مدد فراہم کی۔ اس نے ریڈکلف ایوارڈ کو بھی تبدیل کروایا۔

(۴) مشرقی پنجاب سے لاکھوں مہاجرین ہجرت کر کے پاکستان میں آباد ہوئے حکومت کو ان کی آبادکاری کے لیے شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

(۵) ۱۹۴۷ء میں ریزرو بینک میں ۴ ارب روپے جمع تھے جن میں سے پاکستان کا حصہ

۷۵ کروڑ روپے بنتا تھا بھارت نے یہ رقم قسطوں میں ادا کی۔

(۶) پاکستان کو دستور سازی کے معاملہ میں صوبائی عصبیت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کام کو سرانجام دینے میں نو سال کا عرصہ صرف ہوا۔

(۷) بھارت نے خان عبدالغفار خان کے ساتھ مل کر صوبہ سرحد میں پختونستان کا مسئلہ کھڑا کر دیا۔

(۸) بھارت نے کشمیر سے پاکستان میں داخل ہونے والے دریاؤں کا رخ مشرقی پنجاب کی جانب موڑ کر پانی کا مسئلہ کھڑا کر دیا۔ بالآخر یہ تنازعہ عالمی بینک کی وساطت سے حل ہوا اور ۱۹۶۰ء میں پاک بھارت سندھ طاس کا معاہدہ طے کیا گیا۔

(۹) بھارت نے غیر قانونی طور پر حیدر آباد، جونا گڑھ اور کشمیر کی ریاستوں پر قبضہ کر لیا۔ جس کے نتیجے میں پاکستان نے ۱۹۴۷ء سے ۱۹۴۸ء تک بھارت سے جنگ لڑی۔

(کون کیا ہے؟ ص ۱۲۴)

پہلی حکومت

سب سے پہلی حکومت مسلم لیگ کی تھی جو پورے ۱۱ سال تک رہی۔ بعد میں جنرل ایوب خاں کے مارشل لاء نے اسے ختم کر دیا اس حکومت نے ملک اور عوام کے لیے کوئی اہم کام سرانجام نہیں دیا جوڑ توڑ اکھاڑ پچھاڑ اور لوٹ مار میں لگی رہی۔

مسٹر جناح کی وفات

۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء میں صوبہ بلوچستان کے صحت افزا مقام زیارت میں مسٹر جناح نے بیماری کے ایام گزارے۔ اور وہیں وفات پائی آپ کی وفات کے بعد دوسرے ہی روز خواجہ ناظم الدین کو بطور گورنر جنرل منتخب کر لیا گیا۔ خواجہ ناظم الدین ایک محب وطن

سیاستدان تھے۔ جناح کی وفات کے بعد خواجہ صاحب نے ۱۲ر ستمبر ۱۹۴۸ء کو دوسرے گورنر کی حیثیت سے حلف اٹھایا اور ۱۶ر اکتوبر ۱۹۵۱ء کو لیاقت علی خاں کی شہادت تک اسی عہدہ پر فائز رہے۔ بعد میں آپ نے ۱۹ر اکتوبر ۱۹۵۱ء سے ۱۷ر اپریل ۱۹۵۳ء تک بطور وزیر اعظم کے فرائض سرانجام دیئے۔

تحریکِ ختمِ نبوت

پاکستان کے پہلے وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خان کا تعلق قادیانی فرقے سے تھا اور علمائے کرام نے ان کو ہٹانے کے لیے تحریک ختم نبوت کا آغاز کیا اور پبلک کا یہ بھی مطالبہ تھا کہ قادیانی فرقہ کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔ ۱۸ر مئی ۱۹۵۲ء کو ظفر اللہ خان نے کراچی میں ایک جلسہ عام سے خطاب کیا۔ جس کے خلاف لوگوں نے توڑ پھوڑ کر کے شدید احتجاج کیا۔ اس طرح ملک گیر مظاہروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ حکومت نے ۶ مارچ ۱۹۵۳ء کو لاہور میں مارشل لاء نافذ کر دیا۔ اس کے باوجود جلوس نکالے گئے۔ جن میں سینکڑوں لوگ شہید اور زخمی ہوئے تحریک ختم نبوت نے خواجہ ناظم الدین کی حکومت کو کمزور کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

لیاقت علی خان کی شہادت

۱۶ر اکتوبر ۱۹۵۱ء کو وزیر اعظم لیاقت علی خان نے راولپنڈی میں جلسہ عام سے خطاب کرنے کا پروگرام بنایا جس میں شرکت کرنے کی غرض سے وہ قصر وزیر اعظم (کراچی) سے روانہ ہونے لگے تو ان کے دونوں بیٹوں اشرف اور اکبر نے سکول جانے کے لیے اپنے اپنے بستے بغل میں دبائے ہوئے تھے دونوں نے اپنے والد سے کہا: ”ڈیڈی! ہم بھی آپ کے ساتھ راولپنڈی چلیں گے۔“ لیکن ان کا جواب یہ تھا کہ ”نہیں تم سکول جاؤ گے“ چک لالہ کے ہوائی اڈے پر ان کا شاندار استقبال کیا گیا

لیکن راولپنڈی کے لیاقت باغ میں منعقد ہونے والے جلسے میں پہنچ کر جب تقریر شروع کی تو لاکھوں افراد کی موجودگی میں سید اکبر نامی بدبخت شخص نے انہیں گولی کا نشانہ بنادیا اور

بجھ گئی وہ شمع جس پر انجمن کو ناز تھا
پھول وہ توڑا گیا جس پر چمن کو ناز تھا

انہوں نے اپنی تقریر کا آغاز کرتے ہوئے ابھی ''برادران ملت'' کہا تھا کہ سید اکبر کی گولی کا نشانہ بن گئے۔ ان کے اگلے الفاظ یہ تھے کہ ''مجھے گولی لگ گئی ہے خدا پاکستان کی حفاظت کرے'' اور اس کے ساتھ کلمہ طیبہ کا ورد کرتے ہوئے زندگی کی آخری ہچکی لی۔ قائد ملت کے قاتل سید اکبر کو گولی چلانے کے فوراً بعد لوگوں نے دبوچ لیا تھا کہ محمد شاہ نامی پولیس انسپکٹر نے اپنے ریوالور سے اس پر گولیوں کی بوچھاڑ کر کے اسے موقع پر ہلاک کر دیا۔ ایک ذمہ دار پولیس افسر کے جذبات میں آ کر اس کوتاہی یا کسی اور وجہ سے اس حرکت نے لیاقت مرحوم کے سانحہ قتل پر ایسا پردہ ڈال دیا جو آج تک نہیں اٹھایا جاسکا۔

خان لیاقت علی خان کا سانحہ قتل ہماری قومی تاریخ کا ایک ایسا المیہ ہے جس پر جس قدر افسوس کیا جائے کم ہے۔ ان کے قتل کی سازش آج تک معمہ بنی ہوئی ہے۔ امریکی اور برطانوی سراغ رسانوں کی خدمات حاصل کرنے کے باوجود متعلقہ قانونی ادارے اپنے دامن پر لگنے والے اس سیاہ داغ کو مٹانے میں ناکام رہے ہیں۔ کتنے افسوس کا مقام ہے کہ ایک عام آدمی قتل ہو جائے تو درجنوں افراد کو گرفتار کر لیا جاتا ہے اور جن کے خلاف جرم ثابت ہو جائے انہیں تختہ دار پر لٹکا دیا جاتا ہے مگر پاکستان کا پہلا وزیراعظم اور قوم کا عظیم محسن دن دہاڑے لاکھوں افراد کے سامنے قتل کر دیا جاتا ہے لیکن اس سازش میں شریک لوگوں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے بجائے اس کے قتل کی

تحقیقات ہی ناتمام رہتی ہے۔ بعض حلقوں میں دوسری باتوں کے علاوہ وزیر اعظم پاکستان کے اس جلسے میں وزیر اعلیٰ پنجاب میاں ممتاز محمد خان دولتانہ کی عدم شرکت کے بارے میں آج تک چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں اور تاریخ کے طالب علم یہ سوال پوچھنے میں یقیناً حق بجانب ہیں کہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ کی وہ ایسی کون سی مصروفیت اور مجبوری تھی جس کے باعث وہ وزیر اعظم کے اس اہم جلسے میں شرکت نہ کر سکے؟

جلسہ گاہ میں راولپنڈی کے سپرنٹنڈنٹ پولیس نجف خان نے اپنے سپاہیوں کو للکار کر حکم دیا کہ گولی چلانے والے کو فوراً مار ڈالو سید اکبر بھی گولی کا نشانہ بن کر وہیں ڈھیر ہو گیا اس کے ساتھ ہی وہ راز بھی دفن ہو گیا کہ وہ راولپنڈی کیوں آیا اور پھر ہر طرح کی سیکورٹی کے باوجود اگلی صفوں تک کیسے رسائی حاصل کی۔

پھر اس بے ضابطہ کاروائی کے بعد سپرنٹنڈنٹ پولیس کے خلاف کیا کاروائی ہوئی؟ اسے D.I.G (ڈی۔آئی۔جی) کے عہدے پر ترقی کس کارگزاری کے صلے میں ملی؟ عام ذہن میں یہ سوال آج بھی جُوں کے توں قائم ہیں۔ اب تک کسی ایسی بے لاگ انکوائری کا نتیجہ برسرِ عام نہیں آیا جو ان سوالات کا تسلی بخش جواب دے سکے۔ ان کے دور میں حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش بھی ہوئی جس میں فوجی افسروں کے ساتھ فیض احمد فیض جیسے سوشلسٹ بھی ملوث تھے۔ یہ واقعہ ''پنڈی سازش کیس'' کے نام سے مشہور ہے' قائدِ ملت کو اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے نصف صدی گزر چکی ہے ان کے سانحہ قتل کا معمہ آج تک حل نہیں ہو سکا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ایک ایسی گہری سازش تھی جس میں اپنے اور بیگانے دونوں شریک تھے۔ حفیظ جالندھری مرحوم نے درست کہا تھا۔

مسلمانوں کا محسن تھا لیاقت
مسلمانوں نے اس کو مار ڈالا

لیاقت مرحوم زندگی بھر مسٹر جناح کے ساتھ رہے اور مرنے کے بعد بھی ملت

اسلامیہ کے دونوں عظیم محسن ایک ہی احاطہ میں دفن ہیں۔

پاکستان کے اس شریف طبع وزیر اعظم کی خدمات ہماری ملی تاریخ کے صفحات میں جگمگاتی رہیں گی۔

بیگم لیاقت علی خان

لیاقت علی خان غالباً اپنی خوبرو بیگم رعنا کے زیر اثر بہت زیادہ تھے' بیگم رعنا نے اس ملک میں اسلام بیزار مغرب زدہ خواتین کی مشہور تنظیم "اپوا" قائم کی جو آج بھی موجود ہے۔ اس تنظیم نے جو انڈے بچے دیئے ان کے تحت پاکستان بھر میں حجاب مخالف اور مذہب دشمن زمانہ انجمنوں کا جال بچھ گیا جنہیں یورپ اور امریکہ سے دامے درمے سخنے مدد ملنے لگی' شریعت اور اسلامی حدود کے ذکر سے ان تنظیموں کو اتنی ہی "الرجی" محسوس ہوتی ہے جتنی کہ اقلیتوں کو۔

غلام محمد بطور گورنر جنرل

لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد خواجہ ناظم الدین نے گورنر جنرل کا عہدہ چھوڑ کر وزارت عظمیٰ کا منصب سنبھالا۔ غلام محمد اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے گورنر جنرل کے بلند عہدہ پر فائز ہو گئے۔ اس طرح ملکی سیاست نے ایک نیا رخ اختیار کیا۔

خواجہ ناظم الدین کی برطرفی

غلام محمد چونکہ نالائق اور بے ہودہ انسان تھا ملک اور قوم کی ہمدردی اس کے پیش نظر نہ تھی۔ بدیں وجہ اس نے ۱۷ اپریل ۱۹۵۳ء کو خواجہ ناظم الدین کو وزارت عظمیٰ سے برطرف کر دیا۔

خواجہ صاحب کی شرافت، نرم دلی، ہمدردی، خوش اخلاقی اور انکساری میں کوئی شک نہیں کر سکتا لیکن اپنی ذاتی زندگی میں وہ جس طرح اسلام کے پابند تھے وہ

اسے ملک میں نافذ نہ کرسکے۔ اس کے علاوہ نظام اسلام کی عملی ترویج کو آئین کی شکل دینے کا کام بھی التوا میں پڑا رہا، خواجہ صاحب بطور گورنر جنرل یا بطور وزیر اعظم اپنے عہدوں سے انصاف نہ کرسکے اور یوں پس منظر میں دھکیل دیئے گئے اگر وہ ذرا ہمت کرتے تو غلام محمد جیسے بے ہودہ شخص کو آمرِ مطلق بننے اور پاکستان کو غیر دستوری راہ پر ڈالنے کی جرأت نہ ہوتی ایک کمزور دل اور غیر مؤثر حکمران خواہ ذاتی طور پر کتنا ہی بے لوث ہو مگر اپنی بزدلی اور کم ہمتی کی وجہ سے مقاصدِ اسلام کو زیادہ نقصان پہنچاتا ہے اور جاہ طلب لوگ عوام پر مسلط ہو جاتے ہیں تاریخ میں ہمیں ایسی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔

محمد علی بوگرہ (۱۹۵۳ء تا ۱۹۵۵ء)

خواجہ ناظم الدین کی برطرفی کے بعد محمد علی بوگرہ نے ۱۷/اپریل ۱۹۵۳ء کو وزارتِ عظمیٰ کا قلمدان سنبھالا۔ وہ اس سے قبل امریکہ میں پاکستان کے سفیر بھی تھے' خواجہ ناظم الدین کے بعد مشرقی پاکستان سے تعلق رکھنے والے محمد علی بوگرہ وزیر اعظم بنائے گئے جنہیں امریکہ سے (غالباً امریکی سفارت خانے کے اشارے پر) منگوایا گیا تھا۔ جہاں وہ پاکستان کے سفیر تھے ایوب خان کے مارشل لاء میں وہ وزیر خارجہ بھی رہے۔ ''محمد علی بوگرہ کی حیثیت غلام محمد کے ہرکارے کی سی تھی' ان کی عادات' ان کا مزاج' ان کا طرزِ زندگی امریکی بودوباش کی نقالی کی ایک ادنیٰ سی کوشش تھی۔ ایک دفعہ ڈھاکہ تشریف لائے تو (الطاف گوہر کہتا ہے کہ) مجھے حکم ملا کہ انہیں بنگال کی مصوری کے نمونے دکھائے جائیں ان دنوں تصویروں کی ایک نمائش ہو رہی تھی۔ میں انہیں ساتھ لے گیا۔ ان کی سوشل سیکرٹری' جو بعد میں بیگم عالیہ محمد علی بنیں ہمراہ تھیں' وہ نمائش کے مختلف کمروں اور برآمدوں سے تیزی سے گزرتے جاتے اور تصویریں چنتے

جاتے ''یہ'' اور ہاں ''وہ'' اور'' وہ والی'' انہوں نے کوئی پندرہ تصویریں اپنے ذاتی استعمال کے لیے خریدیں، جو تصویریں انہوں نے منتخب کیں وہ نمائش میں سب سے معمولی سمجھی گئیں، شاید اسی لیے انہوں نے آخری دم تک ان کی قیمت ادا نہ کی اور مصور انہیں کوستے رہے''۔ سو یہ تھے بوگرا جو پاکستانی انداز میں کھانا پہننا، اٹھنا، بیٹھنا اور سونا بھی نہیں جانتے تھے۔ اسلام سے بے بہرہ امریکی کلچر کے شیدائی۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے ایک حکمران!

پہلی دستور ساز اسمبلی کی برطرفی

گورنر غلام محمد نے ۲۴ر اکتوبر ۱۹۵۴ء کو پہلی دستور ساز اسمبلی کو برطرف کر دیا۔ اسمبلی کے سپیکر مولوی تمیز الدین نے اس اقدام کو سندھ ہائی کورٹ میں چیلنج کر دیا۔ جس نے گورنر جنرل کے اقدام کو غیر آئینی قرار دے دیا۔ تاہم حکومت نے اس فیصلہ کے خلاف فیڈرل کورٹ میں اپیل دائر کر دی۔ چیف جسٹس محمد منیر نے نظریہ ضرورت کے تحت حکومت کے اس اقدام کو درست قرار دے دیا۔

دوسری دستور ساز اسمبلی

ملک غلام محمد نے مئی ۱۹۵۵ء کو صوبائی اسمبلیوں کے اراکین کا ایک کنونشن کراچی میں منعقد کیا۔ اس میں ۸۰ اراکین پر مشتمل دوسری دستور ساز اسمبلی کا انتخاب کیا گیا۔

چوہدری محمد علی بطور وزیر اعظم (۱۹۵۵ء تا ۱۹۵۶ء)

بوگرہ وزارت کے خاتمے کے بعد ۱۱ر اگست ۱۹۵۵ء کو چوہدری محمد علی نے وزارت تشکیل دی۔ یہ مسلم لیگ اور یونائٹڈ فرنٹ کی مخلوط حکومت تھی جو کہ ۱۲ر ستمبر ۱۹۵۶ء تک جاری رہی۔ چوہدری محمد علی کی وزارت عظمیٰ کے تیرہ ماہ کے عرصے کے دوران ملک

میں کئی سیاسی تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئیں ان میں سے ملک غلام محمد کا استعفیٰ، ون یونٹ کا قیام اور ۱۹۵۶ء کے دستور کا نفاذ نمایاں تھیں۔

ون یونٹ کا قیام

۱۴ر اکتوبر ۱۹۵۵ء کو مغربی پاکستان کے تمام صوبوں کو ملا کر ایک ون یونٹ تشکیل دیا گیا۔ اس سے قبل ملک کی چاروں صوبائی اسمبلیوں نے اس کی منظوری دے دی تھی۔ مشتاق احمد گورمانی کو مغربی پاکستان کا پہلا گورنر اور ڈاکٹر خان صاحب کو پہلا وزیر اعلیٰ مقرر کیا گیا۔ ون یونٹ کے قیام سے مشرقی پاکستان کا ایک درینہ سیاسی مطالبہ پورا ہو گیا۔ پندرہ سال بعد یکم اپریل ۱۹۷۰ء کو یحییٰ خان نے ون یونٹ کو ختم کر دیا۔ انتظامی لحاظ سے یہ بڑا معقول اور قابل عمل منصوبہ تھا۔ لیکن جب اسے سیاسی اکھاڑے میں اتارا گیا تو اس کا حلیہ بگڑ کر رہ گیا۔ مسلم لیگ کے سوا تمام جماعتوں نے اس کی شدید مخالفت کی۔ خاص طور پر مشرقی پاکستان میں بڑا طوفان اٹھا۔ لیکن وزیر اعظم کے طور پر چوہدری محمد علی کا سب سے بڑا کارنامہ ۱۹۵۶ء کے آئین کا نفاذ تھا۔ پچھلے نو برس میں خاں لیاقت علی خاں سے لے کر اب تک کسی وزیر اعظم نے آئین سازی کے کام کو آگے نہ بڑھایا تھا۔ چوہدری محمد علی نے وزیر اعظم کا عہدہ سنبھالنے کے بعد پانچ ماہ کے اندر آئین کو شائع کر دیا۔

آئین کے خلاف اس تمام محاذ آرائی میں مخالفت اور مخاصمت کا سامنا چوہدری محمد علی نے بڑے تحمل اور بردباری اور مدبرانہ دانشمندی سے کیا۔ ان کی کوششیں بار آور ہوئیں اور ۲۳ر مارچ ۱۹۵۶ء کو پہلا آئین نافذ ہو کر اسلامیہ جمہوریہ پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔ نئے آئین کے تحت چوہدری محمد علی نے وزیر اعظم کے طور پر حلف اٹھایا۔ اور میجر جنرل اسکندر مرزا ملک کے پہلے صدر مقرر ہوئے۔

چوہدری محمد علی کا استعفیٰ

اسکندر مرزا صاحب جوڑ توڑ کے بادشاہ تھے گورنر جنرل یا صدر کے طور پر آئینی بندشوں اور پابندیوں میں مقید ہو کر رہنا ان کے لیے ناممکن تھا۔ جب ان کے دوست ڈاکٹر خان صاحب مغربی پاکستان کے وزیر اعلیٰ نامزد ہوئے تو انہیں کسی سیاسی پارٹی کی حمایت حاصل نہ تھی۔ ان کی دستگیری کے لیے اسکندر مرزا نے ری پبلکن پارٹی کی داغ بیل ڈالی۔ اس پارٹی کی تشکیل گورنمنٹ ہاؤس میں براہِ راست ان کی سربراہی میں ہوئی۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ری پبلکن پارٹی بنانے میں مغربی پاکستان کے گورنر نواب مشتاق احمد گورمانی بھی برابر کے شریک تھے۔ کہنے والے تو یہاں تک بھی کہتے ہیں کہ پارٹی کا منشور اور آئین بھی انہوں نے ہی مرتب کیا تھا۔

ری پبلک پارٹی بنتے ہی صدر اسکندر مرزا کے ہاتھ میں جادو کی چھڑی آ گئی جسے گھما کر وہ سیاست میں جب چاہتے اپنی پسند کی تبدیلی لا سکتے تھے۔ آئین نافذ ہونے کے تیرہ ماہ بعد چوہدری محمد علی وزیر اعظم کے عہدہ سے مستعفی ہو گئے۔ ہماری تاریخ میں یہ واحد مثال ہے جس میں کسی وزیر اعظم نے اپنے آپ کسی دباؤ کے بغیر اپنے عہدہ سے استعفیٰ دے دیا۔ چوہدری محمد علی انتھک کام کرنے کے عادی تھے۔ ان کی دیانت و امانت اور منصف مزاجی کا درجہ بھی اعلیٰ تھا۔ وزارتِ عظمیٰ سے سبکدوشی کے بعد انہوں نے نہایت صبر اور خاموشی سے زندگی گزاری۔ ایک بار انہیں علاج کے لیے بیرون ملک جانا ضروری ہو گیا لیکن وسائل کی کمی ان کے راستے میں حائل تھی۔ جب اسکندر مرزا کو اس صورتحال کا علم ہوا تو انہوں نے خود ان کے ہاں جا کر کوشش کی کہ ان کے اخراجات کے لیے وہ حکومت کی مالی امداد قبول کر لیں لیکن چوہدری صاحب نہ مانے ان کا مؤقف یہ تھا کہ انہوں نے حکومت کے لیے جو خدمات سر انجام دی ہیں ان کا

انہیں پورا معاوضہ ملتا رہا ہے۔اب وہ خواہ مخواہ پاکستان کے خزانے پر مزید بوجھ نہیں بننا چاہتے لیکن صدر مرزا کے مسلسل اصرار پر انہوں نے بیس ہزار روپیہ قرض حسنہ کے طور پر قبول کر لیا۔ بعدازاں یہ رقم انہوں نے چند قسطوں میں ادا بھی کر دی۔

(شہاب نامہ ۶۹۴)

حسین شہید سہروردی کی وزارت

مسٹر حسین شہید سہروردی کی دیرینہ آرزو پوری ہوئی۔ آپ نے ۱۲ ستمبر (۱۹۵۶ء) کو حکومت تشکیل دی۔ ان کی حکومت ری پبلکن پارٹی اور عوامی لیگ کے اشتراک سے بنی تھی۔ تیرہ ماہ بعد ری پبلکن پارٹی نے ان کا بھی ساتھ چھوڑ دیا۔ اور صدر مرزا نے ان کا استعفیٰ طلب کر لیا۔

حسین شہید سہروردی لا ابالی طبیعت اور رنگین مزاج والے وزیر اعظم مشہور تھے۔ ''سیکولرازم کا نمونہ' سیاست کے میدان میں صاحبِ فن' خوش مزاج' خوش گفتار' اور اعلیٰ پایہ کے ایکٹر۔ ان کا کردار' دورخی یا چہاررخی کا شکار نہیں بلکہ بسیار رخی کا مرقع تھا..... مزاج میں کھلنڈراپن تھا جو سیاست اور اقتدار کے سارے کھیل کو بے معنی بنا دیتا..... سیاسی فلسفے کی باتیں بڑے خیال افروز انداز میں کرتے تھے لیکن ان کا سیاسی دین وایمان کوئی نہ تھا۔

پاکستان سہروردی کے لیے نہ کوئی نظریہ تھا نہ کوئی قومی حقیقت' بلکہ سیاسی طالع آزمائی کے لیے ایک کھلا میدان تھا۔'' (الطاف گوہر)۔ کاک ٹیل پارٹیوں' شراب اور رقص وسرور کا رسیا یہ پاکستانی رہنما' مغرب نوازی میں تمام حدیں پار کر گیا۔ جب ساری دنیا مصر پر برطانیہ اور فرانس کے حملے کی مذمت کر رہی تھی تو اس نے مغرب کی وکالت کی۔ بیرون ملک دوروں میں وہ قابل اعتراض باتوں کا مرتکب ہوتا' خوبصورت عورتوں کے ساتھ ڈانس کرنے میں اسے لطف آتا اور ایسے کسی موقع کو ضائع نہ کرتا۔

شیخ مجیب الرحمٰن جیسا جھوٹا سیاستدان شاید بھی کوئی ہوا ہو، اس کی دریافت اور تربیت سہروردی ہی نے کی تھی' خواجہ افتخار نے شیخ مجیب الرحمٰن کے ساتھ لاہور میں ایک بار ملاقات کی تھی جب وہ ابھی ''بڑا لیڈر'' نہیں بنا تھا اور ڈھاکہ سے لاہور تک آمد کا کرایہ بھی سہروردی نے ادا کیا تھا' شیخ مجیب الرحمٰن نے سہروردی کے بارے میں خواجہ افتخار سے کہا ''سہروردی خود تو مشرقی پاکستان سے راہِ فرار اختیار کر کے مغربی پاکستان میں مزے لوٹ رہے ہیں اور مجھے مشرقی پاکستان کی جیلوں کے دہکتے الاؤ کا ایندھن بننے کے قیمتی مشوروں سے نواز رہے ہیں۔'' (دس پھول ایک کانٹا)

اکتوبر ۱۹۵۷ء میں سہروردی وزیراعظم کے عہدے سے مستعفی ہو گئے۔

اسماعیل چندریگر کی وزارت

اسماعیل چندریگر نے ۱۸/اکتوبر ۱۹۵۷ء کو مسلم لیگ اور ری پبلکن پارٹی کے تعاون سے وزارت کی تشکیل دی۔ یہ اتحاد زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا کیونکہ صرف دو ماہ کے بعد جداگانہ انتخابات کے مسئلہ پر ری پبلکن پارٹی الگ ہوگئی اس طرح صرف ۵۹ روز کے بعد چندریگر وزارت کا خاتمہ ہوگیا۔

اسماعیل ابراہیم چندریگر احمد آباد (بھارت) کے مہاجر تھے وہ بھی ذہنی اور قلبی طور پر سیکولر تھے' قریباً ڈیڑھ ماہ برسر اقتدار رہے' اس لیے پاکستان کی قومی پالیسیوں پر کوئی اثر نہ ڈال سکے۔ ڈیڑھ ماہ کے وزیراعظم کے متعلق مزید کچھ لکھنا لا حاصل ہوگا۔

ملک فیروز خان نون کی وزارت

چندریگر وزارت کے خاتمے پر ۱۶/ستمبر ۱۹۵۷ء کو فیروز خان نون نے حکومت تشکیل دی۔ جو کہ عوامی لیگ اور کرشک سرامک پارٹی پر مشتمل تھی۔ فیروز خان نون کی وزارت ۷/اکتوبر ۱۹۵۸ء تک جاری رہی۔ اس ایک سالہ دور میں ملک سیاسی انتشار

اور بدنظمی کا شکار رہا۔

آئین نافذ ہونے کے بعد تین سال کے عرصے میں چار مرکزی حکومتیں اقتدار میں آئیں جن میں گیارہ سیاسی پارٹیوں نے حصہ لیا۔ ری پبلک پارٹی ان سب میں شامل رہی۔

ملک فیروز خان نون ضلع خوشاب کے جاگیردار تھے ایچی سن اور آکسفورڈ کے تعلیم یافتہ نون فرنگیت کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ ان کے جاگیردار خاندان کی انگریزوں سے پرانی وفاداری مشہور تھی! ان کی بیگم وقار النساء (نومسلم یورپین خاتون) غالباً ان سے زیادہ مشہور ہیں بعض لوگوں نے ان کا تعلق سی آئی اے سے بھی جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ ملک فیروز خان نون مشرقی پاکستان اور پنجاب کے وزیر اعلی بھی رہے۔ دھیمے مزاج کے ایڈمنسٹریٹر تھے تاہم اسلام کے سلسلے میں ان کی اپروچ سیکولر اور زیادہ سے زیادہ معذرت خواہند تھی، اکتوبر ۱۹۵۸ء کے مارشل لاء کے ساتھ ہی انہیں وزارت عظمی سے ہٹا دیا گیا۔

مفلوج اور معذور گورنر

مسٹر غلام محمد کافی عرصہ سے فالج کے مریض تھے انکا بلڈ پریشر مستقل طور پر بہت اونچا رہتا تھا وہ چند قدم سے زیادہ چلنے پھرنے سے قطعاً معذور تھے۔ اور اکثر مریضوں والی پہیہ دار کرسی میں بیٹھ کر گورنر جنرل ہاؤس کا گشت کیا کرتے تھے۔ ان کے ہاتھ میں رعشہ تھا اور وہ اپنے دستخطوں کے علاوہ مزید کچھ لکھنے کے قابل نہ تھے۔ فالج نے ان کی زبان اور چہرے کو بھی متاثر کیا ہوا تھا جس کی وجہ سے ان کی گفتگو کسی کو سمجھ میں نہ آتی تھی۔ ان کے دہن کا عضلاتی نظام اس قدر کمزور ہو گیا تھا کہ جب وہ کھانے پینے کی کوئی چیز منہ میں ڈالتے تھے تو اس کا کچھ حصہ دونوں کونوں سے باہر گرتا رہتا تھا۔ اس

زمانے میں جب کوئی غیر ملکی سفیر اپنی اسناد پیش کرنے آتا تھا تو اسے گورنر جنرل کے ساتھ لنچ بھی کھلایا جاتا تھا سٹاف کے ممبر بھی لنچ میں شریک ہوتے تھے جس وقت مسٹر غلام محمد لقمہ منہ میں ڈال کر نئے سفیر کے ساتھ گفتگو فرمانے کی کوشش کرتے تھے تو وہ سماں بڑا عبرتناک ہوتا تھا۔

ان جسمانی عوارض کے علاوہ مسٹر غلام محمد کا ذہن بھی گنڈے دار تھا اور کسی قدر وقفے اور ناغے سے تھم تھم کر کام کرنے کا عادی تھا۔ کبھی تو ان کا دماغ بالکل صاف، شفاف اور تیز و طرار ہوتا تھا۔ اور وہ ہر چیز کو بجلی کی سی تیزی کے ساتھ سمجھ لیتے تھے لیکن کبھی وہ بلب کی طرح فیوز ہو کر مختل ہو جاتا تھا۔ ایسے موقعوں پر وہ کبھی بچوں کی سی حرکتیں کرنے لگتے تھے کبھی بالکل دیوانے نظر آتے تھے۔

مسٹر غلام محمد کے کردار میں کسی قسم کی کوئی آئیڈیل ازم نہ تھی۔ ان کے مقاصد میں اولیت کا شرف ہوس اقتدار کو حاصل تھا۔ دوسرے درجہ پر صنف نازک کی طرف ان کا شدید رجحان تھا جو اکثر مریضانہ حد تک پہنچ جایا کرتا تھا حالانکہ یہ بڑھاپے کی عمر میں تھے جہاں ایسی حرکتیں کرتے ہوئے آدمی کو شرم آنی چاہیے حدیث میں آتا ہے

> "تین آدمی ایسے ہیں جن سے اللہ تبارک وتعالیٰ قیامت کے دن بات نہیں کریں گے اور ان کی طرف نظر رحمت سے نہیں دیکھیں گے اور ان کو پاک بھی نہیں کریں گے اور ان کے لیے سخت عذاب ہوگا جن میں سے ایک بوڑھا زانی بھی ہے۔"

اپنے مقاصد کے حصول کے لیے وہ خود غرضی، خود سری، ہٹ دھرمی، دھونس دھاندلی اور ایچ پیچ کے سمیت ہر قسم کا حربہ استعمال کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ جن لوگوں نے ان کے ساتھ وزیراعظم لیاقت علی خان کی کابینہ میں کام کیا تھا، ان پر مسٹر غلام محمد کے کردار کے یہ سب پہلو روزِ روشن کی طرح عیاں تھے۔ یہ سب کچھ جانتے

بوجھتے ہوئے بھی جب انہیں بستر علالت سے اٹھا کر گورنر کی کرسی پر بٹھا دیا گیا تو یہ ایک ایسی غلطی کا ارتکاب تھا جس کا خمیازہ پاکستان آج تک بھگت رہا ہے۔اور یہ شخص گورنر جنرل کی کرسی سے اس طرح چمٹ گیا جیسے پاکستان اس کی یا اس کے باپ دادا کی ذاتی ملکیت ہے اور یہ اس ریاست کا نواب ہے۔

(شہاب نامہ ۶۴۲)

میاں محمد افضل لکھتے ہیں غلام محمد بنیادی طور پر فرنگی سانچے میں ڈھلا بیوروکریٹ تھا جو سیاستدان بن کر ملک کی تقدیر سے کھیلنے لگا۔اس کی کوئی کل سیدھی نہ تھی۔.....اگر لیاقت علی خان نے پاکستان کو آئین دے کر مسٹر جناح کے جمہوری خواب کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کی ہوتی تو وہ اس گولی کا نشانہ نہ بنتے جس نے وطن عزیز کو اقتدار برائے اقتدار کی اندھی ہوس رکھنے والے قسمت آزماؤں کی شکارگاہ بنا کر رکھ دیا۔ان قسمت آزماؤں میں غلام محمد کا نام سرفہرست ہے جس نے سیاسی جوڑ توڑ اور محلاتی سازشوں میں کچھ ایسا کمال حاصل کیا کہ حقیقی سیاسی اقتدار گورنر جنرل کے غیر سیاسی عہدے کے ساتھ وابستہ ہو گیا اور وزیر اعظم کا عہدہ ایک فٹ بال بن گیا، جب اپنے آخری ایام میں غلام محمد جسمانی اور ذہنی طور پر بالکل مفلوج ہو چکا تھا تب بھی وزیر اعظم کی حیثیت فٹ بال سے مختلف نہ تھی۔

ائیر مارشل (ریٹائرڈ) اصغر خان کے مطابق ''غلام محمد سر سے پاؤں تک بیوروکریٹ تھا' وہ نہ جمہوریت پر یقین رکھتا تھا نہ مشرقی پاکستان کے ساتھ برابر کے سلوک پر'' اس پر دوران اقتدار کئی بار دل کے حملے ہوئے مفلوج ہو گیا پھر بھی اس بدقسمت ملک میں جمہوریت اور شریفانہ اقدار کے ساتھ شیطانی کھیل جاری رکھا' اس نے ملک کو بے آئین بنانے اور سیاسی افراتفری پھیلانے کے لیے دستور ساز اسمبلی توڑ دی اور اس کے فیصلے کو سپریم کورٹ کے چیف جسٹس منیر نے بحال

رکھا'' (سپریم کورٹ کے) اس فیصلے میں سیاسی رنگ کا شائبہ تھا جس سے جمہوریت کے مستقبل اور عدلیہ کی آزادی پر دوررس اثرات مرتب ہوئے''۔ غلام محمد جیسے شخص کے بارے میں کہا جاسکتا ہے'' شکل جلالی، منہ میں گالی، ہاتھ پر تالی۔'' اور وہ یہی کچھ کرتا تھا ملک میں اسلام کے رشتے کو اس فرنگی نما بیوروکریٹ حکمران نے شدید نقصان پہنچایا ساتھ ہی پاکستان کی خالق جماعت مسلم لیگ کو سازشوں سے تباہ کردیا۔ اس کے ساتھی بھی اس کے سامنے جانے سے کتراتے تھے۔ کیونکہ وہ بے روک ٹوک غلیظ گالیاں دیتا تھا۔

(سقوط بغداد سے سقوط ڈھاکہ تک ص ۴۸۳)

مسٹر غلام محمد کا استعفی

جب مسٹر غلام محمد کی حالت زیادہ خراب ہونے لگی تو انہیں استعفی دینے پر آمادہ کرے کی کوشش کی گئی۔ لیکن پھر بھی وہ نہیں مانتے تھے۔ چنانچہ ان کی لڑکی سے مدد لی گئی لڑکی کے سمجھانے پر استعفی دینے پر آمادہ ہوئے پہلے تو انہوں نے دو ماہ کی چھٹی لی اور پھر مستعفی ہوگئے۔

ایوان صدر کے سیکرٹری قدرت اللہ شہاب لکھتے ہیں:

مجھ سے کئی بار یہ سوال کیا گیا کہ مسٹر غلام محمد اس قدر شدید بیمار تھے کہ وہ چل پھر نہ سکتے تھے، بول نہ سکتے تھے، زیادہ پڑھ لکھ نہ سکتے تھے لیکن اس کے باوجود وہ بڑے رعب وداب سے حکمرانی کرتے رہے اس کی طاقت کا اصلی راز کیا تھا؟

اس سوال کے دو جواب ہیں ایک جواب یہ ہے کہ مسٹر غلام کی طاقت کا سرچشمہ سیاست دانوں کی کمزوری تھی۔ اس کے علاوہ دوسرا جواب یہ بھی ہے کہ جنرل اسکندر مرزا کی شہ پر مسٹر غلام محمد کو کمانڈر انچیف ایوب خاں کی پشت پناہی بھی حاصل تھی جو

نظر نہ آنے والی روشنائی سے لکھی ہوئی تھی مستقبل کے بارے میں ان دونوں حضرات کے اپنے اپنے عزائم تھے۔ جو مسٹر غلام محمد کی طرز کے گورنر جنرل کی اوٹ لیے بغیر پروان نہ چڑھ سکتے تھے۔

(شہاب نامہ ص ۶۷۳)

(اگست ۱۹۵۶ء) اسے مسلمانوں کے قبرستان کی بجائے کراچی کے گورا (غیر مسلم) قبرستان میں دفن کیا گیا یہ تھا وہ شخص جس کی زبان اور ہاتھ سے شاید کوئی محفوظ نہ تھا اور جسے پاکستان کی قسمت سے کھیلنے کے لیے کھلا چھوڑ دیا گیا تھا۔

اسکندر مرزا غلام محمد کے مستعفی ہونے کے بعد

میجر جنرل اسکندر مرزا نے ۶/ اکتوبر ۱۹۵۵ء کو بطور گورنر جنرل کا حلف اٹھایا۔ اور ۲۳/ مارچ ۱۹۵۶ء تک اس عہدے پر کام کرتے رہے۔ کیونکہ اس کے بعد نئے دستور کے نفاذ کی وجہ سے آپ نے پاکستان کے صدر کا عہدہ سنبھالا۔

اسکندر مرزا ۲۷/ اکتوبر ۱۹۵۸ء تک ملک کے سیاہ وسفید کے مالک بنے رہے۔ ان کا یہ دور ہنگامہ خیز رہا۔ کیونکہ ان تین سالوں کے دوران ملک نے چار وزراء اعظم کا عروج وزوال دیکھا۔

پھر اسکندر مرزا نے آئین کو منسوخ کردیا۔ مرکزی اورصوبائی حکومتیں اوراسمبلیاں توڑ دی گئیں۔ اور جنرل ایوب خان کو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹر مقرر کردیا۔ اب اسکندر مرزا ایوانِ صدر کی فضا میں کٹی ہوئی پتنگ کی طرح تھا آئین کو منسوخ کرکے انہوں نے اپنے ہاتھوں وہ درخت ہی کاٹ کر پھینک دیا تھا جس کے سائے میں بیٹھ کر انہیں صدارت کی کرسی نصیب ہوئی تھی فوج کے شعبہ قانون کے ماہرین نے صاف طور پر یہ فیصلہ دے دیا تھا کہ آئین کی منسوخی کے ساتھ ہی صدر کا عہدہ ختم ہوجائے گا۔ اوراب حکومت کا واحد سربراہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹر ہے۔ چنانچہ ۲۷/

اکتوبر ۱۹۵۸ء کو رات کے وقت فوج کے ایک دستے نے ایوان صدر کو گھیرے میں لے لیا۔ تین جرنیل اور ایک مسلح بریگیڈیر اسکندر مرزا کے پاس گئے اور انہیں کرسی صدارت سے پہلے کوئٹہ اور پھر لندن روانہ کر دیا۔

یاں محمد افضل لکھتے ہیں

غلام محمد کی جگہ سکندر مرزا نے لی' اسکندر مرزا کی بیوی ناہید مرزا ایرانی نژاد تھیں اسلام سے دونوں کا تعلق واجبی تھا' یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ اسکندر مرزا ذہنی طور پر دین مخالف کیمپ کا آدمی تھا۔ جلاوطنی کے دوران جب وہ ۱۹۶۹ء میں لندن میں فوت ہوا تو اسے وصیت کے مطابق ایرانی شہر تہران کے شاہی قبرستان میں دفن کیا گیا۔ اسکندر مرزا اپنے پیش رو گورنر جنرل کی طرح وزیر اعظم بناتا اور برصرف کرتا رہا، کبھی سہروردی کبھی چندریگر' کبھی فیروز خان نون۔ سب کو انگلیوں پر نچاتے رہنا اس کا مرغوب کھیل تھا۔ اقتدار کو پکا کرنے کے لیے اس نے ۱۹۵۶ء کے آئین کو منسوخ کر کے ایوب خان سے مارشل لاء لگوایا اور جس شیر کی پیٹھ پر سواری کرنے کی کوشش کی وہی اسے ہڑپ کر گیا مارشل لاء والوں نے ۲۷ راکتوبر ۱۹۵۸ء کو اسے حکومت سے رخصت کر کے لندن جلاوطن کر دیا۔ مشرقی پاکستان میں اپنی گورنری کے دور میں اس نے بنگالیوں پر بے پناہ ظلم ڈھا۔ یے تھے اور دونوں بازوؤں کے درمیان ایسی نفرتیں پیدا کیں کہ دل دوبارہ کبھی نہ مل سکے۔ گورنر جنرلی اور صدارت کے عہد میں ملک کو بھٹو جیسے وزیر کا تحفہ دیا جسے ایوب خان نے بھی چھوڑنا مناسب نہ سمجھا، آئین کی تذلیل کی' الیکشن کرانے سے انکار کیا، اپنی بیوی ناہید مرزا کے ذریعے بے دینی، بے غیرتی اور بے حیائی کو فروغ دیا، ناہید مرزا کی خوبصورتی کے چرچے واشنگٹن تک تھے اور کراچی میں غیر ملکی سفارتخانوں کی پارٹیوں کی رونق اسی کے دم قدم سے تھی۔ گمان ہے کہ میاں بیوی

دونوں کسی بیرونی جاسوس ادارے (سی آئی اے وغیرہ) سے تعلق رکھتے تھے۔

سکندر مرزا نے پاکستان کو سیاسی طور پر بدترین عدم استحکام سے دوچار کیا، مفاد پرستوں کے ایک گروہ کوری پبلکن پارٹی کے پلیٹ فارم پر جمع کیا اور کٹھ پتلی تماشا شروع کر دیا۔ ''۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۸ء کے درمیانی عرصہ میں قومی کردار کی تشکیل کا عمل ایک دم رک گیا تھا اور ایک ایسے معاشرے نے جنم لیا تھا جس کی کوئی نظریاتی بنیاد نہ تھی اور جس کی رگوں اور نسوں میں خود غرضی، مفاد پرستی، اخلاقی بے حسی اور حرص و لالچ کا زہر رچ بس گیا تھا، مایوسی اور نا امیدی کی اس طویل رات کے اندھیروں میں حرمت قوم اور عظمت وطن کے خواب گم ہو کر رہ گئے تھے'' (غلام اکبر) ان حالات میں عجب نہ تھا کہ سب سے بڑے صوبے (مشرقی پاکستان) کی اسمبلی میں وزیر اعلیٰ عطاء الرحمٰن کے ایما پر حزب اختلاف اور حزب اقتدار کے ارکان کے درمیان خونی دنگل ہوا اور اس دھینگا مشتی کے دوران ڈپٹی سپیکر شدید زخمی ہوا اور چند روز بعد مر گیا۔ یہ ستمبر ۱۹۵۸ء کی بات ہے۔ چنانچہ سکندر مرزا نے اس قوم کو نحوست کے تاریک سایوں کے سوا کچھ نہ دیا۔ ملک عملاً سی آئی اے کی جولان گاہ بن گیا، مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان اسلام اور اخوت کے رشتے خود غرضیوں کی دھول میں گم ہو گئے۔ اپنی کتاب ''سیاست میں جرنیل'' میں اصغر خان نے لکھا ہے کہ ایوب خان اور سکندر مرزا دونوں ہی سی آئی اے کے آدمی تھے۔ سکندر مرزا کے متعلق اصغر خان کے خیالات یہ ہیں ''سکندر مرزا، ایوب خان کی نسبت امریکہ سے زیادہ قرب رکھتا تھا' حقیقت یہ تھی کہ مرزا کی امریکن نوازی اکثر خود امریکیوں کو الجھن میں ڈال دیتی تھی، وہ یہ یقین رکھتا تھا کہ پاکستان کی تقدیر مغرب سے وابستہ ہے اور امریکہ کے وفادار اور زبردست اتحادی کی طرح سوچتا اور عمل کرتا تھا۔ سکندر مرزا پاکستان اور امریکہ کے مفادات کے درمیان خط

امتیاز نہیں ڈالتا تھا۔ جب بھی کوئی معلومات یا سہولت امریکہ مانگتا فوراً مہیا کر دیتا تھا یہ تھا پاکستان کا حکمران سکندر مرزا۔

(سقوط بغداد سے سقوط ڈھاکہ تک ص ۴۸۴)

جنرل ایوب خان اور پہلا مارشل لاء

ملک میں سیاسی ابتری اور لاقانونیت کے پیش نظر اسکندر مرزا نے ۷/اکتوبر ۱۹۵۸ء کو مارشل لاء نافذ کر دیا۔ اور جنرل ایوب خان کو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹر مقرر کیا۔ اس موقع پر اسکندر مرزا نے کہا:

''میں پچھلے دو سالوں سے تشویش اور اضطراب سے اس بات کا مشاہدہ کر رہا ہوں کہ ملک میں حصول اقتدار کی سنگدلانہ جدوجہد جاری ہے جس میں دیانت دار، محبّ وطن، سادہ لوح اور محنتی لوگوں کا استحصال کیا جا رہا ہے... ملک کے سربراہ کی حیثیت سے خدا اور قوم کے سامنے میرا پہلا فرض پاکستان کی سالمیت کو برقرار رکھنا ہے۔ غداروں اور سیاسی طالع آزماؤں کی سنگدلانہ حرکتیں ملک کی سلامتی کے لیے خطرہ ہیں۔ اب میں زیادہ دیر تک ایسے اقدامات کا خاموش تماشائی نہیں رہ سکتا۔''

تاہم مارشل لاء نافذ کرنے کے باوجود اسکندر مرزا اقتدار پر قابض نہ رہ سکے کیونکہ جنرل ایوب خان نے ۷/اکتوبر ۱۹۵۸ء کو انہیں مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا۔ اس طرح ایوب خان کے عہد ساز دور کا آغاز ہوا جو کہ مارچ ۱۹۶۹ء تک جاری رہا یہ دور پاکستان کی تاریخ میں بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس میں نہ صرف ملک کی صنعتوں کو فروغ دیا گیا اور خارجہ حکمت عملی میں تبدیلی لائی گئی بلکہ ۱۹۶۲ء میں ایک نیا صدارتی آئین نافذ کر کے بنیادی جمہوریتوں کا نظام متعارف کروایا گیا۔ اس کے علاوہ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں بھارت کو شکست دی گئی۔

بنیادی جمہوریتوں کا نظام

جنرل ایوب خان کی حکومت نے پاکستان میں بنیادی جمہوریتوں کا نظام نافذ کیا اس کے تحت ملک میں (۸۰،۰۰۰) اسی ہزار وارڈ کمیٹیاں۔ (۸۸۶۴) آٹھ ہزار، آٹھ سو تریسٹھ یونین کونسلیں تشکیل دی گئیں۔

بنیادی جمہوریت کے نظام کے ذریعے ملک میں بالواسطہ انتخابات کا طریقہ رائج کیا گیا۔ اس کے تحت منتخب ہونے والے (۸۰،۰۰۰) اسی ہزار بعدازاں (۱،۲۰،۰۰۰) ایک لاکھ بیس ہزار ارکان صدر اور اسمبلیوں کا انتخاب کرتے تھے۔

۱۹۶۲ء کا آئین

۱۹۵۶ء کا دستور ۷/اکتوبر ۱۹۵۸ء کو منسوخ کر دیا گیا تھا جنرل ایوب خان نے نیا دستور مرتب کرنے کے لیے جسٹس شہاب الدین کی سربراہی میں ایک کمیشن تشکیل دیا جس نے ۶/مئی ۱۹۶۱ء کو اپنی سفارشات پیش کردیں، جنوری ۱۹۶۲ء میں صدارتی کابینہ نے اس مسودے کی منظوری دے دی، بعدازاں ۸/جون ۱۹۶۲ء کو نیا دستور ملک میں نافذ کر دیا گیا۔

صدارتی انتخابات

آئین منظور ہونے کے بعد صدر اور اسمبلیوں کے انتخابات کا مرحلہ تھا اپنے بنائے ہوئے آئین سے صدر ایوب خان کو خطرہ لاحق ہوا کہ صدارتی انتخابات میں شاید شکست کھا جائیں۔ اس ڈر اور وہم کو دور کرنے کے لیے انہوں نے آئین میں کئی ترمیمیں کروائیں۔ جن میں سے ایک اہم ترمیم یہ بھی تھی کہ صدارتی انتخابات عام انتخابات سے پہلے ہوگا۔ حالانکہ دستور کے مطابق عام انتخابات کے بعد صدارتی انتخابات کا مرحلہ تھا۔ لیکن انہوں نے اپنے مفاد کے لیے صدارتی انتخابات پہلے کروالیا

جس میں انہوں نے دھونس دھاندلی اور دیگر کئی حربے مخالف کو شکست دینے کے لیے استعمال کیے۔ ان اقدامات سے ان شکوک وشبہات کو مزید تقویت ملی کہ صدر ایوب سیاست کے علاوہ نظم ونسق کے ہر شعبہ میں بھی طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کر کے اگلا صدارتی انتخاب ہر قیمت پر جیتنے کا جال بچھارہے تھے۔

ان آئینی ترامیم کے ساتھ ہی صدر کے عہدہ کے لیے انتخابی مہم پورے زوروشور سے شروع ہوگئی۔ ملک کے بہت سے سربرآوردہ سیاسی لیڈر صدر ایوب کی مخالفت کے لیے کمربستہ ہوگئے۔ ان میں خواجہ ناظم الدین، میاں ممتاز دولتانہ، شیخ مجیب الرحمٰن، مولانا بھاشانی، خان عبدالولی خان، چوہدری محمد علی اور مولانا مودودی کے نام سرفہرست تھے۔ ان رہنماؤں کی قیادت میں کونسل مسلم لیگ، عوامی لیگ، نیشنل عوامی پارٹی، نظام اسلام پارٹی اور جماعت اسلامی کے اتحاد سے ''کمبائنڈ اپوزیشن پارٹیز'' کی تنظیم قائم ہوئی۔ جس کا واحد مقصد صدر ایوب کو صدارتی انتخاب میں شکست دینا تھا۔ اس کے علاوہ ان کا اور کوئی مشترکہ لائحہ عمل یا منشور نہ تھا۔

اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے یہ لازمی تھا کہ یہ متحدہ محاذ ایک ایسا صدارتی امیدوار نامزد کرے جو ایوب خان کو شکست دینے کی اہلیت رکھتا ہو۔ ان کے سامنے ایک نام تو مس فاطمہ جناح کا تھا۔ جو مسٹر جناح کی بہن ہونے کے ناطے سے ملک بھر میں ایک خاص عزت واحترام اور جذباتی قدر ومنزلت کی حامل تھیں۔ دوسرا امکان جنرل محمد اعظم خان کے نام کا تھا۔ گورنر کے طور پر وہ مشرقی پاکستان میں نمایاں ہردل عزیزی حاصل کر چکے تھے۔ اور وزیرِ مہاجرین وبحالیات کی حیثیت سے وہ مغربی پاکستان میں بھی خاصے نیک نام تھے۔ مس فاطمہ جناح کی جگہ اگر جنرل محمد اعظم کو صدارتی امیدوار نامزد کیا جاتا تو یقیناً صدر ایوب کو بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔ لیکن وزیرِ خارجہ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے اس موقع پر ایک عجیب چال چلی نیشنل

عوامی پارٹی کے ایک ممتاز رکن مسٹر مسیح الرحمٰن سے ان کا گہرا یارانہ تھا، مسیح الرحمٰن بھٹو صاحب کے ہم نوالہ وہم پیالہ ہونے کے علاوہ مولانا بھاشانی کے دستِ راست بھی تھے۔ ذاتی طور پر وہ اچھی شہرت کے مالک نہ تھے۔ مسٹر بھٹو نے انہیں پانچ لاکھ روپے کے عوض خرید لیا۔ بعض ذرائع تو اس پانچ لاکھ روپے کی بانٹ میں مولانا بھاشانی کو بھی شراکت کا حصہ دار ٹھہراتے تھے۔ (واللہ أعلم بالصواب) مسیح الرحمٰن کے داؤ پیچ میں آ کر مولانا بھاشانی نے کمبائنڈ اپوزیشن پارٹیز پر شرط عائد کر دی کہ وہ صرف ایسی شخصیت کو صدارتی امیدوار نامزد کریں جس کا مارشل لاء کی حکومت سے کبھی کوئی تعلق نہ رہا ہو جنرل اعظم خان مارشل لاء کی حکومت کا ایک نہایت اہم رکن رہ چکے تھے۔ اس لیے یہ شرط عائد ہونے کے بعد صدارتی امیدوار کی حیثیت سے ان کا نام خود بخود خارج از بحث ہو گیا۔

اسی طرح کا پیچ دار حربہ استعمال کر کے صدارتی انتخاب کے سلسلے میں مسٹر بھٹو نے صدر ایوب کی ایک اور اہم خدمت بھی سرانجام دی تھی۔ چند قانونی ماہرین کے مشورے سے کبائنڈ اپوزیشن پارٹیز نے یہ خفیہ فیصلہ کیا کہ ایوب خان کی ہمدارتی امیدوار کی حیثیت کو سپریم کورٹ میں چیلنج کیا جائے کیونکہ فیلڈ مارشل کے طور پر ان کی تقرری کے جو احکام جاری ہوئے تھے۔ ان کے پیشِ نظر وہ آئینی طور پر کسی انتخاب میں حصہ لینے کے اہل نہیں رہے۔ اپنی قیمت وصول کر کے مسیح الرحمٰن نے متحدہ محاذ کا یہ راز اندرون خانہ بھی مسٹر بھٹو پر فاش کر دیا۔ حفظِ ماتقدم کے طور پر صدر ایوب نے فوراً اپنی تقرری کے احکامات میں مؤثر بر ماضی ردوبدل کر کے انہیں آئینی تقاضوں کے ہم آہنگ کر لیا۔

صدر ایوب اپنے انتخاب کی راہ میں ہر رکاوٹ کو دور کرنا اپنا حق سمجھنے لگے تھے۔ اس عمل میں ان کے نزدیک جائز یا ناجائز طریقے کار کی کوئی تمیز باقی نہ رہی تھی۔

میرے خیال میں اپنے زوال کی طرف یہ بھی ان کا ایک یقینی قدم تھا۔

صدارتی الیکشن کے دوران صدر ایوب نے دین اور دنیا دونوں سے بے دریغ فائدہ اٹھایا۔ پہلے تو ایک مشہور پیر صاحب نے اعلان فرما دیا کہ انہیں بذریعہ کشف یہ الہام ہوا ہے کہ کمبائنڈ اپوزیشن پارٹیز کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل نہیں۔ اس کے بعد چند علمائے کرام نے یہ فتویٰ بھی صادر کر دیا کہ اسلام کی رو سے کسی عورت کا سربراہ مملکت کے عہدے پر فائز ہونا جائز نہیں۔ اس مسئلہ پر جماعت اسلامی کے سربراہ مولانا مودودی کی یہ رائے تھی کہ اسلام میں عورت کے سربراہ مملکت ہونے کی اجازت تو ہے لیکن مناسب نہیں۔ صدر ایوب کے حواریوں نے مس فاطمہ جناح کو نیچا دکھانے کے لیے حسب توفیق اسلام کا ہر ممکن استعمال یا استحصال کیا۔

صدارتی الیکشن کے دوران دین کے علاوہ دنیا بھی بے حساب کمائی اور لٹائی گئی۔ ایوب خان کی کنونشن مسلم لیگ کے ہاتھ میں کروڑوں کا الیکشن فنڈ موجود تھا اس کے جمع کرنے کے لیے ہر طرح کے حربے استعمال کیے گئے تھے۔ اکثر تاجروں اور صنعت کاروں کو امپورٹ لائسنسوں پر مقررہ شرح سے الیکشن فنڈ میں چندہ دینا ہوتا تھا۔ کچھ لائسنس فرضی ناموں پر جاری کر کے بھاری قیمت پر ضرورت مند تاجروں اور صنعتکاروں کے ہاتھ فروخت کر دیئے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ پٹسن کے کارخانوں اور سوتی اور اونی ٹیکسٹائل ملوں سے بھی بھاری بھرکم چندے وصول کیے گئے تھے۔ اس بہتی گنگا میں ہر کوئی ننگا اشنان کر رہا تھا اور بہت سے کارکن اپنا اپنا ہاتھ رنگنے میں نہایت بے حجابی سے برسرِ عام مصروف تھے۔ صدر ایوب کے صدارتی انتخاب کی مہم میں پیسے کی ریل پیل نے سیاسی گلشن اور سٹرن کو ایسا فروغ بخشا جس کی مثال ہماری تاریخ میں پہلے نہیں ملتی۔ انہوں نے سیاست کی تطہیر کی خاطر پوری فوج کے ساتھ سیاستدانوں پر چڑھائی کی تھی اور اب ان کی پارٹی خود ہی الیکشن کے تالاب میں گندی مچھلی کا روایتی

کردار ادا کرنے میں سرگرمِ عمل تھی۔

الیکشن کے بعد ۳ رجنوری ۱۹۶۵ء کو جب نتیجہ برآمد ہوا تو صدر ایوب کے حق میں ۴۹۶۴۷ ووٹ اور مس فاطمہ کے حق میں ۲۸۳۴۵ ووٹوں کا اعلان ہوا۔ بظاہر ایوب خان صاحب ۲۱۳۰۲ ووٹوں کی اکثریت سے جیت گئے تھے لیکن اس تعداد سے کئی گنا زیادہ عوام کی نظر میں دراصل وہ بازی ہار بیٹھے تھے۔ کیونکہ اب وہ اس طرح کا امیج لے کر نہیں ابھرے تھے جس کے ساتھ وہ پہلے پہل اقتدار میں آئے تھے۔

[شہاب نامہ ۱۰۲۳]

مس فاطمہ جناح کا قوم میں عزت واحترام کا مقام

جس روز صدر ایوب صدارتی الیکشن میں کامیاب ہوئے اسی روز سے ان کے زوال کی ابتداء ہوگئی تھی۔ بظاہر وہ جیت جانے پر خوش تھے لیکن درحقیقت وہ قوم کی نگاہوں میں متنفر ہو چکے تھے۔ لیکن ان کے مقابلے میں مس فاطمہ جناح اگرچہ ہار گئیں لیکن قوم کی نگاہوں میں پہلے سے کہیں زیادہ قابلِ عزت واحترام بن گئیں۔ کیونکہ ان کا ہارنا حکومت کی بدمعاشی کی وجہ سے تھا۔ جس کے ہاتھ میں حکومت واقتدار ہوتا ہے وہ ہر قسم کی بدمعاشی کے حربے استعمال کر کے اپنے آپ کو کامیاب کروالیتا ہے۔ مگر یہ کامیابی درحقیقت ناکامی کی علامت ہوتی ہے۔ مس فاطمہ جناح اپنے بھائی کی طرح پوری قوم کے لیے قابلِ احترام تھیں۔ یہ اپوزیشن کی غلطی تھی کہ صدارتی انتخاب لڑنے کے لیے انہوں نے قابل احترام شخصیت کو ایوب خان کے مقابلے میں صدارتی الیکشن لڑنے کے لیے کھڑا کر دیا۔ ہمارے ہاں الیکشن میں یہ صورت حال ہے کہ جو زیادہ بدمعاش اور سرمایہ والا ہوتا ہے وہ اپنی بدمعاشی کے زور سے الیکشن جیت جاتا ہے خصوصاً جبکہ وہ حکمران بھی ہو۔ اور شریف آدمی ناکام ہو جاتا ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ

فرض کر لیجئے یہاں اگر کوئی پیغمبر بھی مقابلے میں آجائے تو وہ بھی ناکام ہو جائے گا، خونی رشتے تو کئی ہم نے ناکام ہوتے ہوئے دیکھے ہیں۔ مثلاً باپ بیٹے کے مقابلے میں اور بھائی بھائی کے مقابلے میں ناکام ہونے کی کئی مثالیں موجود ہیں۔ اور یہ مثال بھی موجود ہے کہ بیٹا بادشاہ ہے اس نے اپنے ہی باپ کو جیل میں ڈال رکھا ہے۔ بھائی ملک کا سربراہ یا وزیرِ اعلیٰ ہے اس نے اپنے بھائی کو جیل میں ڈال رکھا ہے۔ جب اقتدار ہاتھ میں ہوتا ہے تو اس کے تحفظ کے لیے خونی رشتے کی بھی لوگ پرواہ نہیں کرتے۔

کابل کے نادر شاہ کا واقعہ

افغانستان کا سابق بادشاہ ظاہر شاہ کے والد نادر شاہ کا یہ واقعہ مشہور ہے کہ وہ ایک مرتبہ لندن گئے ہوئے تھے۔ ان کے بھائی ولی شاہ نے ان کو وائرلیس پر اطلاع دی کہ باغیوں نے کابل پر قبضہ کر لیا ہے اس نے اپنے بھائی سے پوچھا تم اس وقت کہاں ہو' تو اس نے کابل سے دور کوئی مقام بتایا اس نے پوچھا تمہارے پاس شاہی دستے کے کتنے آدمی ہیں تو اس نے ان کو بتایا کہ میرے ہمراہ اتنے آدمی ہیں۔ اور اس وقت تقریباً سورج غروب ہو چکا تھا۔ تو نادر شاہ نے اپنے بھائی ولی شاہ کو کہا کہ تم رات کی تاریکی میں کابل پہنچنے کی کوشش کرو اور کابل پر قبضہ کرو باغی چونکہ اس وقت کابل میں ہیں سورج نکلنے کے بعد یہ لوگ ملک میں پھیل جائیں گے اور دوسرے باغیوں کو بھی اپنے ساتھ ملا لیں گے۔ تو پھر ہمارے لیے دشواری پیدا ہو گی۔ چنانچہ ولی شاہ شاہی دستے کے ساتھ کابل روانہ ہو گیا۔ صبح صادق ہونے سے پہلے رات کی تاریکی میں کابل پہنچ گیا۔ ادھر باغیوں کو بھی ان کی آمد کا پتہ چل گیا تو انہوں نے شاہی قلعہ کی دیواروں پر جبراً ان کے بیوی بچوں اور پورے خاندان کو بیٹھا دیا۔ ان کا خیال تھا کہ

فائرنگ کر کے قبضہ کرنے کی کوشش کریں گے تو پہلے اپنے ہی خاندان کو ختم کر کے قبضہ ہوگا اور وہ ایسا ہرگز نہ کرسکیں گے۔

ولی شاہ نے پھر وائرلیس پر صورتحال بتلائی کہ قبضہ تو ہو جائے گا مگر ہمارا خاندان ختم ہو جائے گا۔تو اس نے کہا تم اس بات کی کوئی پرواہ نہ کرو ہمارے بیوی بچے اور پورا خاندان تباہ ہوتا ہے تو ہو جائے تم قبضہ کرو۔تم بھی جوان ہو اور میں بھی جوان ہوں پھر شادی کریں گے۔ بچے بھی ہوں گے۔چنانچہ انہوں نے فائر کھول دیا اور اپنا پورا خاندان ختم کر دیا اور کابل پر قبضہ کرلیا۔

اس واقعہ سے اندازہ لگائیں کہ والدین اور بیوی بچوں کی ثانوں حیثیت ہے اول حیثیت اقتدار پر قبضہ جمانے کی ہے۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو کون نہی جانتا ؟ کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے محبت و پیار بھی بہت تھا۔حضرت حسین رضی اللہ عنہ جنت کے جوانوں میں سے ہیں اور ساری امت محمدیہ کے محبوب ہیں۔مگر اقتدار کے نشہ میں یزید اور ان کے کرندوں نے ان کو بھی معاف نہ کیا اور اہل بیت پر وہ ظلم ڈھائے جو قیامت تک امت کو نہ بھولیں گے۔اور تعجب کی بات یہ ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کو شہید کرنے والے مسلمان ہونے کا دعویٰ بھی کرتے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی ہونے پر فخر بھی محسوس کرتے ہیں۔مگر اقتدار نے انہیں ایسا اندھا کر دیا کہ وہ یہ سب کچھ ہی بھول گئے۔ جہاں اتنے بڑے ظلم ہوئے ہیں وہاں مس فاطمہ جناح کا احترام کس نے کرنا تھا۔ لہٰذا اپوزیشن نے ان کو ایوب خان کے مقابلے میں صدارتی الیکشن لڑنے پر کھڑا کر کے مس فاطمہ جناح پر بہت بڑی زیادتی اور ظلم کیا۔اور ایوب خان اور اس کے کارندوں کو شرم وحیا نہ آئی کہ وہ ایسی خاتون کو اپنی بدمعاشیوں سے شکست دے رہے ہیں جو ساری پاکستانی قوم کے لیے مادرِ ملت کے احترام کے مقام پر ہے۔

مس فاطمہ جناح کی موت طبعی تھی یا غیر طبعی؟

محترمہ کا دل حالات کی سنگینی کی وجہ سے افسردہ اور پاش پاش ہو چکا تھا اور انہی حالات میں محترمہ شب سیاہ میں کسی ڈوبتے ستارے کی طرح سطح آسمان سے ہمیشہ کے لیے پوشیدہ کر دی گئیں۔

ہماری تاریخ کے اوراق پر ایسی اموات سوالیہ نشان کی طرح موجود ہیں ایسی اموات کا کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کون کس طرح موت کے تاریک راستوں کا حصہ بن گیا۔ مادرِ ملت کو کس نے مارا یہ ابھی تک راز ہی ہے لیکن گزشتہ روز ایک پیر پختہ کار پیرزادہ شریف الدین صاحب کا بیان نظر سے گزرا کہ محترمہ کو ان کے پشتو سپیکنگ ملازم نے ڈنڈوں سے مارا تھا۔

مغل بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر کا واقعہ

مغل حکمرانوں کے دور کی ہی بات کر لی جائے اور اس میں سے بھی نرم ترین اور سب سے رحمدلانہ شہرت رکھنے والے مغل بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے طرزِ حکمرانی کے ایک کم مشہور گوشے پر نظر ڈالی جائے تو وہ کسی کو بھی چونکا دینے کے لیے کافی ہے۔اورنگ زیب عالمگیر وہ مغل شہنشاہ تھے جن کے بارے میں ان کے دور کے سرکاری کاتبوں کی لکھی ہوئی تاریخ کے مطابق وہ بطور حکمران تنخواہ نہیں لیتے تھے بلکہ ٹوپیاں سی کر اور قرآن کریم کی کتابت کر کے گزر بسر کرتے تھے۔ درباری تاریخ میں ان کی اس رحم دلی کی کتھا اپنی جگہ لیکن ان کی زندگی کا ایک اور مسلمہ پہلو یہ ہے کہ جب انہیں اس بات کا خوف محسوس ہوا کہ کہیں ان کی ماں جنا ہوا ان کا سگا بھائی داراشکوہ ان کی بادشاہی نہ چھین لے تو اس رحمدل بادشاہ نے اپنے اس بھائی جس کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر اس کا بچپن ، جھولتے اسے لڑکپن اور پھر جوانی کی منہ زور وادی میں

لایا تھا اسی بھائی کو گرفتار کر کے بغیر تنخواہ کے بادشاہت کرنے والے بادشاہ نے اس کی دونوں آنکھیں نکال کر کوؤں کو ڈال دیں۔

اورنگ زیب عالمگیر نے اپنے باپ کو بطور قیدی اندھیرے تہہ خانے میں بند رکھا جس کے حقوق کے بارے میں قرآن حکیم ہی میں فرمایا گیا کہ "اپنے والدین سے اسی طرح مہربانی والا سلوک کرو جس طرح کا سلوک انہوں نے تم سے بچپن میں کیا تھا۔"

بادشاہوں کی تاریخ کا یہ ایک مسلسل جاری عمل ہے اور یوں لگتا ہے کہ جیسے سروس آف پاکستان کے ڈسپلن کے زور پر پاکستان کے ایوان اقتدار پر قبضہ کرنے کے شوقین جرنیل بھی شاہی شوق رکھتے ہیں۔ سب سے پہلے انڈرکٹ لگا کر میجر جنرل سکندر مرزا نے منتخب حکومت کو گھر بھجوایا اس کے بعد ان کے استاد جنرل ایوب نے ایبڈو لگا کر پاکستان کی مقبول' معروف اور عوامی قیادت کو سیاست سے بے دخل کرنے کی بنیاد رکھی پھر جنرل یحییٰ نے بنگال کو فتح کرنے کے لیے ان کا مینڈیٹ بوٹوں تلے روند دیا عین اسی تسلسل میں جنرل ضیا نے اپنے بڑوں کے طریقے کو آگے بڑھاتے ہوئے پاکستان کی سیاسی جماعتوں کو ملک کے سیاسی نظام سے خارج کرنے کے لیے ۱۹۸۵ء کے غیر جماعتی انتخابات کے ذریعے الیکشن کو کارپوریٹ کلچر اور لوٹا ساز انڈسٹری میں تبدیل کر دیا۔

جنرل مشرف بھی یہی شاہی شوق رکھتے ہیں اسی لیے وہ آئین پاکستان مجریہ ۱۹۷۳ء میں درج انسانی، بنیادی اور سیاسی حقوق کو بلڈوز کرتے ہوئے پولیٹیکل پارٹیز ایکٹ کو اینٹی روشن خیال قانون سمجھتے ہوئے اور اپنے ہی دستخطوں سے جاری کردہ الیکشن آرڈر کے بارے میں ایک بھارتی ٹی وی نیٹ ورک سے انٹرویو کے دوران اس کا اظہار ان الفاظ میں کر چکے ہیں۔ "میں بینظیر بھٹو اور نواز شریف کو الیکشن میں حصہ نہیں لینے دوں گا۔"

جرنیل صاحب کے مشیروں نے انہیں یقیناً جنرل اسکندر مرزا سے لے کر جنرل ضیاء الحق تک کے آزمودہ عسکری نسخے سمجھا کر ہی بتایا ہوگا کہ وہ ملک کے ان دو سابق وزرائے اعظم اور دو بڑی عوامی جمہوری پارٹیوں کے سربراہوں کو بے دخل کیے بغیر نیرو کی بانسری پر مزید قبضہ قائم نہیں رکھ سکتے مگر وہ شاید بھول گئے ہوں گے کہ اقتدار کے دوام کے شوقین حکمرانوں کا ڈراپ سین کیا ہوتا آیا ہے۔ سیانے کہتے ہیں بادشاہوں کا مشیر ہر وقت خطرے کی زد میں ہوتا ہے میں سیانا نہیں اس لیے میں کہتا ہوں کہ ایسے غیر مشروط مشیروں کے بادشاہ ہر وقت خطرے میں ہوتے ہیں اور وہ اس لیے کہ مشیروں کی نوکریاں پکی ہیں بادشاہ آتے ہیں شوق پالتے ہیں، شوق کی قیمت ادا کرتے ہیں اور پھر نئے بادشاہ آجاتے ہیں کچھ ایسے ہوتے ہیں جو پھلدار درخت کی طرح پتھر کھاتے ہیں، پتھر مارنے والا پتھر کے عوض پھل حاصل کرتا ہے اور کچھ ایسے ہوتے ہیں جنہیں کوئی پتھر نہیں مارتا کیونکہ پتھر ثمر بار درختوں پر پڑتے ہیں۔ بغیر پھل کے درخت ظاہری طور پر کتنا ہی شاداب کیوں نہ نظر آئے اس کے بارے میں تاریخ ہمیشہ یہی کہتی ہے۔

بڑا شاداب لیکن بے ثمر ..... تھا
کسی ناراض موسم کا شجر ..... تھا

ایوب خان کا زوال

حکومت مخالف جماعتیں ایوب حکومت کو ختم کرنا چاہتی تھیں۔ اس سلسلے میں مئی ۱۹۶۷ء میں ڈھاکہ میں اجلاس منعقد کیا گیا۔ اس میں پانچ ہمخیال جماعتوں یعنی عوامی لیگ، جماعت اسلامی، کونسل مسلم لیگ، نظام اسلام پارٹی اور نصر اللہ گروپ نے تحریکِ جمہوریت پاکستان (پی، ڈی، ایم) تشکیل دی۔ بعدازاں ذوالفقار علی بھٹو

اور ائیر مارشل اصغر خان نے ملک کا دورہ کر کے ایوب حکومت کے خلاف رائے عامہ ہموار کی اسی دوران میں مارکیٹ سے چینی اچانک غیب ہوگئی جس سے عوام سڑکوں پر نکل آئی۔ تحریکِ جمہوریت کا باقاعدہ آغاز ۱۹۶۸ء میں کیا گیا۔ اس کے بعد وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ تحریک زور پکڑتی چلی گئی۔ ملک گیر مظاہروں، جلسوں، جلوسوں اور ہڑتالوں کا ایک نا ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ۹ رنومبر ۱۹۶۸ء کو کالج بند کر دیئے گئے ایوب خان نے ملک میں تحریک کو ختم کرنے کے لیے ۱۷ر فروری ۱۹۶۹ء کو ایک گول میز کانفرنس میں سیاستدانوں سے مذاکرات کئے۔ جن میں اپوزیشن نے مطالبہ کیا کہ ہنگامی حالت ختم کی جائے۔ بنیادی حقوق بحال کر کے سیاسی قیدیوں کو رہا کیا جائے چنانچہ ایوب خان نے سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا جن میں بھٹو اور شیخ مجیب الرحمٰن شامل تھے۔

گول میز کانفرنس اپنے مقاصد حاصل نہ کر سکی اس کا دوسرا راونڈ ۱۰ مارچ کو منعقد کیا گیا۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کا شہر شہر، گلی گلی، کوچہ کوچہ ایوب کتا ہائے ہائے، ایوب کتا مردہ باد کے فلک شگاف نعروں سے گونج رہا تھا۔ اس ماحول میں ایوب خان نے کابینہ کا اجلاس بلایا جو ان کے عہدِ صدارت کی آخری کیبنٹ میٹنگ ثابت ہوئی۔ کمانڈر انچیف جنرل یحییٰ کو اس میٹنگ میں خاص طور پر مدعو کیا گیا تھا۔ صدر نے ملک میں پھیلی ہوئی بدامنی اور بدنظمی کا تجزیہ کر کے یہ تجویز پیش کی کہ اس بگڑتی ہوئی صورتحال پر قابو پانے کا واحد طریقہ مارشل لاء کا نفاذ ہے سب کی آنکھیں بری فوج کے کمانڈر انچیف کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ جب جنرل یحییٰ سے اس تجویز پر رائے طلب کی گئی تو انہوں نے یہ کہہ کر کنّی کترالی کہ وہ اس بارے میں صدر ایوب سے الگ بات کریں گے۔ اس کے بعد صدر ایوب کی آخری کابینہ کا آخری اجلاس ہمیشہ کے لیے برخاست ہوگیا۔

بعدازاں تخلیہ میں صدر ایوب اور جنرل یحییٰ کے مابین جو گفتگو ہوئی اس کا براہِ راست کسی کو کچھ علم نہیں۔ البتہ بعض قرائن وشواہد سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جنرل یحییٰ نے مارشل لاء نافذ کرنے کی حامی اس شرط پر بھری کہ مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کو توڑ دیا جائے صوبائی گورنر کو ان کی کابینہ سمیت موقوف کردیا جائے۔ اور ۱۹۶۲ء کے آئین کو منسوخ کردیا جائے۔ صدر ایوب عاقل آدمی تھے۔ جنرل یحییٰ کا اشارہ پاگئے کہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بن کر وہ خود صدارت کی کرسی سنبھالنے کے خواہشمند ہیں۔ ان کی اپنی ذاتی مصلحت کا تقاضا بھی یہی تھا کہ فیلڈ مارشل محمد ایوب خان اپنے پرودہ جنرل آغا محمد یحییٰ خان کے سامنے سرتسلیم خم کردیں۔ چنانچہ ایوانِ صدر کے بند کمرے میں انہوں نے خاموشی سے بلاچوں چرا ان کی ساری شرائط منظور کرلیں۔ چنانچہ اگلے روز صبح ۱۰ بجے ایوان صدر میں صدر ایوب نے اپنا آخری پیغام ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لیے ریکارڈ کروایا۔ ریکارڈنگ کے دوران جنرل یحییٰ خاں غمگین صورت بنائے، سر جھکائے بیٹھے رہے لیکن جوں ہی ریکارڈنگ کے ٹیپ ان کے قبضہ میں آگئے، ان کا چہرا خوشی سے تمتما اٹھا، وہ ہشاش بشاش جھومتے جھامتے کمانڈر انچیف ہاؤس واپس آئے اپنے چند لنگوٹیے دوستوں اور منظورِ نظر خواتین کو طلب کیا شرابِ ناب کا دور چلا اور دیر تک سب نے ''ہے جمالوں'' کی تان پر آپس میں مل جل کر بھنگڑا ڈالا۔

۲۵ مارچ کو جنرل یحییٰ نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کا عہدہ سنبھالا۔

صدر ایوب کی شخصیت چنار کے درخت کی طرح خوبصورت تناور اور شاندار تھی لیکن گرتے وقت اس کا تنا کافی حد تک کھوکھلا ہوچکا تھا ذاتی طور پر وہ نیکی، شرافت، عدل پسندی اور رحم دلی کے خوگر تھے۔ اقتدار میں آکر انہوں نے ایک محنتی طالب علم کی لگن سے اپنا کام سیکھا۔ اور اس میں نمایاں مہارت حاصل کی۔ ان کی رگ رگ میں

حبّ الوطنی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ خارجہ پالیسیوں میں نئے زاویے قبول کر کے انہوں نے دنیا بھر میں پاکستان کا وقار بلند کیا۔ اندرون ملک انہیں زرعی، صنعتی اور تجارتی ترقی کو بامِ عروج تک پہنچانے کا جنون تھا۔ ان شعبوں میں انہوں نے اتنی کامیابی ضرور حاصل کی کہ بہت سے لوگ ان کے دورِ حکومت کو پاکستان کی مادی ترقی کا سنہری زمانہ کہتے ہیں۔ لیکن سیاست میں وہ ناکام رہے۔

[شہاب نامہ ۱۰۴۶]

بلاشبہ صدر ایوب کے دورِ حکومت میں ملک کو استحکام نصیب ہوا۔ بین الاقوامی امور میں سوجھ بوجھ اور حسنِ تدبیر سے کام لیتے ہوئے ملک کی خارجہ پالیسی میں نمایاں تبدیلی ہوئی اور پاکستان کو چین کے بہادر عوام جیسے مخلص دوست مل گئے۔ عرب ممالک میں پاکستان کی عزت ووقار بحال ہوا۔ پاکستان کے اسلام دوست عوام کی محبت کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ دنیا کے عظیم ملک روس نے پاکستان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ تین اسلامی ممالک پاکستان، ایران اور ترکی کی کنفیڈریشن قائم ہوئی جو اسلامی اخوت کی بہترین مثال تھی۔

ایوب خان کی سیاسی زندگی کا آغاز کافی حوصلہ افزا تھا۔ فوری طور پر ملک میں کچھ خوشگوار تبدیلیاں بھی رونما ہوئیں اور جب تک وہ سپاہیانہ جذبے سے ملکی معاملات طے کرتے رہے ملک میں خاصا کام ہوتا رہا۔ مگر پھر جونہی انہوں نے عملی سیاست میں قدم رکھا اور کچھ نئے خوشامدی اور پرانے سیاستدانوں نے ان کا قرب حاصل کیا وہ عوام سے دور ہوتے گئے۔

[انقلاب منزل بمنزل۔ ۲۳۹]

تین مسلح افواج نے بڑی حد تک ان کا بھرپور ساتھ دیا۔ لیکن اقتدار کے آخری ایام میں ان کے پروردہ چند بڑے افسران کے ساتھ بے وفائی کر کے اقتدار سے

علیحدگی کے بعد انہوں نے اپنی زندگی کے ایام نہایت خاموشی اور وقار سے گزارے بہت سے لوگوں کے دلوں میں ان کی اچھی اور خوشگوار یادیں ہمیشہ تازہ رہیں۔ اسلام آباد میں جب کبھی وہ عید کی نماز پڑھنے عیدگاہ میں آتے تھے۔ تو ایک بڑا ہجوم ان کے گلے ملنے یا ہاتھ ملانے کے شوق میں انہیں گھیر لیتا تھا۔

ایک روز راولپنڈی میں کتابوں کی دکان سے باہر نکل رہے تھے تو کچھ طلبہ نے انہیں گھیر لیا ایک لڑکے نے کہا سر آپ دوبارہ صدارت کیوں نہیں سنبھالتے ایوب خان نے مسکرا کر جواب دیا بیٹا اب ایوب کتا بوڑھا ہو گیا ہے۔

[شہاب نامہ۔ ۱۰۵۰]

جنرل یحییٰ خان

(۱۹۶۹ء تا ۱۹۷۱ء)

ایوب حکومت کے خاتمے کے بعد جنرل محمد یحییٰ خان نے ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء کو پاکستان کی باگ دوڑ سنبھالی اور ملک کی تاریخ کا دوسرا مارشل لاء نافذ کر دیا۔ ۱۹۶۲ء کے آئین کو منسوخ کر دیا گیا۔ پاکستان کا نظم ونسق چلانے کے لیے جنرل مظفر الدین کو مشرقی پاکستان اور جنرل عتیق الرحمٰن کو مغربی پاکستان کا مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مقرر کیا گیا۔

۱۹۷۰ء کے عام انتخابات

یحییٰ حکومت نے ۷ دسمبر ۱۹۷۰ء کو ملک میں عام انتخابات کا انعقاد کیا۔ جن کے مطابق قومی اسمبلی میں مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ نے ۱۶۰، بھٹو کی پاکستان پیپلز پارٹی نے ۸۱، مسلم لیگ قیوم نے ۹ ،مسلم لیگ کونسل نے ۷، مسلم لیگ کنونشن ۲، جمعیت علمائے اسلام ۷، جماعت اسلامی نے ۴، جمعیت علمائے پاکستان نے ۷، جمہوری پارٹی

نے ایک، نیپ (ولی گروپ) نے ۶ اور آزاد ارکان نے ۱۶ نشستیں حاصل کیں۔

سانحہ مشرقی پاکستان

دسمبر ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں شیخ مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ نے ۱۶۰ نشستوں کے ساتھ قومی اسمبلی میں اکثریت حاصل کرلی اس کی بنیاد پر اس نے قومی اسمبلی کا اجلاس بلانے کا مطالبہ کیا۔ مگر یحییٰ خان نے یہ اجلاس بلانے سے گریز کیا، کیونکہ اس کو خدشہ تھا کہ شیخ مجیب الرحمٰن اقتدار حاصل کرکے ملک کی سالمیت کے لیے خطرہ بن جائے گا۔ اس صورت حال نے بنگالیوں کے ذہن میں شکوک وشبہات پیدا کردیئے۔ جس کے نتیجے میں انہوں نے بھارت کے تعاون سے مشرقی پاکستان میں گوریلا کاروائی کا آغاز کردیا۔ یحییٰ حکومت نے اس تحریک کو کچلنے کے لیے طاقت کا استعمال کیا۔ اس مقصد کے لیے جنرل ٹکا خان کو مشرقی پاکستان کا گورنر مقرر کیا گیا۔ طاقت کے استعمال سے بنگالیوں کے دل میں مغربی پاکستان کے لیے شدید نفرت پیدا ہوگئی۔ بھارت نے عوامی لیگ کے رضا کاروں کو گوریلا جنگ کی تربیت دی۔ اس طرح مکتی باہنی کی فوج تیار ہوگئی۔ جس نے پاکستانی فوج کے لیے مشکلات پیدا کردیں۔

گوریلا جنگ بالآخر نومبر ۱۹۷۱ء میں پاک بھارت جنگ کی صورت اختیار کر گئی۔ مغربی پاکستان کی صورتِ حال کے برعکس مشرقی پاکستان میں بھارت کو برتری حاصل تھی۔ کیونکہ یہاں پاکستانی فوج نے نہ صرف محدود اسلحہ اور فضائی تحفظ کے بغیر دشمن کی زیادہ نفری کا مقابلہ کیا۔ بلکہ اندرونی محاذ پر بنگالیوں کی گوریلا فوج بھی اس کے عقب پہ حملے کررہی تھی۔ ان نامساعد حالات میں پاکستانی دستہ زیادہ دیر تک دشمن کی پیش قدمی کو نہ روک سکا اور ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو بھارتی فوج ڈھاکہ پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ نوے ہزار سے زیادہ سول اور فوجی افراد جنگی قیدی بنالیے گئے اس

طرح بنگلہ دیش وجود میں آ گیا۔ شیخ مجیب الرحمٰن کو اس کا پہلا صدر منتخب کیا گیا۔

شیخ مجیب الرحمٰن کے چھ نکات

مشرقی پاکستان کی جماعت عوامی لیگ کے سربراہ شیخ مجیب الرحمٰن نے فروری ۱۹۶۶ء میں اپنے مشہور چھ نکات پیش کیے جو کہ بعدازاں ۱۹۷۱ء میں پاک بھارت جنگ اور سقوط ڈھاکہ کا سبب بنے یہ چھ نکات درج ذیل ہیں۔

1. قراردادِ لاہور کی بنیاد پر پاکستان میں وفاقی پارلیمانی نظام تشکیل دیا جائے۔ قومی اسمبلی کا انتخاب بالغ رائے دہی کی بنیاد پر کیا جائے۔
2. دفاع اور امور خارجہ کے محکمے وفاق کے پاس ہوں جبکہ دیگر تمام محکمے صوبوں کو دیئے جائیں۔
3. مغربی اور مشرقی پاکستان کے لیے الگ کرنسیوں کا اجرا کیا جائے۔
4. صوبوں کو ٹیکس عائد کرنے کے اختیارات دیئے جائیں۔
5. صوبائی حکومتوں کو بیرونی ممالک کے ساتھ تجارتی تعلقات قائم کرنے اور سمجھوتے کرنے کا اختیار دیا جائے۔ ہر صوبے کے زرِ مبادلہ کے ذخائر الگ ہوں۔
6. صوبائی حکومتوں کو اپنی ملیشیا یا نیم فوجی فورس رکھنے کا اختیار دیا جائے۔

۱۴ اگست ۱۹۷۰ء کو یوم آزادی پاکستان کی بجائے ڈھاکہ یونیورسٹی میں بنگلہ دیش کے جھنڈے نمایاں طور پر لہرائے گئے اور بنگلہ دیش کے ایک بڑے نقشے کی نقاب کشائی کی گئی لیکن حکومت خاموش رہی۔ ایک طرف مجیب کو چھ نکات الیکشن مہم میں استعمال کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا گیا اور اس کی پر فریب باتوں پر اعتماد کیا گیا دوسری طرف لیگل فریم ورک آرڈر میں (جہاں مستقبل کے دستور کی بہت سے رہنما

باتیں طے کردی گئیں تھیں) صوبائی خودمختاری کے اہم ترین مسئلے کو چھیڑا ہی نہ گیا، دلیل دی گئی کہ اس کا حل آنے والی اسمبلی طے کرے گی۔ کہا جاتا ہے کہ ایسا گورنر احسن کے مشورے پر کیا گیا تھا جو شیخ مجیب کے زیر اثر تھا۔ بہر حال وجہ جو بھی ہو اس نازک مسئلے کو پہلے طے کیے بغیر الیکشن کرانا قومی خودکشی کے مترادف تھا۔ یہ "کتے چھوڑنا اور پتھر باندھ رکھنا" والی ضرب المثل تھی۔ نتائج تباہ کن تھے، شیخ مجیب تو چاہتا ہی یہ تھا کہ صوبائی خودمختاری کی حدود پیشگی طے کیے بغیر انتخابات کرائے جائیں تاکہ اسے چھ نکات کا پراپیگنڈا کرنے کا پورا موقع مل سکے۔ لیگل فریم ورک آرڈر میں ایک اور اہم بات بھی طے نہ کی گئی، اس کا تعلق آئین کی منظوری کے لیے درکار اسمبلی کے ارکان کی کم ازکم تعداد سے تھا، اسمبلی کا اجلاس طلب کرنے کے لیے الیکشن کے بعد کم ازکم مدت کا تعین نہ کیا گیا۔ واضح ہے کہ یہ سب کچھ بدنیتی پر مبنی تھا' فروگزاشت کا کوئی دخل نہ تھا۔ اس کا مطلب تو یہ تھا کہ بے شک سادہ اکثریت سے اسمبلی آئین منظور کرلیتی۔ اگر دوتہائی ارکان کی شرط رکھ دی جاتی تو پھر مجیب کے لیے مغربی پاکستان کے ارکان کو نظرانداز کرکے دستور بنانا ممکن نہ ہوتا اور بنگلہ دیش کے منصوبے پر بذریعہ اسمبلی عمل کرنے سے پہلے سو بار سوچتا اور نہ ہی الیکشن کے بعد جارحانہ رویہ اختیار کرتا۔

بہر حال یہ وہ کوتاہیاں اور خرابیاں تھیں جو جان بوجھ کر یا پھر شیخ مجیب کو دوسروں پر سبقت دلانے کے لیے لیگل فریم ورک آرڈر میں برقرار رکھی گئیں۔ ان حالات میں الیکشن ہوئے اور میدان مشرقی پاکستان میں قریباً سو فی صد عوامی لیگ کے اور مغربی پاکستان میں اکثریت کی حد تک پی پی پی کے ہاتھ میں رہا، ہم یہاں مختلف سیاسی جماعتوں کی نشستوں کی تعداد وغیرہ جیسے خشک اعداد وشمار کی بات نہیں کریں گے' اتنا کافی ہے کہ مشرقی حصے میں اسلام پسند جماعتیں بالکل پٹ گئیں' چین نواز نیپ

(بھاشانی گروپ) نے ویسے ہی فضا سونگھ کر انتخابات کا بائیکاٹ کیا تھا۔ الیکشن کے بعد جو صورت حال بنی اس میں فوجی حکومت کبھی شیخ مجیب کو مستقبل کا وزیراعظم کہتی اور کبھی بھٹو سے پینگیں بڑھاتی' دراصل یحیٰی کی طویل عرصہ تک صدارت کے عہدے پر برقرار رہنے کی خواہش پوری ہوتی نظر نہیں آتی تھی۔ لیکن یہ کیا دھرا یحیٰی خان حکومت کا تھا' جرنیلوں نے پھنیر سانپ کو دودھ پلا پلا کر اس قابل کر دیا تھا کہ وہ اب اژدھا کی طرح انہیں نگل سکتا تھا۔ بنگالی مصنف جی۔ ڈبلیو چوہدری نے لکھا ہے کہ سیلاب اور اس کے بعد سمندری طوفان (اکتوبر ۱۹۷۰ء) کے بعد نورالامین جیسے متعدد محبّ وطن رہنماؤں نے حکومت سے اپیل کی تھی کہ ہنگامی صورت حال کے پیشِ نظر انتخابات ملتوی کر دیئے جائیں لیکن یحیٰی نے ان رہنماؤں سے ملنے سے ہی انکار کر دیا تھا اور نومبر سے اوائل دسمبر کے عرصے میں ڈھاکہ میں اس نے شیخ مجیب سے تین خفیہ ملاقاتیں کی تھیں۔ گورنر احسن نے شیخ مجیب اور اس کے ٹولے کو پاکستان کے اتحاد کے خلاف مہم چلانے کی کھلی چھٹی دیئے رکھی اور ساتھ ہی ان کے مخالف سیاستدانوں کے غنڈے صوبے بھر میں مخالفوں کے جلسے الٹتے رہے، ان کے کارکن قتل کرتے رہے' جماعت اسلامی سے انہیں شدید بیر تھا' لیکن ان کاروائیوں پر حکومت نے عوامی لیگیوں کے خلاف کوئی کاروائی نہ کی۔ عوامی لیگ جو غلط اور جھوٹا پراپیگنڈا' معاشی حقائق کے حوالے سے مغربی پاکستان کے خلاف کرتی رہی اور اشتہار چھاپ کر تقسیم کرتی رہی جواباً حکومت نے بنگالی عوام کو حقائق بتانے کی ذرا بھی کوشش نہ کی۔ کیا گورنر احسن غیر ملکی طاقت کی سازش میں شریک تھے؟ مہم کے دوران عوامی لیگ نے سرحد پار سے بھاری مقدار میں اسلحہ اور رقم حاصل کی، خفیہ رپورٹیں مرکز کو جاتی رہیں لیکن کوئی کاروائی نہ ہوئی۔

مشرقی پاکستان کی عملی علیحدگی کے سلسلے کا آغاز عام طور پر ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کی

فوجی کاروائی سے منسوب کیا جاتا ہے لیکن اس مصنف کے خیال میں علیحدگی کا حقیقی عمل ۷ دسمبر ۱۹۷۰ء سے شروع ہوا جب قومی انتخابات کرائے گئے اور نتیجہ نکلا' بقول زیڈ اے بھٹو ''اِدھر ہم اُدھر تم''۔

[سقوط بغداد سے سقوط ڈھاکہ تک ص ۴۷۵]

جنرل یحییٰ کے غلط فیصلے

یحییٰ خان نے مارشل لاء لگانے کے بعد دو ایسے فیصلے کیے جن سے مشرقی ومغربی پاکستان کے درمیان کچے دھاگے سے قائم سیاسی توازن کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ اللہ جانے ان فیصلوں کے پس پردہ کیا سازش کارفرما تھی؟ جو کچھ ہوا بہت ہی برا ہوا' ایک ایسا تیر چھوڑا گیا جو کبھی واپس نہیں آسکتا تھا۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان سیاسی توازن کی بنیاد ''برابری'' (پیرٹی) کا اصول تھا جسے قومی رہنماؤں نے ۹ سال کی محنت اور کوشش کے بعد ۱۹۵۶ء میں اپنایا تھا' ون یونٹ'' یعنی مغربی پاکستان کے چار صوبوں کی جگہ ایک صوبہ' اس ''پیرٹی'' کے اصول کا لازمی نتیجہ تھا۔ یحییٰ خان نے پیرٹی ختم کر کے ''ایک فرد ایک ووٹ'' کا اصول اختیار کیا، ساتھ ہی ون یونٹ ختم کر کے مغربی پاکستان کے پرانے صوبے بحال کر دیئے' اس کا نتیجہ تباہ کن نکلا۔ مشرقی پاکستان کے قوم پرست سیاستدانوں نے اس فیصلے پر جنرل یحییٰ کی تعریف کی، مغربی پاکستان کے ''علاقہ پرست'' سیاستدانوں نے ون یونٹ کے خاتمے پر خوشیاں منائیں لیکن قوم اور اسلام کا درد رکھنے والوں کے دل آنے والے وقت کا تصور کر کے بجھ گئے۔ اب شیخ مجیب الرحمٰن کے لیے اکثریت کے بل پر حکومت حاصل کر کے علیحدگی اختیار کرنے کا آئینی راستہ بھی صاف ہو چکا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ اس صورت حال میں ہمیشہ مشرقی پاکستان کے ارکان کی اسمبلی میں اکثریت ہونی تھی، بھٹو جیسے اقتدار پرستوں کے لیے حکومت کا کوئی چانس باقی نہ رہتا۔ اس طرح یحییٰ خان نے ایک

سیاسی ''پنڈوراباکس'' کھولا جو کبھی بند نہ ہو سکتا تھا۔

[سقوط بغداد سے سقوط ڈھاکہ تک ص۴۷۲]

تہمینہ شیر درانی لکھتی ہیں:

۳دسمبر ۱۹۷۱ء مشرقی پاکستان کے محاذ پر لڑائی شروع ہوگئی قلیل تعداد اور مشکل حالات کے باجود پاکستانی بہادر فوجیوں نے ہندوستان کو ناکوں چنے چبوادیئے اور سرحدی علاقوں پر کسی بڑے شہر پر بھارت کو قبضہ نہ کرنے دیا۔ ٦ دسمبر کو ہندوستان نے بنگلہ دیش کی جلاوطن حکومت کو تسلیم کرنے کا اعلان کردیا۔ تخریب کاروں نے مواصلات کا نظام درہم برہم کردیا۔ بھارتی ہوائی فوج نے ڈھاکہ کا ہوائی اڈہ تباہ کردیا۔فضائی چھاتے کی عدم موجودگی کے سبب پاکستانی صفوں کے پیچھے بھارتی فوج اتر آئی، ۷ دسمبر کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ۱۱ کے مقابلے میں ۱۰۴ ووٹوں کی اکثریت سے ایک قرارداد میں اپیل کی کہ جنگ بندی کرکے فوجوں کو واپس بلا لیا جائے۔مگر بھارت نے اسے مسترد کردیا۔۱۰ دسمبر کو پاکستانی وفد کے قائد ذوالفقار علی بھٹو نے سلامتی کونسل سے خطاب کیا لیکن جنگ بندی کی جو قرارداد فرانس اور برطانیہ نے پیش کی تھی قبول نہ کی بلکہ پولینڈ کی قرارداد بھی پھاڑ دی۔مشرقی پاکستان کو بچانے کی واحد صورت یہ تھی کہ مغربی پاکستان کے محاذ پر بھرپور فوجی کامیابیاں حاصل کرکے بھارت پر شدید دباؤ ڈالا جاتا۔مگر ابتدائی کاروائی کے بعد فوج نے صرف دفاع پر اکتفا کیا۔ ۱٦ دسمبر کو بھارت نے ڈھاکہ پر قبضہ کرلیا اور پاکستانی فوج نے ہتھیار ڈال دیئے۔اگلے دن مغربی محاذ پر بھی جنگ بند ہوگئی۔اس طرح پاکستان سب سے بڑے اسلامی مملکت کے مقام سے گرگیا اور مشرقی پاکستان دنیا کے نقشے پر بنگلہ دیش کے نام سے ابھرا۔

عوام میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی بجلی بن کر گری، تاریخ پاکستان کا یہ ایک

انتہائی دردناک موڑ تھا۔ جب ان گنت قربانیوں کے بعد حاصل کیا گیا یہ وطن اپنوں ہی کی ضد، ہٹ دھرمی اور ہوس اقتدار کی وجہ سے دولخت ہوگیا۔ اس دلدوز واقعہ بقول، تحریک پاکستان کے ایک سرگرم راہنما و آزاد کشمیر کے پہلے سول ایڈمنسٹریٹر (آزاد کشمیر کے قیام کے فوراً بعد انتخابات کروانے سے پہلے جو بنے تھے) آغا شیر نواب خان (مرحوم) ''صرف میں ہی نہیں ہر محبِّ وطن پھوٹ پھوٹ کر روئے اور آج بھی اس واقعے پر میرا دل خون کے آنسو روتا ہے۔''

بلاشبہ مسلم قوم کے لیے یہ مقام عبرت تھا جوانہوں نے اپنے مسلم بھائیوں اور وہ بھائی جنہوں نے مل کر ایک ہی اسلامی مملکت کے خواب کی تعبیر کے لیے اپنا سب کچھ قربان کردیا تھا، انہی مسلمانوں بھائیوں کے مقابلے کے لیے ان غیر مسلموں کا سہارا لیا جن کے مقابلے کے لیے اور جن سے چھٹکارے کے لیے انہوں نے مل کر جدوجہد کی تھی۔ اپنی نوعیت کا مفاد پرستی اور ہوس اقتدار کا یہ ایک انتہائی عبرت ناک سبق ہے۔ آنے والی نسلوں کے لیے کہ وہ ہر لمحہ غیر مسلموں کی چالوں اور سازشوں سے بچنے کے لیے اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھیں کہ اسی میں ان کی فلاح اور مفاد مضمر ہے کیونکہ کفار سے دوستی اور وہ بھی مسلم بھائیوں کے مقابلے میں کسی طرح بھی ایک مسلمان کے وقار کے شایان شان نہیں۔

ذوالفقار علی بھٹو کا شمار ان دو تین افراد میں ہوتا ہے جنہوں نے اس مملکت خداداد کے دو ٹکڑے کرنے میں اہم کردار ادا کیا اور بعد میں بھی مزید ٹکڑے کرنے کی سازشوں کے ثبوت پائے گئے ہیں۔ انہوں نے عوامی لیگ کی اکثریت کو تسلیم نہ کیا اور صرف اقتدار کے حصول کے لیے ادھر ہم، اُدھر تم کا نعرہ لگایا اور پھر انتخابات کے بعد انتقالِ اقتدار کا یہ فارمولہ پیش کیا کہ دونوں بازوؤں میں اکثریتی پارٹیوں کو اقتدار سونپ دیا جائے۔ یعنی اس کا مطلب یہ تھا کہ ملک کے دو ٹکڑے کردیئے جائیں۔ سقوط ڈھاکہ

سے ۵ ماہ قبل روزنامہ امروز نے اپنی ۳۱ مئی کی اشاعت میں یہ خبر شائع کی:

''بنگلہ دیش' کیک اور بھٹو''

حیدرآباد (۳۰ مئی) پیپلز پارٹی کے چیئرمین جناب بھٹو نے آج ہالہ میں اپنی جماعت کے دفتر کی افتتاحی تقریب میں ایک بہت بڑا کیک کاٹا جس پر بنگلہ دیش لکھا ہوا تھا۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ سانحہ مشرقی پاکستان کے پانچ ماہ قبل ہی سے بھٹو صاحب کو آنے والے حالات کا علم تھا۔ جن کو سنوارنے کی بجائے اقتدار کے حصول کے لیے وہ آخری حدوں کو بھی پھلانگ گئے اور ایک محبّ وطن سیاستدان کی بجائے تاریخ میں ایک مفاد پرست' ضدی اور ہٹ دھرم سیاستدان کا نام لکھوانے میں کامیاب ہوئے۔ رفتہ رفتہ عوام اصل صورتحال جان گئے کہ محبّ وطن کون ہے اور غدار کون؟ اور یہ نعرہ عوام میں مقبول ہوا۔

''کس نے توڑا پاکستان

مجیب' بھٹو' ٹکا خان''

نعرے ہمیشہ حقیقت کی عکاسی کرتے ہیں اور عوام کے دل کی آواز ہوتے ہیں۔ یہ کبھی بھی جھوٹ نہیں بولتے' جب تک کہ اس کو لگوانے والے خود جھوٹے اور دھوکے باز نہ ہوں۔ لیکن جو نعرے وقت کے ساتھ ساتھ خود عوام پر حقیقت بن جائیں ان کا جھوٹے ہونے کا کون دعویٰ کرسکتا ہے۔

مسلمانوں نے پاکستان صرف مسلمان کی حیثیت سے حاصل کیا تھا تاکہ وہ اسلامی طرز زندگی کو اپنا شعار بنا سکیں۔ لیکن اقتدار کی ہوس نے انہیں بنگالی، پنجابی، سندھی، پٹھان اور بلوچی بنا دیا۔ یہی وجہ تھی کہ اقتدار کی کشمکش میں پاکستان کو قتل کر دیا گیا۔

(پاکستان کا مطلب کیا؟ ص ۹۰)

سانحۂ پاکستان کا سب سے بڑا غدار

شیخ مجیب الرحمٰن سانحۂ مشرقی پاکستان کا سب سے بڑا غدار ہے اس نے دشمن ملک کے جھانسے میں آ کر ملک دولخت کیا اور ہزاروں بے گناہوں کا قتل عام کیا اور مسلمانوں کی رسوائی کا سبب بنا اللہ اس پر لعنت ڈالے بنگلہ دیش میں اقتدار ملنے کے بعد اس نے راکھی باہنی کے ذریعہ ظلم و ستم کا بازار گرم کر دیا اور جمہوریت کا باب بند کرا دیا۔ پھر انہی فوجیوں نے جنہوں نے اس کے ایما پر ہزاروں بے گناہ پاکستانی محبّ وطن قتل کیے تھے۔ ۱۵/اگست ۱۹۷۵ء (یوم آزادی بھارت) کو اسے اس کی بیوی اور تمام گھر والوں کو گولیوں سے اڑا دیا اس کی ایک بیٹی حسینہ واجد اس لیے بچ گئی کہ وہاں موجود نہ تھی یہ تھا بیسویں صدی میں مسلمانوں کے سب سے بڑے غدار کا عبرت انگیز انجام۔

مغربی پاکستان کا سیاسی دجّال

میاں محمد افضل لکھتے ہیں:

بعض محبّ وطن دانشور سانحہ مشرقی پاکستان کا سب سے بڑا ذمہ دار شیخ مجیب کی جگہ مغربی پاکستان کے سیماب صفت لیڈر ذوالفقار علی بھٹو کو سمجھتے ہیں' دلیل یہ دی جاتی ہے کہ دسمبر ۱۹۷۰ء کے الیکشن کے بعد مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان سیاسی سمجھوتے کی ہر کوشش بھٹو نے ناکام بنائی، بھٹو نے ضد کر کے قومی اسمبلی کا اجلاس نہ ہونے دیا اور مغربی پاکستان سے اسمبلی کے اجلاس میں شریک ہونے کا ارادہ رکھنے والے ارکان کی ٹانگیں توڑنے کی دھمکی دی' یحییٰ خاں اور مجیب کے درمیان جب بھی مذاکرات کے نتیجے میں کسی آئینی تصفیے کا امکان پیدا ہوا' جنرل پیرزادہ نے (جو بھٹو کا ہم پیالہ اور ہمزاد تھا) فوراً بھٹو کو در پردہ مطلع کیا اور بھٹو ایسے ہر امکان کو تارپیڈو

کر دیتے ، بھٹو اگر اپوزیشن بنچوں پر بیٹھنے کے لیے آمادہ ہوجاتے تو بار بار اسمبلی کے اجلاس کی تاریخ ملتوی کرنے اور نتیجے میں بنگالیوں کے اندر ہیجان اور فساد کی نوبت نہ آتی ، بھٹو کی حد سے بڑھی ہوئی انانیت اور جارحانہ ہوسِ اقتدار نے شیخ مجیب کے ساتھ افہام و تفہیم کے تمام راستے مسدود کر دیئے اور ۲۵ مارچ کو خونریز فوجی کاروائی کی نوبت آگئی اور اس کاروائی کے چشم دید گواہ بھٹو نے اگلے دن ڈھاکہ سے کراچی پہنچ کر کہا '' '' اللہ کا شکر ہے' ملک بچا لیا گیا ہے''۔ ایئر مارشل (ریٹائرڈ) اصغر خان نے اپنی کتاب '' جنرلز ان پالیٹکس'' میں مشرقی پاکستان کے سلسلے میں معاملات بگاڑنے کی ساری ذمہ داری بھٹو پر ڈالی ہے۔ '' یحیٰی خان کی' معاشرتی ' مصروفیات نے ریاستی امور کے لیے اس کے پاس کوئی وقت نہ چھوڑا۔ بھٹو نے یحیٰی خان اور مجیب الرحمٰن کے درمیان کسی سمجھوتے کو روکنے کی کوشش تیز کر دیں''۔ فوجی آپریشن کے بعد بھارت سے ایک طیارہ '' گنگا'' نامی اغوا کر کے لاہور لایا گیا تھا' اس طیارے کو اغوا کنندوں نے مسافروں کی رہائی کے بعد دھماکے سے اڑا دیا تو بھارت نے اس پر اپنے علاقے پر سے مشرقی پاکستان کے لیے پاکستانی طیاروں کی پروازیں بند کر دیں ، یہ ایک سازش تھی اور پاکستان کو اس پابندی سے بہت شدید معاشی' سیاسی اور فوجی نقصان اٹھانا پڑا۔ ایئر مارشل اصغر خان کے نزدیک گنگا طیارے کی سازش میں بھٹو کا بھی کردار تھا' وہ لکھتے ہیں: '' ذوالفقار علی بھٹو لاہور ایئر فیلڈ پر پہنچے' ہائی جیکر کے کان میں کوئی سرگوشی کی اور اس کے فوراً بعد طیارے کو تباہ کر دیا گیا''۔ اس طرح جناب اصغر خان نے ڈھاکہ میں پاکستانی فوج کے ہتھیار ڈالنے کی ذمہ داری بھی بھٹو پر عائد کی ہے' ان کا کہنا ہے کہ بھٹو اقوام متحدہ میں پاکستان کا کیس لے کر گئے تھے کیونکہ پاکستان پر بھارت نے جارحیت کی تھی' ۱۰ دسمبر کو پولینڈ نے روسی حمایت سے سیکورٹی کونسل میں قرارداد پیش کی جس سے چھ دن بعد '' سرنڈر'' کی ذلت سے بچا جا سکتا تھا۔ تاہم

سلامتی کونسل پاکستان کے وزیر خارجہ بھٹو صاحب کی راہ دیکھتی رہی اور پتہ چلا کہ ان کی طبیعت ناساز ہے اور وہ ہوٹل میں آرام کر رہے ہیں' ۱۵/دسمبر ۱۹۷۱ء کو جب بھارتی فوجیں ڈھاکہ میں داخل ہو چکی تھیں تو بھٹو صاحب نے سلامتی کونسل میں قدم رنجہ فرمایا۔ بظاہر یہ تاخیر بھارت کے ایما پر کی گئی۔

اختر کاشمیری' اپنی تصنیف ''بھٹو کا دورِ حکومت'' میں لکھتے ہیں: اس شخص (بھٹو) کو نہ قانون کا پاس تھا نہ آئین کا لحاظ اور نہ ہی اخلاقی قدروں کا خیال' اس شخص کے منہ میں سات زیادہ زبانیں تھیں جس سے وہ اسلام، جمہوریت، آئین قانون، استحکام وطن، عدل وانصاف اور اخوات ومساوات کا نام لیتا تھا لیکن عملاً ہر چیز کی نفی کرتا چلا جاتا تھا' اس کے علاوہ اس کے دام تزویر میں سادہ دل بندوں کا ایک گروہ، مفاد پرستوں کا ایک جمِ غفیر' پالتو غنڈوں کا ایک ابنوہِ عظیم اور سیاسی بھیڑیوں کا ایک خونخوار لشکر بھی تھا' انہی عناصر اربعہ کو وہ اپنے عوام کہتا اور سمجھتا تھا' عصر حاضر کے اس سیاسی دجال کے اہلکاروں کی نشت و برخواست اور طرزِ زندگی سے ایمان واخلاق کا نور اسی طرح نکل گیا جس طرح بیوہ کے گھر سے حیا اور میراثی کے دل سے غیرت نکل جاتی ہے''۔

ذوالفقار علی بھٹو' سندھ کے وڈیرے اور گجرات کاٹھیاواڑ کی ریاست جوناگڑھ کے نواب کے وزیر اعظم سر شاہنواز کا بیٹا تھا' آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کی چھپی انگریزی تصنیف ''زلفی بھٹو آف پاکستان'' کے مصنف سٹینلے والپرٹ نے لکھا ہے کہ ذوالفقار بھٹو' شاہنواز بھٹو کی دوسری بیوی سے تھا جو ایک ''خوبصورت نوجوان ہندو رقاصہ تھی اور جس کے ساتھ اس کی پہلی نگاہ پڑتے ہی محبت ہوگئی تھی''۔ یہ شادی خفیہ انداز میں کوئٹہ میں خان آف قلات کے محل میں ہوئی تھی۔ زیڈ اے بھٹو کے ذاتی کردار کے متعلق بہت کچھ کہا سنا گیا ہے' بعض اوقات مبالغہ آرائی بھی کی گئی' سٹینلے

والپرٹ نے لکھا ہے کہ بھٹو زمانہ طالب علمی سے ہی عورتوں کے پیچھے بھاگا کرتے تھے۔ "زلفی نے کیلی فورنیا میں کئی عورتوں سے "ڈیٹنگ" کی اب وہ بمبئی اور لاڑکانے کی پابندیوں سے آزاد تھا' زلفی نے مارگریٹ نامی آرٹ کی طالبہ سے تعلقات رکھے، جو بعد میں پچوالا کی پہلی بیوی بنی' مارگریٹ کا کہنا تھا کہ زلفی عورتوں کے ساتھ بے صبرا تھا" سٹینلے والپرٹ نے متعدد خواتین کے نام لکھتے ہیں جن کے ساتھ "زلفی" نے امریکہ میں دورانِ طالب علمی تعلقات قائم کیے، ان میں ایک ایرانی خاتون لیلیٰ بختیار بھی تھی، وہ سماجی محفلوں میں جی بھر کر شراب نوشی کرتا تھا' عورت اور شراب سے بھٹو کی غیر معمولی دلچسپی عمر بھر برقرار رہی۔ سیاست کے میدان میں اس کے قریبی ساتھی وہی تھے جو ان مشاغل کے شوقین تھے غلام مصطفیٰ کھر، غلام مصطفیٰ جتوئی اس کی مجلسوں میں باقاعدہ آنے والوں میں سے تھے۔ سٹینلے والپرٹ نے ایک سندھی وڈیرے کی خوبصورت بیوی "ماریہ" کا ذکر کیا ہے جس پر بھٹو نے بھی نگاہ رکھی ہوئی تھی۔ سکندر مرزا' ایوب خان اور بعد میں یحییٰ خان اور جنرل پیرزادہ ضلع لاڑکانہ میں بھٹو کی جاگیر پر شکار کھیلنے آتے رہے جہاں "المرتضیٰ" میں ان کی تواضع مہنگی ترین ولایتی شرابوں سے کی جاتی تھی سکندر مرزا نے بھٹو کی "مہمان نوازی" سے متاثر ہوکر ہی تو اسے وزیر بنایا تھا' ایوب خان نے بھی اسے وزیر بنائے رکھا' یحییٰ خان کے پرنسپل سٹاف آفیسر میجر جنرل پیرزادہ (جو عملاً اس زمانے میں وزیراعظم بنے ہوئے تھے) کے ساتھ بھٹو کی گہری دوستی کی بڑی بنیاد بادہ خواری تھی، جس میں جنرل پیرزادہ کو چیمپئن کی حیثیت حاصل تھی۔ ایک خوبصورت بنگالی خاتون "حسنہ احد" کا بھٹو کی زندگی میں کافی دخل رہا ہے، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بھٹو نے اس سے خفیہ شادی کی تھی، اس خاتون کا خاوند مشرقی پاکستان کے ہنگاموں میں مارا گیا تو یہ کراچی آگئی جہاں بھٹو نے اپنے گھر ۷۰ کلفٹن کے قریب اسے ایک بنگلہ لے دیا۔

بھٹو کے عقربی کردار کی خصوصیت یہ تھی کہ اس نے ہر اُس شخص پر نیش زنی کی جس نے کسی وقت اس کے ساتھ احسان کیا تھا' منیر احمد کے ساتھ انٹرویو میں جنرل یحییٰ خان نے یہ واقعہ بیان کیا (جس کی صداقت میں کوئی شبہ نہیں): ''ایک دفعہ میں صدر سکندر مرزا کے دفتر میں بیٹھا تھا' میں نے اس کی دراز کھولی تو اس کی پرائیویٹ چھٹیاں پڑی تھیں' اس میں ایک چھٹی بھٹو کی تھی جو اس نے اپنے ہینڈ رائٹنگ میں سکندر مرزا کو لکھی تھی' اس میں بھٹو سکندر امرزا کو لکھتا ہے۔ مسٹر جناح تو مسٹر جناح تھے لیکن تم کو میں مسٹر جناح سے بھی زیادہ سمجھتا ہوں''۔ پھر اسی سکندر مرزا کے بارے میں بھٹو کی یہ رائے پیلو مودی نے اپنی کتاب ''زلفی مائی فرینڈ'' میں نقل کیا ہے: ''زلفی کی رائے تھے کہ اسکندر مرزا کو سیاست کی ابجد بھی نہیں آتی تھی' وہ (اسکندر مرزا) سمجھتا تھا کہ چھوٹی چھوٹی حرکتوں' سازشوں اور ترکیبوں سے ریاست کے جہاز کو چلایا جاسکتا ہے''۔ ایوب خان کو اپنا ''ڈیڈی'' کہا اور بعد میں اسے گالیاں دیں۔ جب ایوب خان نے اسے چلتا کیا تو اس نے یحییٰ خان سے ملاقات کی اور کہا کہ ''بابے نے اسے نکال دیا ہے'' یحییٰ خان سے اس کی دوستی' ہم مجلسی اور اکٹھے مے خواری کے افسانے مشہور ہوئے' جاتے جاتے یحییٰ خان اقتدار بھی اس کے حوالے کر گئے۔ پھر اسی یحییٰ خان کے خلاف بھٹو نے اپنے پورے عہدِ حکومت میں نقل و حرکت اور بولنے کی پابندی عائد کئے رکھی، اس کے بیٹے کو برماشیل کی ملازمت سے نکلوایا' گھر پر پولیس کا پہرہ لگوا دیا اور ساتھ ہی اپنے ذاتی روز نامہ ''مساوات'' میں اس کے خلاف بے شمار مضامین شائع کروائے۔ پیلو مودی نے دوستی نبھاتے ہوئے ایک طرف بھٹو کو سانحہ مشرقی پاکستان سے بالکل بری الذمہ قرار دیا ہے اور دوسری طرف یہ لکھا ہے کہ شیخ مجیب اور بھٹو کے خیالات میں کوئی بنیادی اختلاف موجود نہ تھا'' اس سادگی پر کون نہ مر جائے اے خدا! ہفت روزہ ''صحافت'' کے سقوط مشرقی پاکستان نمبر (دسمبر ۱۹۷۷ء) میں

ملک غلام جیلانی مرحوم کے حوالے سے یہ بات لکھی ہے کہ بھٹو نے اقتدار میں آ کر انٹیلی جنس کی اہم دستاویزات قبضہ میں لے لی تھیں جن میں اس کے امریکی سی آئی اے کے ساتھ تعلق کے ثبوت تھے۔ وزارت خارجہ کے عہدے سے ہٹائے جانے کے فوراً بعد بھٹو نے بھارتی ہائی کمشنر سے ملاقات کی تھی۔ اس سے اس کے بھارتی روابط کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔" بھٹو کا کردار ایک طرف اندرا گاندھی اور دوسری طرف ان بڑی طاقتوں کے کردار سے قطعاً مختلف نہیں جو مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا سامان کرتے رہے" (ملک غلام جیلانی) لارنس زائرنگ نے لکھا ہے کہ مشرقی پاکستان کے سانحہ کی سب کی وجہ یہ تھی کہ بھٹو کسی قیمت پر کسی بنگالی کو پاکستان کا حکمران نہیں دیکھنا چاہتا تھا اور اسی کے اصرار پر یحییٰ خان بار بار قومی اسمبلی کا اجلاس ملتوی کرتا رہا۔ لارنس زائرنگ کی یہ بچی تلی رائے ہے کہ "یحییٰ خان کے زوال کا سب سے بڑا سبب بھٹو تھا اور ایوب کے زوال کا سبب بھی بھٹو تھا"۔

اسلام کے معاملے میں جس عناد اور بد باطنی کا مظاہرہ بھٹو نے کیا (یا پھر بعد میں ان کی بیٹی بے نظیر کرتی رہی) پاکستان کی تاریخ میں اس کی اور کوئی مثال نہیں ملتی' ذاتی کردار کی تمام کمزوریوں کے باوجود یحییٰ خان نے بھی اس قسم کی کوئی حرکت نہیں کی تھی' غلام اکبر نے اپنی کتاب "جھوٹ کا پیغمبر" میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ جن دنوں بھٹو وزیر خارجہ تھے اور کشمیر کے مسئلے پر پاک و ہند مذاکرات ہو رہے تھے تو بھارتی وزیر خارجہ سردار سورن سنگھ مذاکرات کے لیے کراچی پہنچے "رمضان کا مہینہ تھا' سہ پہر کا وقت' جیسے ہی سورن سنگھ جہاز سے اترا تو بھٹو نے گرم جوشی کے ساتھ مصافحہ کیا' اس کے بعد ٹرے میں دونوں لیڈروں کو ٹھنڈا مشروب پیش کیا گیا' بھٹو نے باتیں کرتے ہوئے لا پرواہی سے اپنا گلاس اٹھا لیا' مگر سردار سورن سنگھ نے یہ کہہ کر معذرت کر دی کہ رمضان کا مہینہ ہے' ایک لمحے کے لیے بھٹو کا چہرہ اتر گیا مگر فوراً ہی سنبھلتے ہوئے وہ

مسکرایا اور بولا: خوشی کی بات ہے کہ آپ نے روزہ رکھا ہوا ہے'' تاشقند مذاکرات کے موقع پر کسی بات پر روسی وزیر اعظم نے وزیر خارجہ بھٹو کو ٹوکا تو ایوب خان اپنے وزیر خارجہ کی بے عزتی برداشت نہ کر سکے اور اجلاس سے واک آؤٹ کر گئے' روسی وزیر اعظم نے تنہائی میں ایوب خان سے ملاقات کی اور اظہارِ معذرت کے ساتھ اسے کہا کہ وہ بھٹو پر اعتماد نہ کریں، روسی وزیر اعظم نے جب ایوب خان کے سامنے بھٹو کے بطور سی آئی اے ایجنٹ ہونے کے ثبوت پیش کیے تو وہ حیران رہ گئے، ساتھ یہ بھی بتایا کہ ان کا وزیر خارجہ خفیہ طور پر بھارتی وزیر اعظم سے مل چکا ہے اور پاکستان کے ساتھ رویہ سخت رکھنے کا مشورہ دے چکا ہے۔ یہ وہ پس منظر تھا جس کے بعد ایوب خان نے بھٹو پر کبھی اعتماد نہ کیا اور بھٹو نے تاشقند کے ''خفیہ رازوں'' سے پردہ ہٹانے کی باتیں کر کے مغربی پاکستان والوں کو بے وقوف بنایا' اور یہ راز وہ کبھی قوم کو نہ بتا سکا۔ بھٹو نے کوثر نیازی جیسے مولویوں کو اپنے ''سوشلزم'' کا ہمنوا بنایا جنہوں نے اسے بیسویں صدی کا'' دیدہ ور'' قرار دیا' حالانکہ یہی مولانا اپریل ۱۹۶۸ء میں بادشاہی مسجد کے امام مولانا آزاد کے ساتھ ایک فتویٰ جاری کر چکے تھے کہ سوشلزم کا نام لینے والا بھٹو دین کا دشمن اور دائرہ اسلام سے خارج ہے۔

بھٹو ذہین شخص تھا لیکن بصیرت کا تعلق صرف دماغ سے نہیں' ضمیر کی روشنی سے بھی ہوتا ہے' بھٹو میں ضمیر کی روشنی نامی شے موجود نہ تھی البتہ بے حمیتی کوٹ کوٹ کر بھری تھی' قوم کی غیرت پر چوٹ لگانے کے لیے اس نے بھارت سے پاکستانی فوج کے ہتھیار ڈالنے کے مناظر کی فلم خاص طور پر منگوائی اور بار بار ٹیلی ویژن پر دکھائی۔ بحیثیت قوم اہل پاکستان اس قدر سنگین گناہوں کا ارتکاب کر چکے تھے کہ قدرت نے بھٹو کو پاکستان پر مسلط کر دیا تاکہ اس قوم کو اچھی طرح سزا دی جا سکے۔ بھٹو کی حکومت ایک ہولناک رات تھی جس کا آغاز ۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء سے ہوا اور جو ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو

ختم ہوئی۔'' اس طویل رات کے دوران بھٹو کے غنڈوں نے خواجہ رفیق کو قتل کیا، ڈاکٹر نذیر کو قتل کیا، احمد رضا قصوری پر گولیاں برسائیں، جو خود تو بچ گئے لیکن باپ سے ہاتھ دھو بیٹھے' اسی طویل رات کے دوران مولوی شمس الدین قتل ہوئے، مزدور قتل ہوئے، طلب علم قتل ہوئے، اصول قتل ہوئے، قوانین قتل ہوئے، انسانی رشتے قتل ہوئے۔ اس طویل رات کے دوران صرف ان وفادار کتوں کو ''باعزت'' زندگی گزارنے کا حق حاصل تھا جو بھٹو کے پاؤں چاٹنے اور دم ہلانے کا فن جانتے تھے۔ ملک کی دولت کو جی بھر کر لوٹا گیا، ضمیروں اور عصمتوں کے سودے بڑی فیاضی کے ساتھ ہوئے، خوبصورت بیویاں یا بیٹیاں بے شمار بے غیرتوں کی ترقی وخوشحالی کی ضمانت بن گئیں۔ اسی طویل رات کے اندھیروں نے قوم کے انفرادی واجتماعی کردار کو ٹوٹتے اور بکھرتے دیکھا''۔ (غلام اکبر)۔ یہ تھا پاکستان اور بعد میں ''نئے پاکستان'' کا زیڈ اے بھٹو! سانحہ شرقی پاکستان کا (شاید) سب سے بڑا ملزم۔ جس نے اس سانحہ کی وجوہات کی انکوائری کرنے والے اپنے مقرر کردہ کمیشن (حمود الرحمٰن کمیشن) کی رپورٹ ہی غائب کر دی تاکہ قوم اس معاملے میں حقائق کبھی معلوم نہ کر سکے۔ قوم کی بے حسی ملاحظہ ہو کہ کبھی اس رپورٹ کی اشاعت کا مطالبہ ہی نہ کیا۔ لیکن حقائق ہمیشہ بولتے ہیں۔ موجودہ دور میں اسلام کے اس سب سے بڑے باغی حکمران کو نہ منافقانہ انداز میں جمعہ کی چھٹی کا اعلان بچا سکا اور نہ بادل نخواستہ قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کا فیصلہ۔ اس کا انجام شیخ مجیب سے مختلف نہ تھا۔ خود کو پھانسی لگی، دونوں بیٹے غیر طبعی موت مرے۔ خاندان کی اربوں کی دولت، لوٹ مار، بنک بیلنس، ایک لاکھ پچیس ہزار ایکڑ زمین کس کام کی؟

[سقوط بغداد سے سقوط ڈھاکہ تک]

سانحہ مشرقی پاکستان میں جنرل یحییٰ شرابی کا کردار!

سمجھ نہیں آتا بات کہاں سے شروع کریں، کہنے والے کہتے تھے کہ متحدہ پاکستان کے آخری حکمران کی رگوں میں خون کی بجائے شراب تھی! شراب کے علاوہ اس کا کوئی مشغلہ تھا تو وہ عیاشی تھی، جسمانی عیاشی! کہتے ہیں کہ دن رات میخواری اور نشاط کاری میں ڈوبے رہنے کے سبب وہ دن میں فقط دو گھنٹے کام کرتا تھا۔ جب ڈھاکہ کے غروب ہونے میں چوبیس گھنٹے رہ گئے تھے تو مشرقی پاکستان سے فوجی کمان بار بار احکام حاصل کرنے کے لیے ایوانِ صدر سے رابطہ کر رہی تھی اور اِدھر سے ہر بار یہی جواب ملتا کہ صدر باتھ روم میں ہے، اس نازک موقع پر جب ملک کا آدھا حصہ کٹ رہا تھا، صدر یحییٰ کو اپنے نشے سے فرصت نہ مل سکی اور وہ مشرقی پاکستان کی سول اور فوجی قیادت کی رہنمائی نہ کر سکے، بلکہ انہیں تنہا چھوڑ دیا، اس طرح ملتِ اسلام کو عظیم حادثہ پیش آ گیا۔ اس حادثے کی براہ راست ذمہ داری صرف دو شخصیات پر عائد ہوتی ہے۔ یحییٰ خان پر اور جنرل نیازی پر۔ دونوں ہی شرابی اور بدکردار تھے۔ دیکھئے اتنے نازک اور سنگین مرحلے پر قوم کی کشتی کو چلانے والے ناخدا کس قماش کے لوگ تھے! پروفیسر جی ڈبلیو چوہدری نے اپنی کتاب میں سانحہ مشرقی پاکستان کے سلسلے میں اکثر یحییٰ خان کا دفاع کیا ہے (شاید اس لیے بھی کہ وہ یحییٰ خان حکومت میں آئینی مشیر (وزیر) رہے تھے) تاہم انہوں نے بھی اس رائے کا اظہار کیا ہے: ”۱۹۶۹ء میں پاکستان کو درپیش سنگین مسائل سے نبرد آزما ہونے کے لیے یحییٰ خان میں نہ بصیرت تھی نہ صلاحیت“۔ جی ڈبلیو چوہدری کے مطابق ایوب خان کے خلاف تختہ اُلٹنے کی سازش اقتدار کے حریص چند جرنیلوں نے بھٹو جیسے مایوسی کا شکار لیڈروں سے مل کر تیار کی تھی اور نتیجہ ان کی آرزو کے برعکس بنگالی قوم پرستی کی سیلابی لہر کی صورت میں نکلا

جو سب کچھ بہا کر لے گئی۔ ڈاکٹر صفدر محمود لکھتے ہیں کہ جب دل کی بیماری کے حملے کے بعد اقتدار پر ایوب خان کی گرفت کمزور پڑی تو ''یحیٰی خان نے ایوب خان کے ارد گرد سازش کا جال بن کر' ایوانِ صدر کا رابطہ باہر کی دنیا سے کاٹ دیا۔ یہ خیال کرنے کے لیے کافی ثبوت موجود ہے کہ یحیٰی خان نے ایوب خان کے خلاف بھٹو اور مجیب کی دشمنی سے فائدہ اٹھایا۔ یحیٰی نے بھاشانی کو بھی اپنی طرف کر لیا اور اس طرح اقتدار کا پر امن انتقال ناممکن ہو گیا۔ اس بات کی تصدیق ہو چکی ہے کہ گول میز کانفرنس کے دوران یحیٰی خان نے مجیب سے خفیہ ملاقاتیں کی تھیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یحیٰی خان نے ایوب خان کے خلاف احتجاج کرنے والوں کو یقین دلایا تھا کہ وہ مداخلت نہیں کرے گا اور وہ کھل کر کھیل سکتے ہیں۔ چنانچہ فوج نے ملک کی بقا کے لیے خطرہ بننے والے مظاہروں میں کوئی مداخلت نہ کی اور بالآخر حکومت یحیٰی خان کے ہاتھ میں منتقل ہو گئی''۔

یہ دیکھتے ہوئے کہ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی ریاست کی حکومت ایک بدمست اور عیاش شخص کے پاس آ چکی ہے اسلام کی دشمن اندرونی اور بیرونی قوتیں سرگرم ہو گئیں، ایسا شاندار موقع ان کے لیے دوبارہ کب آ سکتا تھا، اسلام کے خلاف دن رات کام ہونے لگا، صوبائی تعصبات جاگ اٹھے، بائیں بازو کے عناصر پی پی پی کے جھنڈے تلے منظم ہو گئے، ایسے اخبارات نکل آئے جو عموماً علمائے دین کے خلاف نازیبا کارٹون چھاپتے تھے تاکہ عوام کے ذہنوں میں علماء کا اثر کم ہو اور اس طرح بالواسطہ طور پر اسلام پر چوٹ لگائی جائے، جماعت اسلامی کے پارسا اور دیندار امیر کا کارٹون اس طرح چھاپا گیا کہ ان کا سر ایک نیم عریاں رقص کرتی ہوئی اداکارہ کے دھڑ پر لگا دیا گیا۔ ادھر یہ اسلام اور پاکستانیت کے خلاف جارحانہ انداز میں کام ہو رہا تھا ادھر فوجی جنتا کو جام و مے کی محفلوں سے فرصت نہ ملتی تھی کہ اس طرف توجہ کرتے۔

محکموں کے انچارج سیکرٹریوں کو کئی کئی دن تک صدر صاحب سے ملاقات کی اجازت نہ ملتی تھی اور بعض انتہائی حساس معاملات کی طرف کوئی توجہ نہ دی جاتی۔ جنرل فضل مقیم راوی ہیں کہ مشرقی پاکستان میں انتخابی مہم کے دوران پیدا شدہ سنگین صورت حال اور مسائل پر بحث کے لیے سیکرٹری اطلاعات نے ایک اونچے لیول کی میٹنگ کی تجویز پیش کی، اس میٹنگ کی محض تاریخ مقرر کرانے کے لیے سیکرٹری کینٹ دس دن تک روزانہ کوشش کرتے رہے اور تب آخر کار وہ صدر سے شرف ملاقات حاصل کر سکے۔ یحییٰ حکومت کی ملک چلانے میں ''سنجیدگی'' کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ فروری ۱۹۷۱ء میں کابینہ کی تحلیل کے بعد صدر یحییٰ ہر ہفتے سیکرٹریوں سے ملاقات (میٹنگ) کرنے لگے تاکہ اہم معاملات پر وہ صدر صاحب کی منظوری حاصل کر سکیں، ان اجلاسوں میں دنیا جہان کے فضول اور غیر اہم موضوعات' ثقافتی تبادلے' طلبا کے تبادلے وغیرہ پر بحث ہوتی رہتی اور ملک میں لگی آگ کے موضوع پر کوئی گفتگو نہ ہوتی۔'' اس ایک مثال سے ان اجلاسوں کی افادیت کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ ایک دفعہ یہ معاملہ زیر غور آیا کہ سول اعزاز پانے والوں کو جو اسٹار ملتے ہیں ان کے کناروں کی دھاریں تیز ہوتی ہیں حالانکہ انہیں کند ہونا چاہیے' ایک سیکرٹری نے اس تجویز کی حمایت میں دلیل دیتے ہوئے کہا کہ غیر ممالک میں جب یہ اعزاز پانے والے معززین ضیافتوں میں رقص کرتے ہیں ان کی ہم رقص خواتین کو ناچنے میں بڑی زحمت ہوتی ہے اور بعض اوقات تو اِن اسٹار کی رگڑ سے ان کی چھاتیاں زخمی بھی ہو جاتی ہیں''۔ خود ناؤ نوش کی محفلوں میں غرق رہنے کی وجہ سے یحییٰ خان نے سول معاملات تمام تر اپنے پرسنل سٹاف آفیسر میجر جنرل پیر زادہ کے حوالے کر دیئے تھے (جو ہر قدم بھٹو کے مشورے سے اٹھاتے تھے) اور فوجی معاملات جنرل حمید کے سپرد تھے، پیر زادہ بہت ہوشیار تھے، جنرل حمید کمزور رائے انسان تھے۔ اور قوت فیصلہ

بالکل نہیں رکھتے تھے اکثر حساس معاملات کو وہ یہ کہہ کر ٹال دیتے کہ کل فیصلہ کروں گا۔ حالانکہ فوجی معاملات میں فوری اور صحیح فیصلے کرنے اشد ضروری ہوتے ہیں۔'' وہ (جنرل حمید) سورج غروب ہونے کے بعد فائلیں صدر کے ہاں لے جاتے تھے جہاں ساغر و مینا کے دور کے ساتھ ساتھ فائلیں بھی گردش میں آتیں اور فیصلے دیئے جاتے' کچھ فائلیں جوں کی توں پلٹ آتیں اور دوسروں پر صدر کے نقطہ نظر کے مطابق فیصلے درج ہوتے، بعض فیصلوں میں صدر کے مصاحبین محفل کے مشورے بھی شامل ہوتے۔ اس طرح ملک کے بعض حساس معاملات صدر کے ہم مشربوں، دوستوں، ہم جلیسوں اور قریبی مشیروں تک پہنچ جاتے اس نئی پریشان کن صورتِ حال سے فوج میں بددلی اور ایک گونا بیزاری کا رجحان پیدا ہوا۔ یہ سوال آج تک جواب طلب اور موجب حیرت و استعجاب ہے کہ آخر اس سنگین اور پرآشوب دور میں عملاً کس کی حکومت تھی؟ بظاہر تو یہی تاثر تھا کہ مسلح افواج کی حکمرانی تھی' درحقیقت عملاً ملک کا نظم ونسق افواج کے ہاتھ میں نہیں تھا اور یہی اس کی بدقسمتی تھی۔ سابق صدر ایوب خان کے برعکس یحییٰ خان نے اپنے گردوپیش فوج کے اعلیٰ افسروں کا ایک حلقہ قائم کر لیا جن پر نہ تو فوج کی طرف سے کوئی ذمہ داری عائد تھی نہ وہ فوج کو جوابدہ تھے۔ عام طور پر مسلح افواج کے افسران بری فوج کے چند افسروں پر مشتمل صدر کے مصاحبوں کے ٹولے کا ذکر نفرت سے کرتے تھے جن کا جی ایچ کیو سے کوئی تعلق نہ تھا۔ صدر کے مصاحبوں کا یہ ٹولہ جی ایچ کیو سے زیادہ بااختیار بن چکا تھا بلکہ یہ کہنا زیادہ موزوں ہو گا کہ وہ ''مافیا'' کا کردار ادا کر رہا تھا اور اس نے صدر تک دوسروں کی رسائی ناممکن بنا دی تھی۔ صدر سے گذارش بھی کی جاتی رہی کہ وہ اپنے حلقے سے ایسی عورتوں کو نکال دیں جو ان کے ساتھ تعلقات کی بنیاد پر بدعنوانیوں کا ارتکاب کر رہی تھی اور افواج کی نیک نامی کو متاثر کر رہی تھیں۔ صدر کو ان تمام باتوں کا علم تھا' پھر بھی وہ ان حرکات

اور بدعنوانیوں کو نظر انداز کرتے رہے۔ ان مصاحب حضرات کے بارے میں یہی تاثر تھا کہ یہ لوگ ملک وقوم کے ساتھ مخلص نہیں اور محض ذاتی مفاد اور اغراض کے لیے صدر کے گرد جمع ہیں۔ شواہد سے ظاہر ہے کہ اس وقت پاکستان کی باگ دوڑ اسی ٹولے کے پاس تھی اور بالفعل تمام فیصلے وہی کرتے تھے' بیشتر امور پر فیصلے راتوں کو ہوتے کیونکہ شب عیاشی کی وجہ سے صدر دن میں امور سلطنت پر توجہ دینے کے قابل نہ رہتے تھے۔'' (پاکستان کا المیہ۔ ا۱۹۷ء۔ جنرل فضل مقیم)۔ نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیے' صدر یحییٰ خان صدارتی محل کی چاردیواری کے اندر عیاشیوں میں کھو چکے تھے' زیادہ سے زیادہ کام پیرزادہ جیسے مضبوط اور چالاک ماتحتوں پر چھوڑ دیا گیا' اگر کوئی مخلص سیاسی رہنما صدر کو حالات میں اصلاح کے لیے کوئی مشورہ دیتا تو وہ بڑی سنجیدگی سے سنتے لیکن سنی ان سُنی کر دیتے ان حالات میں ادارے مسلسل بے توجہی کے باعث اپنی افادیت کھو بیٹھے' جوں جوں صدرِ مملکت کی کام کرنے کی طاقت گھٹتی گئی' پیرزادہ کے اختیارات بڑھتے گئے اور اس طرح اقتدارِ اعلیٰ عملی طور پر ان کے ہاتھ میں آ گیا'' صرف فرق اتنا تھا کہ انہیں صدر نہیں کہا جاتا تھا'' ان کی عام شہرت یہ تھی کہ وہ ایک پر اسرار شخصیت ہیں' چنانچہ لوگ ان سے ڈرتے تھے اور نفرت بھی کرتے تھے۔ جنرل پیرزادہ کے بعد یحییٰ خان کا سب سے زیادہ قرب جنرل حمید کو حاصل تھا جو'' صدر کی شب عشرت کی مجلسوں میں ہم پیالہ اور ہم جلیس ہونے میں پیش پیش رہتے تھے' صدر سے اپنے تعلقات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے جنرل حمید نے مبینہ طور پر کچھ کاروبار میں بھی قدم رکھا اور فائدہ اٹھایا اور ساتھ ہی کاروباری دوستوں کو بھی خوب نوازا۔۔۔ میجر جنرل غلام عمر چیف آف نیشنل سکیورٹی کے طور پر صدر کے مصاحبوں میں شامل تھے اور خود رائے شخصیت تھے۔ صرف چند افسر ایسے تھے جو اختلافِ رائے کی ہمت رکھتے تھے' باقی خواہ سول ہوں یا فوجی افسر صدر کی ہر بات کی تائید کرنا بہتر سمجھتے تھے۔ ایسے

لوگوں کے لیے درباری بھانڈ کا خطاب زیادہ موزوں اور برمحل ہے' صدرِ مملکت کے یہ مصاحب جن میں ان کے دربار کی عیاش عورتیں بھی شامل تھیں امورِ سلطنت اور ملک کی انتظامیہ میں بے دھڑک مداخلت کرتے رہے''۔ (فضل مقیم)۔ ان حالات میں جب پاکستان کی کشتی بھنور میں پھنسی تھی' زمین و آسمان سے اس بدقسمت قوم پر ہر قسم کی بلائیں نازل ہو رہی تھیں اور فتنوں کی یلغار ہو رہی تھی' پاکستان کو ایک ایسا حکمران مل گیا جسے ملک کے مسائل کا ہوش تو کیا ہوتا خود اپنے آپ کا ہوش نہ تھا' سچ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کو سزا دینا چاہتا ہے تو اسی قسم کے خبیث حکمران ان پر مسلط کر دیتا ہے جو خود بھی ڈوبتے ہیں اور قوم کے سفینے کو بھی لے ڈوبتے ہیں۔

جنرل یحییٰ خان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ پورے عرصہ صدارت میں مشکوک کردار کی عورتوں کے نرغے میں رہا، صحافی مُنیر احمد نے انٹرویو کرتے ہوئے یہی سوال براہِ راست پوچھا تو یحییٰ خان نے ذاتی جواز یہ پیش کیا کہ رانی نامی عورت (المعروف جنرل رانی) ان کے ہاں آتی جاتی تھی کیونکہ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے زمانے سے دونوں میں خاندانی تعلقات پیدا ہو چکے تھے۔ یحییٰ خان کے الفاظ یہ تھے: ''جب میں ڈپٹی کمانڈر انچیف بنا تو رانی وہاں میرے دفتر آجاتی تھی اور بھٹو کی باتیں کرتی تھی کہ آج بھٹو اور ہم ہوٹل انٹر کانٹینٹل گئے تھے' بھٹو نے شراب منگوائی' بل آیا تو ہوٹل والوں کو گالیاں دینے لگا' رانی کہا کرتی تھی کہ بھٹو مجھے روز ہوٹل انٹر کانٹینٹل لے جاتا۔ رانی کی بیٹی کی شادی مصطفیٰ کھر کے بھائی عربی کھر سے ہوئی تھی، جب میں کمانڈر انچیف بنا تو رانی کا میرے ساتھ رابطہ ٹوٹ گیا'' یحییٰ خان کے یہ الفاظ چغلی کھا رہے ہیں کہ اس نے سچ چھپانے کی ناکام کوشش کی ہے' ایک فاحشہ جو یحییٰ خان کو (خود اس کے اعتراف کے مطابق) ایک اہم سیاسی لیڈر کے ساتھ قابل اعتراض تعلقات اور بلاناغہ بادہ خواری کی رپورٹیں تک سنا سکتی ہے تو کیا وہ جنرل صاحب

سے ظلم کے خلاف داد طلبی کے لیے آتی تھی؟ ایک مشہور مغنیہ جس کے گائے ہوئے ترانے ۱۹۶۵ء کی جنگ میں بڑے مشہور ہوئے کے ساتھ بھی جنرل یحییٰ کے گہرے رابطے اور تعلق کی رپورٹیں عام ہوئیں، اپنے انٹرویو میں یحییٰ خان نے صرف اس قدر اعتراف کیا کہ وہ مغنیہ اس کے اکلوتے بیٹے علی یحییٰ کی شادی میں خصوصی دعوت پر گانے آئی تھی اور جب اسے رقم وانعام دینے کی کوشش کی گئی تو بقول یحییٰ خان اس نے پنجابی میں کہا: ''میں تیرے پتر دے ویاہ تے آئی آں' ویسے میں نئیں سی آناں' اک پیسہ وی لیا تے میرے اُتے حرام اے'' سوچنے کی بات ہے کہ جنرل صاحب کو آٹھ سال بعد بھی نور جہاں کا جواب نور جہاں کے اپنے الفاظ میں یاد تھا اور پھر بھی انکار کیا کہ اس کا کبھی اس مغنیہ سے پہلے یا بعد میں تعلق رہا۔ ایک طرف یہ انکار کہ کبھی دوسری قسم کا تعلق رہا نہیں' دوسری طرف اسی گانے والی نے یکم جون ۱۹۷۰ء کو صدر یحییٰ کو ایک خط لکھا اور اپنی قربت کا انوکھے انداز میں ذکر کرتے ہوئے ایک صنعتکار دوست کا کام کرنے کی سفارش کی' خط میں یہ شعر بھی لکھا تھا:

ترس رہی ہیں تیری دید کو جو مدت سے
وہ بے قرار نگاہیں سلام کہتی ہیں

اس خط کا ذکر ہفت روزہ ''صحافت'' نے اپنے ''غدار یحییٰ خان نمبر'' (۷ جنوری ۱۹۷۸ء) میں کیا تھا۔ اب آپ قیاس کر لیجیے کہ یحییٰ خان کی قولی صداقت کا معیار کیا تھا۔ اپنی کتاب ''میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا'' میں صدیق سالک راوی ہیں کہ مشرقی پاکستان میں ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کی فوجی کاروائی کا حکم دے کر یحییٰ خان اچانک روپوش ہو گیا' چند ماہ بعد اس نے مشرقی پاکستان کے دورے کا پروگرام بنایا اور کراچی پہنچا لیکن '' جب وہ کراچی پہنچا تو ایک ''کتیا'' کی زلف میں ایسا الجھا کہ کراچی سے آگے نہ جا سکا'' چنانچہ صدر صاحب تو کراچی میں اٹک

گئے اور پاکستان کی قسمت کے فیصلے بھارت اور عوامی لیگ کے مابین لٹک گئے۔"
بلیک بیوٹی" نامی ایک اور عورت یحییٰ خان کے حوالے سے بڑے چرچے ہوئے۔ یحییٰ خان سے سوال پوچھا گیا تو اس نے اس خاتون کی ذاتی خوبیوں اور کلچر کی تعریفوں کے پل باندھتے ہوئے کہا: "وہ بنگالن تھی' انتہائی قابل اور باصلاحیت عورت تھی، ڈبل ایم اے فرسٹ کلاس"۔ اسے یحییٰ خان نے ناجانے کن قومی خدمات کی بنا پر آسٹریا میں پاکستان کا سفیر مقرر کیا تھا۔ کیا ملک میں اس سے زیادہ لائق اور ذہین خواتین موجود نہ تھیں؟ آخر جنرل صاحب کو اس کی کیا چیز پسند آئی تھی۔ نومبر ۱۹۷۱ء کے آخر میں بھارتی فوج نے مشرقی پاکستان پر جھڑپیں شروع کر دی تھیں' یہ گویا باقاعدہ جنگ کا آغاز تھا: "معتبر ذریعوں نے بتایا کہ حملے کی خبر لے کر ایک بہت بڑے افسر ایوان صدر پہنچے تو انہیں دو گھنٹے انتظار کرنا پڑا کیونکہ یحییٰ خان جنرل حمید خاں کے ہمراہ بلیو فلم دیکھنے میں مصروف تھا۔ ایک راوی نے فلم کی بجائے ایک خاتون کا نام لیا' ہم نام نہیں بتانا چاہتے" (حوالہ: الطاف حسین قریشی کا مضمون مطبوعہ ہفت روزہ "صحافت" ۷ جنوری ۱۹۷۸ء)۔
ہم سقوط ڈھاکہ کے غم میں لاکھ بار روئیں' آنکھوں سے خون بہائیں لیکن بھلا کس طرح قدرت اس ملک کو بچا سکتی تھی جس کے فوجی حکمران کسی بدمست خنزیر کی طرح نفس پرستی کی لذتوں کے پیچھے بھاگتے پھرتے تھے اور قوم کی بیٹیوں کو طوائفیں سمجھے ہوئے تھے۔ انہیں ریاستی اور عسکری مسائل سے زیادہ عورتوں اور لڑکیوں سے رغبت تھی۔ ملک جنگ کی آگ میں جھلس رہا تھا اور یہ لوگ نئی نئی لڑکیوں کی تلاش میں تھے' چند طوائفیں اور بدکردار عورتیں پاکستان پر حکومت کر رہی تھیں۔ بڑے بڑے افسروں کی ترقی اور اچھی پوسٹنگ اس پر منحصر تھی کہ شراب اور عورت کون فراہم کر سکتا ہے۔ اس دور میں اسٹیٹ بنک کا ایک گیسٹ ہاؤس

بھاری لاگت سے تعمیر کرایا گیا' اس میں ایک ایسا بیڈ روم تھا جس میں چاروں طرف اور چھت پر آئینے لگے تھے' اس بیڈ روم میں بڑے بڑے جرنیل ٹھہرتے اور معکوس فطرت کی دادِ عیش کرتے۔ راولپنڈی میں یہ بات مشہور ہوئی کہ صدر یحییٰ خان ایک سرکاری افسر کے گھر دعوت میں گئے اور واپس آنے کا نام نہ لیا' مسلسل دو دن دو راتیں وہاں رہے' اس کے فوراً بعد اس افسر کو سفیر بنا دیا گیا۔ زیادہ تر وہی لوگ ''قربِ شاہ'' حاصل کر سکے جنہوں نے غیرت و عصمت کے تصور کو ایک طرف رکھ کر دلال بننا قبول کیا۔ گجرات کی رسوائے جہاں اقلیم اختر رانی کی دیکھا دیکھی کئی ''رانیاں'' ایوانِ صدر اور جی ایچ کیو کی راہداریوں میں گھومنے لگیں' اللہ جانے کتنے قیمتی قومی اور فوجی رازان بدکار عورتوں کے ذریعے عیار دشمن کی دسترس میں آئے ہوں گے۔ الطاف گوہر نے اپنے مضمون (ہفت روزہ ''صحافت'' سقوط مشرقی پاکستان) میں ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء کی طوفانی رات کا ذکر کیا ہے جب صدر ایوب خان نے قوم سے الوداعی خطاب کرتے ہوئے حکومت یحییٰ خان کے حوالے کی تھی' الطاف گوہر ایوب خان کے سیکرٹری اطلاعات تھے' انہیں جی ایچ کیو طلب کیا گیا تھا' الطاف گوہر کہتے ہیں کہ یحییٰ خان اپنی منڈلی کے ہمراہ ریڈیو پر ایوب خان کا الوداعی خطاب سن رہے تھے' جیسے ہی خطاب ختم ہوا تو ''یحییٰ خان نے کہا' کہاں ہے میری وہسکی؟ پیرزادہ نے کہا' ابھی آرہی ہے 'سر'۔۔۔ جب شراب پہنچنے میں دیر ہوئی تو یحییٰ خان نے اپنی مخصوص ہنسی اور آدھی کھانسی دار آواز میں کہا' مجھے نہیں معلوم' کوئی اور ہے یا نہیں 'مگر میں آج شراب کا مستحق ضرور ہوں''۔ سقوط ڈھاکہ کے سلسلے میں مولانا شاہ احمد نورانی نے ایک انٹرویو ہفت روزہ ''صحافت'' کو دیا تھا' جس میں انہوں نے یحییٰ خان کے ساتھ ایک ملاقات کا واقعہ اس طرح بیان کیا: ''مارچ ۱۹۷۱ء میں

ایک روز مجھے قصر صدارت ڈھاکہ میں بلایا گیا' میں ساڑھے نو بجے صبح اکیلا صدر یحییٰ خان سے ملنے گیا' یحییٰ خان کے ساتھ تین چار آدمی بیٹھے تھے بظاہر فوجی دکھائی دیتے تھے' یحییٰ گلاس تھامے بیٹھے تھے اور ان کے منہ سے بو آ رہی تھی۔ میں اسی وقت سمجھ گیا کہ مے نوشی کا شغل ہو رہا ہے''۔ یحییٰ خان کی بدکرداری کے پوست کندہ حالات بیان کرنے میں شرم وحیا مانع ہے۔ روایت ہے کہ رانی کے علاوہ اس کی چھوٹی بہن عمیم اختر اور اس کی بیٹیاں بھی یحییٰ خان پر مسلط ہو گئی تھیں' صنعتکار اور تاجر ناجائز مراعات کی سفارش کرانے کے لیے ''رانی'' کے دربار میں حاضری دیا کرتے تھے۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں جو معلومات ''رانی'' کے پاس تھیں وہ شاید بعض معتبر جرنیلوں کے پاس بھی نہ تھیں' عام عورتوں کی طرح وہ راز محفوظ نہیں رکھ سکتی تھی اس لیے اس کی کہی ہوئی باتیں مخالف سفارت خانوں تک آسانی سے پہنچتی رہیں۔ چند اور عورتیں بھی یحییٰ خان کے عشرت گدے میں ''ساقی گری'' کیا کرتی تھیں' کہتے ہیں کہ وہ بھارت کی جاسوس تھیں۔ انہی دنوں جب مشرقی پاکستان کے محاذ پر زندگی اور موت کی جنگ جاری تھی' امریکی ہفت روزہ ''نیوز ویک'' نے یہ انکشاف کیا تھا کہ پاکستان کی حکومت پر مشکوک چال چلن کی بارہ عورتیں چھائی ہوئی ہیں اور یہ عورتیں یحییٰ خان کو اپنی مٹھی میں لے چکی ہیں، یہ بھی پتہ چلا کہ ان ''معزز'' خواتین کے روابط بعض غیر ملکی سفارتکاروں سے ہیں۔ ہم یہاں ان عورتوں کے نام لکھنا مناسب نہیں سمجھتے۔ یحییٰ خان کی ایک منظور نظر عورت ہسپتال میں داخل تھی' اس نے ڈاکٹر کی عدم توجہی کی شکایت کی' یحییٰ خان خود ہسپتال گئے اور اس خاتون کی شکایت کا ازالہ اس ڈاکٹر کو تھپڑ مار کر گیا۔ خوبصورت بنگالن جسے یحییٰ خان نے آسٹریا میں سفیر مقرر کرنے کا حکم جاری کیا تھا۔ مسز شمیم کے حسین تھی' کہتے ہیں کہ اسے بھارتی محکمہ جاسوسی کے

ماہرین نے تربیت دی تھی اور وہ تمام معلومات فراہم کی تھیں جو پاکستان کے خلاف سازش کے لیے ضروری تھیں۔ یہ عورت یحییٰ خان کے مزاج پر اس قدر حاوی تھی کہ اس نے بعض اہم فیصلے قومی مفاد کے خلاف کروائے' بھارتی جارحیت کے ایام میں وہ اپنا زیادہ وقت یحییٰ خان کے پاس گزارتی تھی یوں پاکستان کا کوئی راز ایسا نہ تھا جو محفوظ ہو۔ یحییٰ خان کی عیاشی کی محفلوں میں وزیر دفاع اے آر خان' جنرل حمید خان' جنرل پیرزادہ اور جنرل عمر عام طور پر شریک ہوتے۔ بعض فلمی اداکارائیں بھی یحییٰ خان کی مجالس نشاط آراستہ کیا کرتی تھیں۔ ہمارے یہ صدر بین الاقوامی سطح پر بھی اپنے ''پلے بوائے'' کردار کی وجہ سے معروف ہو چکے تھے۔ مسلم سربراہوں کی پہلی کانفرنس رباط (مراکش) میں منعقد ہوئی تو وہاں یحییٰ خان ''دن بھر ہندوستان کے ایک سردار جی کے ساتھ بیٹھے رہے بعد میں کہنے لگے مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ ہندوستان کا نمائندہ ہے' میں سمجھا کوئی مولوی ہے ایران کے جشن میں کھانے کی میز سے لت پت اٹھائے گئے' امریکہ ایک پریس کانفرنس میں اپنے فارن سیکرٹری سے مخاطب ہوئے ''کہاں ہے میرا چمچہ''؟ ایک اخباری نمائندے نے پوچھا' جناب صدر بحر ہند میں جو بین الاقوامی صورت حال پیدا ہو رہی ہے اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ بولے ''میرا کیا خیال 'میرا کیا خیال ہے' انڈین اوشن ہے تو انڈیا سے پوچھو' ملکی معیشت کی ریڑھ مارک کر رکھ دی انتظامیہ مفلوج ہوگئی عدلیہ کو پریشان اور ذلیل کیا، رات کے اندھیرے میں صدر راہ ران کے ساتھ کیا کیا گل نہ کھلاتے' کبھی جیپ میں بیٹھ کر کسی ریڈیو آرٹسٹ کے پاس پہنچے اور اس کا دروازہ پیٹنے لگے کبھی گویے جمع کرتے' کبھی مسخرے' مصاحبین کہتے' حضور! وہ آپ نے امریکہ میں اندرا گاندھی کا جلسہ بگاڑا تھا وہ ضرور سنایئے صدر یحییٰ فرماتے 'کون سا بچو' وہ عورت والا' ہاں' میں نے تو کہہ

دیا تھا ''دیٹ وومن''۔ اس بات پر جام لنڈھائے جاتے''۔ (الطاف گوہر) ایک بار صدر یحییٰ خان نیپال کے دورے پر گئے ہوائی جہاز کٹھمنڈو اتر چکا' سیڑھی لگ گئی مگر یحییٰ خان دیر تک جہاز سے باہر نہ آئے پتہ چلا کہ جہاز کے اندر ''سب ننگا تھا'' اس لیے اسلامی جمہوریہ پاکستان کے سربراہ کے لیے باہر آنا مشکل ہو رہا تھا۔

غرض یہ تھا کہ اس خطہ ارض کے باسیوں' اسلام کے نام لیواؤں کا سربراہِ حکومت جس کی ''رہنمائی'' میں قوم اپنی تاریخ کے بدترین دور سے گزر رہی تھی۔ اس حکمران کی حکومت میں اگر ملک محفوظ و مامون رہتا تو یہ زیادہ تعجب کی بات ہوتی۔ مشیتِ الٰہی میں معجزوں کی گنجائش نہیں ہوتی، اس لیے قہرِ الٰہی کا کوڑا برسا' ملک دولخت ہوا اور خون کی ندیاں بہہ گئیں' یہ خون پدما اور گنگا کے پانیوں میں سرخ لکیر چھوڑتا ہوا خلیج بنگال کے نمکین اور سیاہ پانیوں میں گم ہو گیا۔

[سقوط بغداد سے سقوط ڈھاکہ تک]

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے اسباب

❶ ...... پاکستان کے دونوں حصوں کے درمیان ایک ہزار میل سے زیادہ جغرافیائی فاصلہ تھا اس پر مستزاد یہ کہ دونوں کے درمیان ایک دشمن ریاست آتی تھی۔ تقسیم ہندوستان کا فیصلہ ہو جانے پر مسٹر جناح نے بے سبب دونوں حصوں کے درمیان ایک کوری ڈار طلب نہیں کیا تھا اس مطالبے کی وجہ یہی تھی کہ مسٹر جناح کی دور رس نگاہ جغرافیائی فاصلے کو دیکھ رہی تھی لیکن اس وقت پر جوش بنگالی رہنماؤں نے اس قسم کی باتوں کو زیادہ اہمیت نہیں دی علاوہ ازیں انگریزوں اور ہندو رہنماؤں کے اکٹھ جوڑ کے سبب اس مطالبے کو قابل توجہ نہ سمجھا گیا۔ اور پاکستان کے دونوں حصوں میں مذہب کے سوا کوئی چیز مشترک نہیں تھی۔ علامہ مشرقی نے ایک مرتبہ لاہور کے اقبال پارک میں ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے یہ تجویز حکومت کو پیش کی کہ جغرافیائی فاصلے کے نتیجے میں پیدا ہونے والی خلیج کو ختم کرنے کے لیے ملک کے دونوں حصوں سے دس، دس لاکھ آدمی ایک سے دوسرے حصے میں آباد کر دیئے جائیں تاکہ تہذیبی اور ثقافتی یک رنگی پیدا ہو جائے تاہم اس انوکھی تجویز پر کسی نے توجہ نہ دی۔

ایوب خان دور میں کسی نے ایک اور تجویز دی تھی کہ بین الصوبائی شادیوں کا رواج دیا جائے اس تجویز پر عمل کرتے ہوئے چند مغربی پاکستانی افسروں نے مشرقی پاکستان میں شادیاں کی بھی لیکن پھر یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔

❷ ......دونوں صوبوں کی زبان ایک نہ تھی اس سے بھی علیحدگی کو تقویت ملی اگر مشرقی پاکستان میں بنگلا زبان وثقافت کے معاملے پر دوٹوک پالیسی اختیار کی جاتی اور وہاں شروع سے اردو زبان اور عربی رسم الخط کو کسی کی پرواہ کیے بغیر رائج اور نافذ

کیا جاتا تو آگے چل کر وہاں علیحدگی کی تحریکیں (چھ نکات اور گیارہ نکات وغیرہ) جنم نہ لیتیں۔ مشرقی پاکستان کا ہندو بنگالی بولتا تھا۔ اس کے مقابلے میں مغربی پاکستانی مسلمان وہاں اجنبی ٹھہرا کیونکہ زبان اور ثقافت کا فرق تھا اس فرق کو اسلام کے رشتے کے ذریعے دور کیا جا سکتا تھا اس سلسلے میں کوششیں ہوئیں مخلصانہ کوششیں ہوئیں مولوی فرید جیسے محبِّ وطن سیاست دانوں نے دردمندانہ کوششیں کیں بعض علمانے نے بھی کردار ادا کیا تاہم ہندوؤں کی گہری سازشوں اور حکمرانوں کے حوصلہ شکن رویّے نے یہ تمام کوششیں ناکام بنادیں۔ حکمران ہندو کلچر کو بنگالی اور علاقائی کلچر سمجھ کر اس کی سرپرستی کرتے رہے اس ناعاقبت اندیشانہ سرکار پالیسی کا مقامی ہندوؤں نے بروقت فائدہ اٹھایا اور وہ مغربی پاکستانیوں اور مشرقی پاکستانیوں کے مابین دوری پیدا کرنے میں کامیاب رہے۔

3 ...... غلط فہمیوں' دوریوں اور بالآخر علیحدگی میں ایک اہم کردار' بلکہ بنیادی کردار (بظاہر) معاشی اور اقتصادی عدم مساوات بھی تھی۔ اگر ہم سقوط ڈھاکہ کے موضوع پر بنگالی دانشوروں اور غیر ملکی مصنفین کی کتابیں دیکھیں تو علیحدگی کا سب سے بڑا سبب ہی ان کے نزدیک مشرقی پاکستان کی معاشی محرومیاں تھیں جن کی ذمہ داری مغربی پاکستان پر عائد ہوتی تھی ایک حد تک یہ بات درست ہے لیکن تنہا مغربی پاکستان ہی اس پسماندگی کا ذمہ دار نہ تھا' تاریخی اور جغرافیائی اعتبار سے بھارت زیادہ ذمہ دار تھا لیکن بڑی ہوشیاری سے پراپیگنڈا میں اس پہلو کو ''گول'' کر دیا گیا اور تمام ملبہ مغربی پاکستان' خصوصاً پنجاب پر ڈال دیا گیا۔ پراپیگنڈا اور مبالغہ ایک طرف' یہ حقیقت اپنی جگہ درست ہے کہ مشرقی پاکستان کی معاشی حالت اور مغربی پاکستان کی اقتصادی حالت میں شروع سے بہت فرق تھا اور اس عدم مساوات کو دور کرنے کے لیے کھلے دل سے کبھی کوشش نہ کی گئی' جبکہ اہل

مشرقی پاکستان نے آزادی کے حوالے سے یہ توقعات پیدا کر لی تھیں کہ ان کی معاشی محرومیاں فوری طور پر ختم ہو جائیں گی' فوری طور پر نتائج کا برآمد ہونا ممکن نہ تھا۔ مشرقی پاکستان کی اسّی فیصد قومی دولت آزادی کے وقت ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی' اکثر شہری علاقوں میں جائیداد اور عمارات کا پچاسی فیصد غیر مسلموں کی ملکیت تھا۔ مشرقی پاکستان کے تیرہ سو نجی ہائی اسکولوں اور سینتالیس نجی کالجوں میں سے پچانوے فیصد ہندوؤں کی ملکیت تھے جن کے کمروں میں مسٹر جناح کی جگہ گاندھی اور نہرو کی بڑی بڑی تصاویر آویزاں ہوتیں۔ آزادی کے بعد عرصہ تک زرمبادلہ کمانے کا سب سے بڑا ذریعہ سنہری ریشہ یعنی پٹ سن تھی، اس کا حصہ اوسطاً ساٹھ سے ستر فی صد تھا' اس کے برعکس ہوتا یہ رہا کہ اس زرمبادلہ کا بڑا حصہ مغربی پاکستان کے حوالے کر دیا جاتا۔ اس پالیسی کا نتیجہ یہ تھا کہ صنعتی سرمایہ کاری، مشرقی پاکستان میں بہت کم اور مغربی پاکستان خصوصاً کراچی میں بہت زیادہ ہوئی، ''۱۹۴۷ء میں آزادی کے وقت سے ہی پاکستانی صنعتوں کے لیے سرمایہ کا جھکاؤ بیشتر مغربی پاکستان اور خاص طور پر کراچی کی طرف رہا۔ ۱۹۵۸ء تک پورے مشرقی پاکستان میں ۱۴۸ کروڑ روپے کا صنعتی سرمایہ لگا ہوا تھا جبکہ اکیلے کراچی میں یہ ۱۱۴ کروڑ سے زائد تھا اور کراچی کو شامل کر کے مغربی پاکستان میں تین سو آٹھ کروڑ روپے سے زیادہ تھا جو کہ مشرقی پاکستان کے مقابلے میں دگنا سے بھی آگے تھا' ہر گزرنے والے سال کے ساتھ مغربی پاکستان زیادہ صنعتی اور خوشحال ہوتا گیا جبکہ مشرقی پاکستان کی صورت حال میں کوئی خاص بہتری پیدا نہ ہوئی (ایمرجنس آف بنگلہ دیش۔ عبدالودود بھویان) یہ حقیقت ہے کہ مشرقی پاکستان میں صنعتی سرمایہ کاری' مغربی پاکستان کے مقابلے میں صرف ایک چوتھائی تھی۔ قومی بجٹ کا چھپن فی صد دفاع پر خرچ کیا جا رہا تھا جس کے لیے ٹیکس

مشرقی پاکستان سے بھی وصول کئے جاتے تھے لیکن اس بجٹ کا دس فیصدی شاید مشرقی پاکستان میں استعمال نہیں ہوتا تھا' وجہ یہ تھی کہ زیادہ تر چھاؤنیاں' فوجی تنصیبات' فوجی مراکز' فوجی افسر اور جوان مغربی پاکستان سے تعلق رکھتے تھے' انگریزوں کا خیال تھا کہ بنگالی نسلاً اچھے فوجی نہیں بن سکتے' انہیں ''مارشل ریس'' نہیں سمجھا جاتا تھا' یہ غلط پالیسی حکومت پاکستان نے بھی جاری رکھی' اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ۱۹۷۰ء تک صرف ایک بنگالی میجر جنرل کے عہدے تک پہنچ سکا تھا۔ بھویان کے مطابق ۱۹۶۹ء تک پاکستانی فوج میں مشرقی پاکستان کا حصہ آٹھ فیصد سے نہیں بڑھا تھا۔ تاہم فضائیہ میں یہ حصہ ایک تہائی تک جا پہنچا۔ فضائیہ میں ایم ایم عالم جیسے قومی ہیروؤں نے اپنی جنگی قابلیت کی ۱۹۶۵ء کی جنگ میں دھاک بٹھا دی اور یہ بات غلط ثابت ہوگئی کہ بنگالی اچھے فوجی نہیں بن سکتے پھر بھی صورت حال کی اصلاح کے لیے موثر قدم نہ اٹھائے گئے۔ تمام بڑے بڑے دریائی ڈیم مغربی پاکستان میں تعمیر ہوتے رہے اور مشرقی پاکستان سیلابوں میں ڈوبتا رہا جبکہ یہ ڈیم جس زرمبادلہ سے تعمیر ہوئے اس کا بیشتر مشرقی پاکستان نے کما کر دیا تھا۔ سب سے بڑی زیادتی اور ناانصافی مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان تجارت کے ضمن میں ہوتی رہی۔ بین الصوبائی تجارت میں توازن ہمیشہ مغربی پاکستان کے حق میں رہا' مغربی پاکستان کی مشرقی پاکستان کو برآمدات کی مالیت بعض اوقات دوگنا سے بھی زیادہ ہوتی' اس طرح وسائل مشرقی پاکستان سے مغربی پاکستان منتقل ہوتے رہے۔ بھویان کے تخمینے کے مطابق بنگلہ دیش کے قیام تک تین ارب برطانوی پاؤنڈ کی مالیت کے برابر مشرقی پاکستان کے وسائل مغربی پاکستان کو منتقل ہوئے۔ ڈاکٹر صفدر محمود ماہر معاشیات ڈاکٹر محبوب الحق مرحوم کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ پانچ سالہ منصوبوں سے پہلے سالانہ ۲۱ کروڑ

اور بعد میں کم از کم دس کروڑ روپے سالانہ کے حساب سے وسائل مشرقی پاکستان سے مغربی پاکستان منتقل ہوتے رہے۔ اس طرح تلخیاں پیدا ہونی لازم تھیں۔ اگر دو سگے بھائی بھی ہوں تو ایک کو دوسرے کے حصے پر قبضے کی اجازت نہیں مل سکتی۔ مشرقی پاکستان سے سرمایہ بھارت میں بھی ہندوؤں کے ذریعے منتقل ہوا لیکن یہ کاروائی خفیہ ہوتی تھی، شاید اس لیے بنگالی دانشوروں کی نگاہ اس طرف نہیں گئی۔ جنرل فضل مقیم کا بیان ہے: ''مشرقی پاکستان سے کثیر دولت بھارت بھیجی جاتی رہی لیکن اسے روکنے کا کوئی بندوبست نہ کیا گیا۔ یہ بات اس وقت منظر عام پر آئی جب ۱۹۵۲ء میں سمگلنگ روکنے کے لیے فوج کی خدمات حاصل کی گئیں اور اس نے ''آپریشن جوٹ'' نام کی کاروائی کی۔ ۱۹۵۶ء میں ''آپریشن سروس فرسٹ'' اور ۱۹۵۷ء میں ''آپریشن کلوز ڈور'' نام کی کاروائیاں ہوئیں۔۔۔ آخری کاروائی میں جو صرف دو ہفتے جاری رہی دس کروڑ روپے کا سونا چاندی پکڑا گیا لیکن یہ امدادی کاروائیاں عارضی تھیں مشرقی پاکستان کی دولت پھر بھی بھارت منتقل ہوتی رہی ماہرین کا اندازہ ہے کہ سالانہ ۷۵ سے ۸۰ کروڑ کا زرمبادلہ ہندو سرمایہ کار بھارت لے جاتا رہا۔ مشرقی اور مغربی بنگال کے درمیان آمدورفت پر کوئی خاص پابندی نہ تھی، ہندو اقلیت بلا روک ٹوک اپنی دولت مغربی بنگالی میں منتقل کرتی رہتی تھی'' (پاکستان کا المیہ۔ ۱۹۷۱ء) بہرحال سرمایہ خواہ مغربی پاکستان منتقل ہوا یا بھارت، مشرقی پاکستان کی پسماندگی اور غربت میں آبادی کے بوجھ سے مزید اضافہ ہوا، لوگ روزگار مانگتے تھے لیکن صنعتیں ہوتیں تو روزگار ملتا۔'' امریکی امداد سے افراطِ زر پیدا ہوا اور اقتصادی حالت کو مزید پیچیدہ بنا دیا۔ افلاس، بے روزگاری اور بیماری نے مشرقی پاکستان میں ابھرتے ہوئے نئے مقامی دانشوروں کے ان خیالات کے لیے سازگار زمین فراہم کی کہ: مشرقی پاکستان کی جدوجہد

دراصل نوآبادیت کے درجے سے گریز کی جدوجہد ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد ہم نے سیاسی آزادی بے شک حاصل کی ہے لیکن اقتصادی آزادی ہنوز حاصل کرنی ہے''۔ (حوالہ: پاکستان ڈیوائڈڈ) یہ وہ معاشی محرومیاں تھیں، شکایات تھیں جن کی طرف مغربی پاکستان میں بیٹھے قومی رہنماؤں نے توجہ نہ دی لیکن شیخ مجیب اور بھاشانی جیسے انتہا پسند بنگالی سیاستدانوں نے ان کی آڑ میں علیحدگی کے منصوبے تیار کر لیے اور مغربی پاکستان کو تمام خرابیوں کا ذمہ دار ٹھہراتے ہوئے اس کے خلاف خوب پراپیگنڈا کیا۔ ''اس (مجیب) نے مشرقی پاکستان کے مزدور طبقہ اور ملازمین کو سبز باغ دکھانے کے علاوہ بنگالی عوام کی بدحالی کا رونا روتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ مغربی پاکستان والے مشرقی بنگال کا استحصال کر رہے ہیں اور مغربی پاکستان کی خوشحالی تمام تر مشرقی پاکستان کی آمدنی کو ہتھیا لینے کا نتیجہ ہے''۔ (دس پھول ایک کانٹا۔ خواجہ افتخار)

4 ...... مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے عوامل میں سے ایک یہ بھی ہے کہ پاکستان کی خالق جماعت مسلم لیگ جو ملک کے دونوں حصوں کے اتحاد کے لئے پُل کی حیثیت رکھتی تھی کئی ڈھروں میں منقسم ہوگئی' اور خاص طور پر مشرقی پاکستان میں اس کی مقبولیت ہی ختم ہوگئی اور علاقائی جماعتوں نے اس کی جگہ لے لی۔ اس جماعت کی ملک گیر حیثیت کی بحالی کے لئے کچھ نہ کیا گیا' حالانکہ کانگریس آج بھی بھارت کے تمام صوبوں کی جانی پہچانی جماعت ہے اور بھارت کے ٹکڑوں میں نہ بٹنے کی بڑی وجہ وہاں کانگرس پارٹی کا وجود اور مقبولیت بھی ہے۔ اب مسلم لیگ ایوانِ اقتدار کی راہداری میں پڑی ایسی فٹ بال تھی جسے جوڑ توڑ کا سیاسی کھیل کھیلنے کے لئے ٹھوکریں لگائی جا رہی تھیں۔ غلام محمد کی موت ۔۔ بعد نئے گورنر جنرل سکندر مرزا نے سرے سے اس جماعت کو دفن کرنے کا فیصلہ کر لیا اور

راتوں رات نئی جماعت ''ری پبلکن'' بنا ڈالی اور تمام ابن الوقت عناصر اس میں شامل ہو گئے نہ صرف یہ بلکہ مغربی پاکستان کی حکومت ایک ایسے شخص کے حوالے کر دی جس کا خاندان پاکستان دشمنی اور ہندو پرستی میں مشہور تھا' یعنی سرحدی گاندھی اور سرخ پوش رہنما غفار خان کا بھائی ڈاکٹر خان۔

5 ...... غلط فہمیوں' شکایتوں اور تلخ حکایتوں کی ایک وجہ حکمرانوں اور سیاسی لوگوں کا رویہ اور طرزِ عمل بھی تھا جو مشرقی پاکستان کے عوام سے روا رکھا گیا' کافی طویل داستان ہے' مختصر سا ذکر کریں گے۔ جگتو فرنٹ کی حکومت کے خاتمے کے بعد سکندر مرزا مشرقی پاکستان کے گورنر بنے' الطاف گوہر راوی ہیں (جو اُن دنوں وہاں ہوم منسٹری میں تھے) کہ حلف اٹھاتے ہی سکندر مرزا نے حکم دیا کہ ٹیلی فون پر ہر ضلع کے ڈی سی اور ایس پی سے کہہ دیا جائے کہ صبح ہونے تک ہر ضلع میں سے کم از کم ایک سو بیس آدمی شر پسندی کے جرم میں گرفتار کر لئے جائیں۔ اس طرح ہزاروں بے گناہ افراد تعداد پوری کرنے کے لئے جیل میں ڈال دیئے گئے اور مغربی پاکستان کے خلاف نفرتوں میں اضافہ ہوا ''کسی بنگالی کو شبہ نہ رہا کہ مغربی پاکستان والے اُن پر زورِ بازو سے حکومت کرنے کا تہیہ کئے ہوئے ہیں'' (الطاف گوہر۔ ہفت روزہ ''صحافت'')۔ ۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۹۷۱ء تک حکومت پاکستان کی عنان زیادہ تر ایسے افراد کے ہاتھوں میں رہی جو مغربی پاکستانی تھے اور بنگالی مسلمانوں کی امنگوں اور مسائل سے بالکل واقف نہ تھے' مشرقی پاکستان سے مرکز میں جو وزیر لئے جاتے تھے وہ حکمرانوں کی ہاں میں ہاں ملانے کے سوا کچھ نہ کرتے تھے اور بنگالی عوام کے ساتھ ان کا رابطہ کمزور ہوتا تھا بنگالی سیاستدانوں اور عوام کی یہ فراخدلی تھی کہ انہوں نے آئینی مسئلے کے مستقل حل کے لیے مت

کے دونوں بازوؤں کے درمیان ''پیرٹی'' (برابری) کا اصول تسلیم کیا تھا حالانکہ آبادی کے لحاظ سے مشرقی پاکستان کے ووٹ زیادہ تھے بدقسمتی سے جنرل یحییٰ خان نے ون یونٹ کے ساتھ ''پیرٹی'' کا بھی خاتمہ کر دیا' اس کے بعد مشرقی پاکستان کی علیحدگی کو دیر نہیں لگی۔ ایک طرف مشرقی پاکستان رہنماؤں کی یہ فراخدلی تھی کہ انہوں نے ''پیرٹی'' کا فیصلہ تسلیم کیا' ڈھاکہ کو وفاقی دارالحکومت بنانے پر اصرار نہیں کیا (حالانکہ زیادہ بڑا صوبہ ہونے کی بنیاد پر یہ مطالبہ جائز ہوتا) مرکزی اقتدار میں اپنی مسلسل غیر حاضری پر خاص احتجاج نہیں کیا' اور دوسری طرف ہمارے مغربی پاکستان حکمران تھے کہ متواتر بنگالی سیاستدانوں کو ایک دوسرے لڑاتے رہے۔ بقول ایئر مارشل (ریٹائر) اصغر خان: ''حسین شہید سہروردی، مولانا بھاشانی اور اے۔ کے فضل الحق کو آپس میں ایک دوسرے کے خلاف لڑایا گیا۔ وفاق میں خواجہ ناظم الدین، محمد علی بوگرا اور سہروردی کی حکومتوں کو زبردستی برطرف کیا گیا' جبکہ ڈھاکہ میں حکومت کے ساتھ اس سے بھی زیادہ برا سلوک روا رکھا گیا۔ اس طرح بنگالیوں نے خود کو ایسی صورت حال میں پایا جس نے ان کو جڑوں تک ہلا دیا' ایک اکثریت سے جس نے آزادی کی جدوجہد میں ہراول دستے کا کردار ادا کیا تھا ایسا سلوک روا رکھا جا رہا تھا جسے کوئی اقلیت بھی برداشت نہیں کر سکتی'' (جنرلز اِن پالیٹکس)۔ چوہدری محمد علی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ بنگالیوں کے لیے ان کے دل میں کوئی نرم گوشہ نہ تھا اور ان کے ساتھ سختی کرنے کی پالیسی کے حامی تھے' (شاید ان کی اس رائے کی وجہ شیخ مجیب الرحمٰن جیسے ملک دشمن اور مکار بنگالی سیاسی لیڈروں کا رویہ ہو' فضل الحق اور بھاشانی کا طرز عمل بھی کسی با اصول اور محب وطن سیاستدان جیسا نہ تھا اور فضل الحق نے تو کلکتہ جا

کر پاکستان کے خلاف ہرزہ سرائی بھی کی تھی)۔ غلام محمد بنگالیوں کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے تھے، سکندر امرزا انہیں فسادی اور شرپسند سمجھتے تھے۔ اور ان کا بویا ہوا پاکستان نے ۱۹۷۱ء میں کاٹا۔ ایوب خان' مشرقی پاکستان کے مسائل گزشتہ حکمرانوں کی نسبت بہتر طور پر سمجھتے تھے لیکن انہوں نے جن بنگالی سیاستدانوں (منعم خان، فضل القادر، صبور خان وغیرہ) کو مشرقی پاکستان کا ترجمان سمجھا ہوا تھا وہ عوامی لیڈر نہ تھے اور بنگالی باشندے ان پر اعتماد نہ کرتے تھے۔ ایوب خان نے ڈھاکہ کو پاکستان کا دوسرا صدر مقام بنایا لیکن وہ بہت کم وہاں جاتے تھے، بنگالیوں کی حب الوطنی پر بھی انہیں شبہات تھے' ان کے پورے دور میں قومی سطح کے محبّ وطن بنگالی لیڈروں (خواجہ ناظم الدین' سہروردی' مولوی تمیز الدین وغیرہ) کو دباؤ اور تناؤ میں رکھا گیا اور شعوری کوشش کی گئی کہ مغربی پاکستانیوں سے ان کا رابطہ (بذریعہ جلسہ' جلوس' کانفرنس) استوار نہ ہو۔ اگرتلا سازش کیس درست تھا لیکن اسے غلط طریقے سے چلایا گیا اور بنگالی غداروں کو بھی ہیرو سمجھنے لگے اور بھارت کو پاکستان دشمن پراپیگنڈا کا ایک اور موقع ملا۔ جنرل یحییٰ خان کے کردار کا ذکر آگے چل کر ہوگا، بحیثیت مجموعی یحییٰ خان بنگالی لیڈروں کو بے وقوف بنانے میں لگے رہے اور بنگالی لیڈروں نے یحییٰ خان کو بے وقوف بنا ڈالا۔ ذوالفقار علی بھٹو کے بارے میں صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ آج بھی بنگلہ دیش میں جس مغربی پاکستانی سیاستدان سے سب سے زیادہ نفرت کی جاتی ہے۔ وہ بھٹو ہے۔ کسی علاقے یا قوم کے مزوج اور عادات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ وہاں کی زبان سمجھی اور بولی جائے۔ لیاقت علی سے لے کر یحییٰ خان تک کوئی مغربی پاکستانی حکمران بنگلہ زبان سے واقف نہ تھا۔ مغربی پاکستان سے وزیر وزراء

کبھی کبھار مشرقی پاکستان کے دورے پر جاتے تو وہاں کے عوام اور دانشوروں سے ملنے کی بجائے سندر بن یا چاٹگام کے ساحلی علاقوں اور دیگر مقامات کی سیر وتفریح پر نکل جاتے یا پھر ڈھاکہ میں مہنگی سے مہنگی ساڑھیوں کی خریداری میں مصروف رہتے' زیادہ سے زیادہ چند پرانے گھرانوں میں (جہاں اردو سمجھی جاتی) دعوتیں کھاتے اور مغربی پاکستان واپس جا کر یوں محسوس کرتے جیسے کسی غیر ملک کے سفر کے بعد واطن واپس آئے ہوں۔ الطاف گوہر نے یہ روایت بیان کی ہے کہ ایوبی دور میں نواب کالاباغ مغربی پاکستان کے گورنر تھے" وہ مشرقی پاکستان بہت کم جاتے۔ ایک دفعہ گورنر کانفرنس کے لیے ڈھاکہ گئے، مجھے رات کے کھانے پر بلایا اور اس بات کی وضاحت کردی کہ میں اپنا باورچی، سبزی، گوشت، مصالحے اور پانی ساتھ لایا ہوں، آپ نے دیکھا ہوگا کہ کہ کوئی امریکن یا انگریز ہم لوگوں کے ہاں دودھ یا پانی نہیں پیتا، مشرقی پاکستان کے معاملے میں ہم بھی یہی احتیاط برتتے تھے" جہاں مغربی پاکستان کی سیاسی قیادت' مشرقی پاکستان کے عوامی کھانوں تک کو چکھنا ناگوار سمجھتی ہو، وہاں عام لوگوں کے ساتھ گھلنے، ملنے کا کیا سوال پیدا ہوتا، لیکن جب کبھی کسی حکمران نے مشرقی پاکستان کے عوام کے ساتھ شفقت کا برتاؤ کیا وہاں کے لوگوں نے اسے سرآنکھوں پر بٹھایا، جنرل اعظم کی مثال سب کے سامنے ہے۔ کاش کہ ۱۹۶۴ء کے صدارتی انتخابات میں جنرل اعظم صدارتی امیدوار ہوتے اور وہ جیت بھی جاتے تو برصغیر کا نقشہ وہ نہ ہوتا جو آج ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر دیگر عوامل کے ساتھ، مغربی پاکستانی حکمران بنگالیوں کے دل جیتنے کی کوشش کرتے، اسلام کے رشتے کو مضبوط کرتے تو ایک ہزار میل کی دوری کے باوجود اہل بنگال ہمارے ساتھ رہتے اور بعض آئینی اور سیاسی ناانصافیوں

کے باوجود علیحدگی کے انتہائی اقدام کی جانب نہ جاتے ، نہ ہی انڈیا انہیں ورغلانے میں کامیاب ہوسکتا۔ بنگالیوں نے زبان وثقافت وغیرہ کے مسئلے پر تنگ دلی کا مظاہرہ کیا لیکن ہماری سوچ بھی ان کے بارے میں ٹھیک نہ تھی۔ جب کبھی انہوں نے اپنے سیاسی اور معاشی حقوق کے لیے ذرا بلند لہجے میں بات کی ہم نے ان پر غداری اور ملک دشمنی کا الزام لگادیا۔

[سقوط بغداد سے سقوط ڈھاکہ تک]

سانحہ مشرقی پاکستان اور ہماری فوج

جناب سکندر خان بلوچ لکھتے ہیں:

مارچ ۱۹۷۱ء میں ہمارے جو فوجی آفیسرز مشرقی پاکستان میں تھے اور ان پر آشوب دور سے گزرے ان سب کی متفقہ رائے میں اس وقت کی فوجی حکومت کا بروقت کاروائی نہ کرنا ہی ہماری ناکامی کا سبب بنا۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت مکمل طور پر مفلوج ہو چکی تھی۔ تمام سرکاری اہلکار بشمول ملٹری ہائی کمان یا تو فیصلہ کرتے کی اہلیت کھو چکے تھے یا حالات کے خوف سے فیصلہ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حالات پر عوامی لیگ کی گرفت مضبوط ہوگئی اور جو لوگ مکتی باہنی کے مخالف تھے۔ فوج اور پاکستان کے وفادار تھے۔ یہ لوگ پاکستانی فوج کے بازو بن سکتے تھے۔ وہ بھی حالات سے مایوس ہو کر اور اپنے خاندانوں کی جانیں بچانے کے لیے عوامی لیگ کیمپ میں چلے گئے اور پھر عوامی لیگ کی تحریک ایک ایسے طوفان کی شکل اختیار کر گئی جس کے سامنے بند باندھنا پاکستانی فوج اور حکومت کے بس میں ہی نہ تھا۔

جب کوئی کاروائی کی گئی تو وہ بھی اتنی بے دلی اور بودے پن سے کی گئی کہ ہماری اپنی فوج مکمل طور پر بد دل اور مایوس ہوگئی۔ تعداد میں کم ہونے کے باوجود وہ بہت کچھ کرنے کی اہل تھی لیکن اس وقت کی بے جان قوت فیصلہ سے محروم حکومت نے ان لوگوں کے ہاتھ باندھ کر دشمنوں کے آگے پھینک دیا اور پھر دشمنوں نے جو کچھ بہاریوں یا مغربی پاکستانیوں کے خلاف چنگیز خان اور ہلاکو خان کے مظالم بھی ان کے سامنے کچھ نہ تھے۔

قومی مسائل اور قومی بحران ہمیشہ سیاسی تدبر اور باہمی افہام و تفہیم سے حل کیے جاتے ہیں۔ فوجی کاروائی کسی بھی حکومت کے پاس حکومتی رٹ برقرار رکھنے کا آخری

حربہ ہوتا ہے اور اس حربے کو اول تو استعمال کرنا نہیں چاہیے اور اگر اس کا استعمال ناگزیر ہو جائے تو اسے مکمل طاقت سے استعمال کیا جائے پھر کسی قسم کے سیاسی خدشات یا سیاسی تذبذب خاطر میں نہیں لانا چاہیے۔ ورنہ نتیجہ ہمیشہ تباہی پر منتج ہوتا ہے جیسے ایک دفعہ چیئر مین ماؤزے تنگ نے کہا تھا کہ "انڈے توڑے بغیر آملیٹ نہیں بنایا جا سکتا۔" ایسے حالات میں کچھ نہ کچھ انڈوں کو توڑنا ضروری ہو جاتا ہے۔

یہ ہماری اور خصوصاً پاکستانی فوج کی بدقسمتی تھی کہ اس وقت کی حکومت نے انڈے توڑے بغیر آملیٹ بنانے کی کوشش کی اور نتیجتاً پاکستان ٹوٹ گیا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ مجرموں کو سر عام کوڑے پڑتے۔ پھانسیاں ہوتیں تا کہ عوام کے دل کو کچھ تسکین ہوتی مگر بدقسمتی سے ایسا کچھ نہ ہوا بلکہ پاکستان کے وفادار لوگوں کے گھر لٹ گئے۔ انہیں پھانسیاں دی گئیں ان کی خواتین کا ریپ کیا گیا اور انہیں دردناک طریقے سے قتل کیا گیا۔ حکومت کا فرض تھا کہ باغی اور غدار لوگوں کو سرِ عام عبرتناک سزا دیتی اور وہاں پاکستان کے وفادار لوگوں کو سر عام سزائیں دیں۔ حکومت محض خاموش تماشائی بنی رہی۔ ان حالات میں پاکستان کی سالمیت بچانا کیسے ممکن تھا؟ صرف فوج کیا سکتی تھی؟

ایڈمرل مظفر احسن گورنر مشرقی پاکستان پر شروع سے ہی مسئلے کا سیاسی حل چاہتے تھے مگر بدقسمتی سے اس کی کسی نے نہ سنی یا کچھ طاقتور بے ضمیر اور ذاتی مفاد پرست عناصر نے اس کی رائے قابل احترام نہ سمجھی۔ لہٰذا شرافت سے استعفیٰ دے کر گھر آ گئے۔ ان کی جگہ لیفٹیننٹ جنرل صاحبزادہ یعقوب خان کو مقرر کیا گیا جو پہلے ہی وہاں مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر تھے۔ وہ سخت کاروائی کے حامی تھے۔ گو حکم کے تحت انہوں نے فوجی کاروائی کی منصوبہ بندی کی لیکن انہیں جب اپنی منصوبہ بندی پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا تو انہوں نے نجانے کیوں انکار کر دیا۔ اس پر بزدلی کا الزام لگا۔ یہاں تک کہ کچھ

ذرائع کے مطابق جنرل یحییٰ خان نے کہا تھا:

''وہ خبیث چوزے کا دل رکھنے والا جنرل ہے میں وہاں کوئی مرد بھیجنا چاہتا ہوں۔''

لہٰذا وہ بھی استعفیٰ دے کر واپس آ گئے۔ فوجی قوانین کے مطابق یہ استعفیٰ غداری کے مترادف تھا۔ لہٰذا ان کے عہدے میں تنزلی کر دی گئی اور ان کے خلاف کورٹ مارشل کا بھی سوچا گیا۔ نئے گورنر کے انتخاب میں بھی کچھ وقت لگا۔

مناسب سوچ بچار کے بعد لیفٹیننٹ جنرل ٹکا خان کو بھجا گیا۔ وہ ایک عملی اور مضبوط اعصاب کے کمانڈر سمجھے جاتے تھے لیکن شوی قسمت کہ وہ بھی وہاں جا کر فوری کاروائی نہ کر سکے اور اس دوران تقریباً ۱۸ دن گزر گئے اور حالات قابو سے باہر ہو گئے۔ حالات سے مجبور ہو کر جو لوگ پاکستان سے وفادار تھے وہ بھی عوامی لیگ کے ساتھ مل گئے کیونکہ ان کی اپنی سلامتی اسی میں تھی۔ اس کے سوا ان کے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔

عسکری تجزیہ نگاروں کی یہ رائے ہے کہ جونہی یحییٰ خان نے اسمبلی سیشن ملتوی کیا تھا اگر اس کے ساتھ ہی فوجی کاروائی شروع کر دی جاتی تو حالات اس نہج پر نہ پہنچے۔ حکومت کے پاس شیخ مجیب الرحمٰن کی سوچ اور مستقبل کی پلاننگ' عوامی لیگ کی غنڈہ گردی۔ ''را'' کا مضبوط کردار۔ بھارتی کمانڈوز کی مشرقی پاکستان میں موجودگی اور ان کاروائیوں کے متعلق انٹیلی جنس کی تفصیلی رپورٹیں موجود تھیں۔ ظاہر ہے اسمبلی سیشن ملتوی کرتے وقت حالات کا تفصیلی تجزیہ کیا گیا ہو گا۔ سیشن ملتوی کرنے کے نتائج ڈھکے چھپے نہ تھے لیکن پھر بھی آنکھیں بند رکھنا' کسی کاروائی کا حکم نہ دینا' اس وقت کے فوجی افسروں کے مطابق ناقابلِ معافی جرم تھا۔ اس دوران بہت کچھ ہو گیا۔

یہاں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ بھارت اپنی ایجنسیوں اور مشرقی پاکستان میں مقیم

ہندوؤں کے ذریعے جن کی تعداد غالباً پچاس لاکھ سے بھی زیادہ تھی مشرقی پاکستان کی علیحدگی پر کام کر رہا تھا۔

• ۱۹۷۰ء میں ''را'' نے مکمل طور پر مشرقی پاکستان میں اپنے پنجے گاڑ لئے تھے۔ پہلے عوامی لیگ کو کھلی غنڈہ گردی کے ذریعے الیکشن جتوایا اور پھر مغربی پاکستانیوں اور بہاریوں کے خلاف قتل و غارت کی مکمل منصوبہ بندی کی۔ بعد کے حالات سے یہ بھی پتہ چلا کہ بھارت نے ''اگرتلہ'' کے مقام پر اپنا ''را اور آرمی انٹیلی جنس'' ہیڈکوارٹر قائم کر لیا جہاں سے اہم بنگالی فوجی آفسرز اور ایسٹ پاکستان رائفلز کے بنگالی آفسرز اور ایسٹ پاکستان پولیس کے آفسرز سے رابطہ مضبوط کیا گیا اور وہاں سے ہر موقع کے لئے مناسب رہنمائی اور ہتھیار وغیرہ فراہم کیے گئے۔

کئی فوجی آفیسرز ''ریکی'' کے بہانے باقاعدگی سے وہاں جاتے کاروائی کے لئے نقد رقم اور ہدایات لے آتے۔ بعد میں مختلف بھارتی فوجی آفسرز کی لکھی گئی کتابوں سے یہ بھی پتہ چلا کہ بھارت نے ان دنوں ایک مکمل کمانڈو بریگیڈ قتل و غارت اور شر انگیز کاروائیوں کے لئے مشرقی پاکستان میں داخل کیا تھا جس کی تعداد جنگ سے پہلے بڑھ کر تین بریگیڈ تک پہنچ گئی۔ جبکہ مارچ ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان میں پاکستان فوج کی کل تعداد محض بارا ہزار تھی جس میں مشرقی پاکستان بھی شامل تھے۔ اس کل تعداد میں لڑاکا فوج ۸ ہزار سے کسی صورت بھی زیادہ نہ تھی جبکہ مشرقی پاکستان کا کل رقبہ تقریباً ڈیڑھ لاکھ مربع کلومیٹر تھا۔

۳ مارچ ۱۹۷۱ء کو اسمبلی کا اجلاس ہوا تھا۔ یحییٰ خان نے یکم مارچ کو یہ اجلاس ملتوی کر دیا تو مشرقی پاکستان کے طول وعرض میں مظاہرے اور غیر بنگالیوں کی قتل و غارت شروع ہوگئی وہاں پر موجود ۸ ہزار فوج کو پورے ملک میں پھیلا دیا گیا وریوں فوج چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹ گئی۔ ان پر حملوں کے لئے اور عام قتل وغارت کے

لئے مکتی باہنی کے غنڈے اور مختلف عسکری تنظیمیں پہلے ہی تیار تھیں۔ اسلحہ سب نے سٹور کر رکھا تھا۔ حتیٰ کہ بنگالی فوجیوں نے اپنے فیملی کوارٹرز میں بھی اسلحہ بھر رکھا تھا اور وقت آنے پر یہ لوگ غیر بنگالیوں پر ٹوٹ پڑے۔

پورا مشرقی پاکستان فسادات کی لپیٹ میں آ گیا۔ تمام عدالتیں اور سرکاری دفاتر مفلوج ہو گئے۔ ۲ مارچ کو مشرقی پاکستان میں کرفیو لگا دیا گیا۔ ایک دو روز اس کرفیو پر عمل بھی ہوا اور چند شر پسندوں کو گولیاں ماری گئیں جس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ اس کے ساتھ ہی عوامی لیگ نے اس کرفیو کی سخت مذمت کی اور خطرناک نتائج کی دھمکی دی۔ حکومت ڈر گئی اور ۶ مارچ کو کرفیو ختم کر کے فوج واپس بلا لی جو غالباً بہت بڑی غلطی تھی۔ رات کا کرفیو بہر حال برقرار رہا۔

فوج کے لیے ایک ''ٹاپ سیکرٹ'' آرڈر نکالا گیا کہ اگر کوئی کرفیو کی خلاف ورزی بھی کرے تو اسے کچھ نہ کہا جائے تاوقتیکہ کوئی فوج پر حملہ نہ کرے۔ یہ کھلم کھلا فوج کی بے عزتی اور مذاق تھا۔ فوج کو اس قسم کا حکم دینا ظلم تھا۔ یاد رہے کہ ایسے احکامات بہت خفیہ رکھے جاتے ہیں۔ سوائے متعلقہ اشخاص کے کسی کو اس کی بھنک تک نہیں پڑنے دی جاتی اگر ایسے احکامات کا راز کسی بھی طرح افشاء ہو جائے تو تباہی کا موجب بن سکتا ہے۔

بنگالی میجر خالد مشرف پاکستان آرمی کا قابل، ذہین، دلیر اور بہترین کمانڈو آفیسر تھا۔ یہ شخص شیخ مجیب الرحمٰن اور ''را'' سے مل چکا تھا۔ جب فوج کی ہائی کمان کی طرف سے یہ ''ٹاپ سیکرٹ'' آرڈر یونٹوں میں موصول ہوا تو اس وقت تک یونٹوں میں بغاوت شروع نہیں ہوئی تھی۔ ہائی کمان کا خیال تھا کہ بنگالی فوجی ابھی تک پاکستان کے وفادار ہیں۔ جو کہ انٹیلی جنس کی بہت بڑی ناکامی تھی۔ میجر خالد مشرف نے اس آرڈر کی فوری اطلاع خفیہ طور پر عوامی لیگ کی ہائی کمان کو دی اور اطلاع

مشرقی پاکستان کی تاریخ کا اہم ترین موڑ ثابت ہوئی۔ میرے خیال میں بنگلہ دیش اسی وقت معرض وجود میں آ گیا تھا۔ جب میجر خالد مشرف نے یہ راز عوامی لیگ کے ہیڈ کوارٹر پہنچایا۔ اس وقت کے بعد سے عوامی لیگ اور بنگالیوں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ تحریک آزادی کا یہ ایک اہم موڑ ثابت ہوا۔ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ میجر خالد مشرف نے تاریخ کا رخ موڑ دیا۔ معصوم غیر بنگالی سویلین کی قتل و غارت تو وہ پہلے ہی کر رہے تھے۔ اب انہوں نے سیدھا فوج کو نشانہ بنایا جو پاکستان کی حفاظت کی ذمہ دار تھی۔ جہاں کہیں ایک دو اکیلے فوجی نظر آتے بنگالی انہیں مار دیتے۔ فوج محض چھاؤنیوں تک محدود ہو کر رہ گئی اور سول کی تمام انتظامیہ عوامی لیگ نے سنبھال لی۔ فوج کا تازہ راشن اور ہر قسم کی سپلائی بند کر دی گئی۔ اسی دوران دو گورنر یکے بعد دیگرے تبدیل ہوئے۔ گورنر ٹکا خان سے وہاں کے چیف جسٹس نے بیماری کے بہانے سے حلف لینے سے انکار کر دیا۔ مغربی پاکستان کی فیملیز کو پکڑ پکڑ کر ریپ کیا گیا۔ ان کے پیٹ میں چاقو مارے گئے۔ جن بنگالی یونٹوں میں مغربی پاکستانی جوان تھے انہیں قید کر لیا گیا۔ بعضوں کو سر عام پھانسیاں دی گئیں۔ نعروں کی گونج میں ذبح کیا گیا۔ چٹاگانگ میں جب دوبارہ کنٹرول حاصل کیا گیا تو کئی انسانی خون کے بھرے ڈرم ملے۔ بنگالی غنڈے سامنے کھڑے ہو کر جوانوں کو گالیاں دیتے۔ لیکن فوج کو حکم تھا کہ وہ کچھ نہ کہے مبادا کہ عوامی لیگ والے ناراض ہو جائیں۔ ہماری قومی بدقسمتی دیکھیں کہ فوج کو بے بس کر کے اور سارا کنٹرول عوامی لیگ کے ہاتھوں دے کر عوام کو لولی پاپ دیا گیا کہ مسئلہ سیاسی طور پر حل کیا جا رہا ہے۔

فوج کی بے بسی کی حالت ملاحظہ ہو کہ مغربی پاکستانی فوجیوں کو چھاؤنی سے باہر جانے کی اجازت نہ تھی۔ ایک دن ۲۹ کیولری کا بدقسمت نوجوان لیفٹیننٹ عباس بنگالی گارڈ ساتھ لے کر تازہ سبزی لینے کے لیے چھاؤنی سے نزدیکی بازار گیا جہاں عوامی

لیگ کے غنڈوں نے پکڑ لیا۔ بنگالی گارڈ آرام سے کھڑی رہی۔ بنگالیوں نے اس نوجوان لیفٹیننٹ کے ٹکڑے کر دیئے اور گارڈ آرام سے واپس آ گئی۔ مزید بدقسمتی یہ کہ بدمعاشوں کے خلاف کسی قسم کی کاروائی کرنے سے منع کر دیا گیا۔ دو چار فوجیوں کو ہر چھاؤنی میں روزانہ قتل کرنا معمول بن گیا۔ لیکن سیاسی دانشمندی کی وجہ سے فوج کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ جوان سسکیاں لے لے کر روتے، آفیسر کڑھتے، لیکن ہائی کمان خاموش رہی۔ حالات اس نہج پر پہنچ چکے تھے کہ جب کبھی فوج کی کسی پارٹی کو ایک سے دوسری جگہ جانا ہوتا تو وہ عوامی لیگ کے لوکل کمانڈر سے پرمٹ لے کر ہی باہر نکل سکتے تھے۔ مغربی پاکستانی خواتین کی ریپ، بیہمانہ قتل، فوجیوں کا قتل اور پھانسی کی خبریں مسلسل جوانوں تک پہنچ رہی تھیں لیکن وہ بے بس تھے، جس دن کمانڈو بٹالین جن پر چٹاگانگ میں حملہ ہوا تھا کی ۵۰ لاشوں اور زخمیوں کو ڈھاکہ ائیر پورٹ پر اتار کر لائن میں رکھا گیا اور بعد میں دفنایا گیا۔ افسروں اور جوانوں کا ڈسپلن اور دل کا ضبط ٹوٹ گیا جوان دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ آفیسرز خاموشی سے روئے۔ کچھ نوجوان آفیسرز نے روتے ہوئے کہا:

''کن بدمعاشوں اور ڈکٹیٹروں کے لیے ہمارے ساتھ یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔''

ان حالات میں اپنے آپ پر قابو رکھنا میرے خیال میں پاکستان فوج کا سب سے بڑا کارنامہ تھا۔ قوم کے یہ جیالے' ماؤں کے لخت جگر بے بس ہو کر وطن کی سلامتی کے لیے خون میں نہا گئے لیکن جو اس سانحہ کے ذمہ دار تھے، ''بدمعاش'' آرام سے عیاشی کر کے چلے گئے۔ کتنی بدقسمتی ہے کہ قوم آج بھی اس سانحہ کا ذمہ دار فوج کو ہی ٹھہراتی ہے۔ جنرل کمال متین الدین کے مطابق تقریباً ایک لاکھ بہاری اور مغربی پاکستانیوں کو بے وردی سے شہید کیا گیا۔

بقول شاعر ؎

گلستان کو لہو کی ضرورت پڑی
سب سے پہلے گردن ہماری کٹی
پھر بھی کہتے ہیں مجھ سے یہ اہل چمن
یہ چمن ہے ہمارا، تمہارا نہیں

جنگ دسمبر اور ہمارے مفروضے

دنیا میں آج تک کوئی ایسی جنگ نہیں لڑی گئی جس میں غلطیاں نہ ہوئی ہوں۔ نپولین جیسا جنرل بھی جنگ میں غلطیوں سے نہ بچ سکا۔ لیکن جنگ ایک ایسا کھیل ہے جس میں غلطیاں بعض اوقات فتح کا سبب بھی بن جاتی ہیں اور بعض اوقات فتح شکست میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ فتح حاصل کرنے والے جرنیلوں کی غلطیاں عظیم جنگی چالوں کے طور پر پڑھی جاتی ہیں۔ اور بدقسمت جرنیلوں کی عظیم جنگی چالیں بھی غلطیوں میں شمار ہو جاتی ہیں۔ یہی کچھ ہمارے ساتھ بھی ہوا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم سے کئی غلطیاں سرزد ہوئیں اور چونکہ جنگ میں ناکامی ہمارا مقدر بنی اس لیے ہماری جنگی چالیں بھی غلطیوں میں شمار ہوئیں۔

جنگی حکمت عملی ہمیشہ کچھ مفروضوں پر قائم کی جاتی ہیں۔ ہماری بدقسمتی یا نالائقی یہ تھی کہ ہم نے جو بھی مفروضے اپنی جنگی حکمت عملی کی بنیاد بنائے ان میں اسے اکثر غلط ثابت ہوئے۔ ہمارا پہلا مفروضہ یہ تھا کہ مشرقی پاکستان کی کل آبادی بہت محب وطن ہے اور یہ سب کے سب متحدہ پاکستان میں رہنا چاہتے ہیں۔ یہ غلطی صرف فوج نے ہی نہیں کہ بلکہ ہمارے سیاستدانوں، اہل علم و دانش اور حتیٰ کہ اہل قلم حضرات سے بھی سرزد ہوئی۔ مجھے یاد ہے کہ ۱۹۶۹ء اور ۱۹۷۰ء میں مغربی پاکستان کے دانشوروں نے مشرقی پاکستان کی حب الوطنی کے بارے میں بہت کچھ لکھا۔ اس دور میں ایک مشہور صحافی کا مضمون ''محبت کا زمزمہ بہہ رہا ہے'' بہت مشہور ہوا۔ دانشوروں کی سوچ پوری قوم کی سوچ بن گئی اور فوج بھی چونکہ قوم ہی کا ایک حصہ ہے اس لیے وہ بھی ''محبت'' کے اس زمزمے'' کی تہہ میں پلنے والے طوفان تک نہ پہنچ سکی۔ ہم یہ حقیقت بھول گئے تھے کہ مشرقی پاکستان میں بہت بڑی تعداد میں ہندو آباد تھے جو

تجارت، زراعت اور تعلیم کے شعبوں پر پوری طرح قابض تھے۔ اس سے مزید بدقسمتی اور کیا ہوسکتی تھی کہ ایک زمانے میں راجشاہی یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات کا سربراہ بھی ایک ہندو پروفیسر تھا۔ لہٰذا ۱۹۶۵ء کے بعد کے طلباء کی پود مکمل طور پر پاکستان مخالف اور بنگالی نیشنلسٹ بن کر ابھری ان کے ذہنوں میں یہ پوری قوت سے بھر دیا گیا تھا کہ مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان نے اپنی کالونی بنا رکھا ہے۔ طلباء کی یہ پود پاکستان سے اس قدر متنفر ہوچکی تھی کہ جب وقت آیا تو یہ اپنے لیڈروں کے قابو میں بھی نہ رہی اور کوئی معقول بات سننے کے لیے تیار نہ تھی۔ جس طرح سے پاکستان بنانے میں طلباء نے بہت اہم کردار کیا تھا اسی طرح پاکستان توڑنے میں بھی طلباء نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ ہم یہ بھی اندازہ نہ لگا سکے کہ بھارتی ایجنسی ''را'' نے بنگالی نیشنلزم پر بہت کام کیا ہے۔ وسیع اور طاقتور ہندو آبادی ان کی مدد کے لیے وہاں موجود تھی۔ ہماری سراغ رساں ایجنسیاں جن کا زیادہ تر تعلق مغربی پاکستان سے تھا زبان اور کلچر سے بھی ناواقف تھیں۔ وہ معاشرتی ڈھانچہ کے حصار کو توڑ کر معاشرے کی گہرائی میں جنم لینے والی نفرت اور بغاوت کو نہ دیکھ سکیں۔ یہ لاوا اندر ہی اندر پکتا رہا اور پھر آتش فشاں بن کر ایسا پھٹا کہ محبت اور باہمی اخوت کے رشتوں کو بھسم کر گیا۔ نہ فوج کچھ کرسکی اور نہ مغربی پاکستان کے منتخب رہنما معاشرے کی گہرائی میں پلنے والی بغاوت سے مشرقی پاکستان سے تعلق رکھنے والے فوجی بھی لاتعلق نہ رہ سکے۔ ہم یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے بنگالی آفیسرز اور جوان بھی بغاوت کر جائیں گے۔ ان کی حب الوطنی شک وشبہ سے بالاتر تھی۔ لہٰذا نہ تو ان سے ہتھیار رکھوائے گئے نہ ان کی حرکات وسکنات پر نظر رکھی گئی۔ پھر جب بغاوت شروع ہوئی تو مشرقی پاکستان میں خدمات دینے والے مشرقی پاکستانی فوج، پیرا ملٹری فورسز، پولیس اور حتی کہ رضا کار تک بمع اسلحہ، جنگی پلاننگ اور خفیہ کوڈ وغیرہ بغاوت کر کے بھارت بھاگ گئے پھر مکتی باہنی کو

ساتھ ملا کر بھارتی فوجی قیادت کی زیر نگرانی پاکستانی فوج کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ اسی طرح مغربی پاکستان سے بھی بعض اہم مقامات پر تعینات کچھ بنگالی فوجی افسران مغربی محاذ کے متعلق تمام فوجی پلاننگ لے کر بھاگ گئے۔ پاکستان کی تمام جنگی حکمت عملی جس کا خفیہ رہنا از حد ضروری تھا دشمن کے ہاتھ چلی گئی اور شکست ہمارا مقدر بن گئی۔ یہ مفروضہ کہ بنگالی فوج تمام کی تمام متحدہ پاکستان کی حامی ہے ہماری دوسری بڑی غلطی ثابت ہوئی جس کا تدارک ہمارے بس میں نہ تھا۔

ہمارا تیسرا بڑا مفروضہ یہ تھا کہ بھارت مشرقی پاکستان کی بین الاقوامی سرحد عبور نہیں کرے گا اگر مشرقی پاکستان پر نظر ڈالی جائے تو تین اطراف سے بھارت ہے اور چوتھی طرف سمندر۔ چونکہ وہاں ہماری نیوی نہ ہونے کے برابر تھی اس لیے سمندر پر پوری طرح بھارت کی حکمرانی تھی اور یوں ہماری مکمل ناکہ بندی۔ سرحدوں کے ساتھ ساتھ تین اطراف بنگالی مہاجرین کے کیمپ تھے جو مکمل طور پر مکتی باہنی اور بنگالی فوج کی کمان میں تھے۔ ان کیمپوں کے ساتھ ساتھ ۹ ڈویژن بھارتی فوج بمعہ بھاری توپ خانہ، ٹینک اور ائیر فورس موجود تھی۔ اس فوج کی مدد کے لیے تین ڈویژن مزید سیکنڈ لائن ریزرو میں موجود تھے۔ اس فوج کو مارچ ۷۱ء میں ہی مکمل حملے کی تیاری کا حکم مل چکا تھا۔ لہٰذا اتنی بڑی فوج نے حملے کی خوب ریہرسل کی۔ مکتی باہنی، بنگالی فوج اور بھارتی گوریلوں کو مشرقی پاکستان میں داخل کر کے معصوم اور پر امن شہریوں کی دل کھول کر قتل و غارت کی گئی اور یہ سب کچھ پاکستان فوج کے کھاتے میں ڈال کر فوج اور سول آبادی کے درمیان نفرت کی نہ مٹنے والی دیوار کھڑی کر دی۔ فوج کو اس حد تک الجھا دیا گیا کہ وہ مفلوج ہو کر رہ گئی۔ یاد رہے کہ مشرقی پاکستان کا رقبہ تقریباً ڈیڑھ لاکھ مربع کلو میٹر اور ۲ ہزار کلو میٹر بھارت کے ساتھ مشترک سرحد۔ لہٰذا پاکستان کی محض ۲۵ ہزار انفنٹری، بغیر ٹینک، بغیر بھاری توپ خانہ اور بغیر ائیر فورس جسے پوری

طرح مسلح باغی سول آبادی اور تقریباً ۱۲ ڈویژن بھارتی فوج سے سامنا تھا بالکل بے بس و مجبور تھی۔ لہٰذا یہ مفروضہ کہ بھارت بین الاقوامی سرحد عبور نہیں کرے گا بھی بالکل غلط ثابت ہوا۔ بھارت نے بے خوف و خطر حملہ کیا اور پاکستان فوج جو پہلے ہی بری طرح سے الجھا دی گئی تھی مقابلہ نہ کر سکی۔ ہماری بے بسی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ عام طور پر ایک انفنٹری بٹالین کو ۲ سے ۳ ہزار گز تک علاقہ دفاع کے لیے دیا جاتا ہے لیکن یہاں بامر مجبوری ایک ایک بٹالین کو ۷۰ سے ۸۰ کلومیٹر تک کا علاقہ دفاع کے لیے دیا گیا جو کہ ناممکن تھا۔

ہمارا یہ بھی مفروضہ تھا کہ بھارت بین الاقوامی سرحد پر حملہ کرنے کی بجائے کوئی چھوٹا سا غیر اہم علاقہ مکتی باہنی کے ذریعہ قبضہ میں لے کر وہاں آزاد بنگلہ دیش کا اعلان کر دے گا۔ پھر باقی دنیا سے بنگلہ دیش کو تسلیم کرا کے اسے بین الاقوامی درجہ دلا دیا جائے گا لہٰذا ہماری کوشش یہ تھی کہ ایک ایک انچ زمین کی حفاظت کی جائے اور کسی طرح بھارت کو چھوٹے سے چھوٹے ٹکڑے پر بھی قابض نہ ہونے دیا جائے تاکہ آزاد بنگلہ دیش حکومت قائم کرنے کا موقع نہ ملے۔ اس ایک ایک انچ کے دفاع کی مجبوری کی وجہ سے ہماری چھوٹی سی فوج کو دو ہزار کلومیٹر لمبی بین الاقوامی سرحد میں دفاع کرنا پڑا جو ان حالات میں بغیر ٹینکوں کے، بغیر بھاری توپ خانے کے اور بغیر ایئر فورس کے ممکن نہ تھا۔ اس بھاری ذمہ داری کی وجہ سے ہمیں اپنی پوری فوج کو تمام سرحدوں اور اہم علاقوں میں پھیلانا پڑا حتیٰ کہ سیکنڈ لائن فورس، پولیس اور پیرا ملٹری فورسز بھی سرحدوں پر پھیلا دی گئیں۔ اس کے تین بڑے نقصانات ہوئے۔ اول یہ کہ ہمارے پاس ریزرو فورس کچھ نہ بچی جو جنگی نقطہ نگاہ سے بہت اہم ہے۔ فرنٹ لائن پر لڑنے والی فوج کے لیے۔ ریزرو نہ ہونا خودکشی کے مترادف ہے اور یہ خودکشی ہمیں بامر مجبوری گلے لگانی پڑی۔ دوسرا بڑا نقصان یہ ہوا کہ فوج چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹ گئی۔

ہمارے فوجی وسائل اتنے نہ تھے کہ ہم کسی جگہ بڑا حملہ کر سکتے۔ ہماری تمام تر کوشش دفاع پر مرکوز تھی اور مستحکم دفاع کے لیے فوج کو ٹکڑیوں میں نہیں بلکہ متحد کر کے لڑایا جاتا ہے لیکن فوج کو اکٹھے رکھنا حالات کے مطابق ممکن نہ تھا اس طرح ٹکڑیوں میں بٹی ہوئی فوج نہ حملہ کرنے کے قابل تھی اور نہ دفاع بلکہ کہیں بھی جم کر نہ لڑ سکی جو کسی بھی اچھی تربیت یافتہ فوج کے ساتھ بہت بڑی زیادتی ہے۔ فوج کو بطور فوج لڑایا جانا چاہیے جو ممکن نہ ہو سکا اور بھارت ہماری اس مجبوری سے بخوبی واقف تھا۔

اس مفروضے کا تیسرا بڑا نقصان یہ ہوا کہ ہم متبادل دفاعی لائن کی منصوبہ بندی نہ کر سکے۔ حالانکہ مشرقی پاکستان دریاؤں کی سرزمین ہے۔ جو بہترین قدرتی دفاعی لائن کا کام دیتے ہیں۔ اگر ہمیں ایک ایک انچ زمینی دفاع کی مجبوری نہ ہوتی تو ان دریاؤں کے ساتھ ساتھ پوزیشن لے کر ہم بہترین دفاع کر سکتے تھے اور کافی عرصہ تک نہ صرف لڑ سکتے تھے بلکہ دشمن کو کافی نقصان بھی پہنچا سکتے تھے۔ اگر ایسی منصوبہ بندی ہوتی تو جب بھارتی حملہ روکنا ناممکن ہو گیا تھا تو ہم منصوبہ بندی کے تحت منظم طریقے سے پیچھے ہٹ کر دریاؤں کے ساتھ متبادل دفاعی لائن پر پوزیشن لے کر بھارت کو ناکوں چنے چبوا سکتے تھے جو نہ ہو سکا۔

یہاں پر یہ ماننا پڑے گا کہ بھارتی فوجی قیادت باشعور، مستعد اور مکمل طور پر حملے کے لیے تیار تھی۔ ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ کے بعد اسرائیلی چیف آف سٹاف جنرل رابن سے معجزاتی فوجی کامیابی کی وجہ پوچھی گئی تو اس نے جواب دیا کہ جنگی منصوبہ بندی ایسی ہونی چاہیے جو دشمن کو میدان جنگ میں کنفیوز رکھے اور ہمارے اصلی مقاصد کا پتہ نہ چلنے دے۔ یہی کچھ بھارتی فوجی قیادت نے کیا۔ ان کی جنگی منصوبہ بندی ایسی تھی کہ جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی ہماری تمام فوج کو سرحدوں پر سمیٹ لیا گیا۔ کنٹونمنٹ خالی ہو گیے حتی کہ اہم مقامات کے دفاع کے لیے بھی کچھ نہ

بچا۔ ہم جب بھارتی حملوں سے دفاع میں مصروف تھے تو بھارت نے ہمارے پیچھے اپنی چھاتہ بردار فوج اتار دی لہٰذا متبادل دفاعی لائن کی اگر کوئی تھوڑی بہت منصوبہ بندی تھی بھی تو ہم اس سے یکسر محروم ہو گئے۔ دوسرا ہمارے لیے دو محاذوں پر آگے اور پیچھے لڑنا تو بالکل ہی ممکن نہ تھا۔ لہٰذا ہتھیار ڈلوا دیئے گئے اور تاریخ میں ہمیشہ کے لیے ہمارا منہ کالا ہو گیا۔

ہمارا اگلا اور سب سے غلط مفروضہ یہ تھا کہ بین الاقوامی دنیا ہمیشہ حق کا ساتھ دیتی ہے۔ ہم چونکہ اپنے ملک کا دفاع کر رہے تھے اس لیے ہم حق پر تھے۔ اقوام متحدہ کے کسی ممبر ملک پر حملہ سراسر دھاندلی، سینہ زوری اور بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی ہے۔ جس کا موجود دور میں سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ لیکن بھارت نے بہت شاطرانہ طریقے سے بین لاقوامی طاقتوں کو ہمارے خلاف کر دیا۔ بھارتی پروپیگنڈا نہایت ہی تیز، طاقتور اور بہت مؤثر تھا۔

بین الاقوامی پریس اور میڈیا نے بھی بھارت کا ساتھ دیا۔ پاکستانی فوج کے خلاف نفرت پھیلانے کے لیے بھارت نے قتل وغارت کے ذریعے سرزمین مشرقی پاکستان سرخ کر دی۔ عورتوں کی عزتیں تار تار کر دیں۔ ظلم کے پہاڑ توڑ دیئے۔ بھارتی ظلم وستم کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ جن دنوں ڈھاکہ میں بنگالی علمی، ادبی اور سائنسی شخصیات کو رات کے اندھیرے میں گھروں سے بلا کر بیہمانہ طور پر قتل کیا گیا۔ پاکستانی فوج ڈھاکے سے کم از کم دو سو کلو میٹر دور سرحدوں پر مورچہ زن تھی۔ ڈھاکہ چھاؤنی خالی تھی۔ پاکستان فوج کو ان شخصیات کی رہائش گاہوں کا بھی علم نہیں تھا مزید یہ کہ ایسی مقتدر شخصیات کو قتل کر کے سوائے بدنامی اور نفرت کے کوئی فوجی مقصد بھی حاصل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن بھارت نے اپنی پریس اور میڈیا مہم کے ذریعے یہ سب کچھ پاکستان فوج کے کھاتے میں ڈال کر پوری دنیا میں بدنام کیا حتی کہ

مارچ اپریل میں جو زبردست طوفان آئے کئی گاؤں صفحہ ہستی مٹ گئے۔ انسانوں اور جانوروں کی لاشیں درختوں پر لٹکی رہ گئیں۔ قدرتی آفات سے ہونے والی بربادی اور دل ہلا دینے والی انسانی بے بسی کی موثر فلم بندی کرکے پوری دنیا میں پھیلا دی گئی اور اس سب ظلم و ستم، انسانی بربادی، ظلم و بربریت کا نشانہ پاکستان فوج بنی۔ نہ تو بین الاقوامی میڈیا نے اور نہ ہمارے اپنے میڈیا نے حقائق جاننے کی کوشش کی۔ ہمارا اپنا میڈیا اتنا بودا اور غیر موثر تھا کہ حق کے لیے بھی آواز نہ اٹھا سکا اور یوں اپنے ملک کی عزت و ناموس پر قربان ہونے والی پروفیشنل پاکستانی فوج اپنے ہی ملک کی سالمیت کا دفاع کرتے ہوئے بھارتی پراپیگنڈا کے ذریعے شیطان اعظم کے روپ میں بدل گئی۔ بال کی کھال اتارنے والی انصاف پسند طاقتیں بھارتی پروپیگنڈا کے سامنے مسحور ہوگئیں۔ ہمارے حق میں پوری دنیا بشمول مسلمان ممالک ایک بھی آواز بلند نہ ہوئی۔ ساری دنیا کے سامنے بھارت نے انصاف اور امن کی دھجیاں اڑا دیں لیکن پھر بھی بھارت امن کا علمبردار اور اہنسا کا پجاری بنا رہا اور پاکستان بے دردی سے دولخت ہوگیا۔

کمزور دلدل میں پھنسی ہوئی پاکستانی فوج نے آخری دم تک متحدہ پاکستان کی سالمیت بچانے کی کوشش کی۔ اپنی جان اور عزت داؤ پر لگا دی مگر ہماری غلطیاں اور ہمارے مفروضے ہمیں لے ڈوبے۔

❀❀❀❀❀

سقوط ڈھاکہ اسباب و اسباق

جناب جاوید قریشی صاحب لکھتے ہیں:

قارئین کو یاد ہوگا کہ ۱۹۴۰ء کی قرارداد پاکستان تاریخی شہر لاہور کے منٹو پارک میں شیر بنگال اے کے۔ فضل الحق نے پیش کی تھی۔ بنگال کی مسلم آبادی نے پاکستان کے حصول کی تحریک میں بڑھ چڑھ کے حصہ لیا۔ یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ بنگالی کی مدد کے بغیر حصول پاکستان شاید ممکن نہ ہی ہوتا۔ پھر وہ کیا حالات اور وجوہ تھیں جنگی بدولت مشرقی پاکستان ملک کے مغربی بازو سے کٹ کے علیحدہ ہوگیااور مشرقی پاکستان دنیا کے نقشے پر بنگلہ دیش کے روپ میں نمودار ہوا۔

اب جب کہ بنگلہ دیش کو معرض وجود میں آئے ۳۶/۳۷ سال ہو چکے ہم پاکستانیوں کی خواہش ہے کہ اس ملک میں بسنے والے ہمارے بھائی امن چین سے رہیں۔ ترقی اور خوشحالی کی منزلیں طے کریں اور اہل پاکستان سے ان کے روابط انتہائی دوستانہ اور برادانہ رہیں لیکن ان اسباب کا احاطہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے جنہوں نے اس ملک کو دولخت کیا تاکہ قوم سابقہ غلطیوں کا اعادہ نہ کر کے مزید صدموں اور نقصانات سے محفوظ رہے۔ درست ہے کہ سقوط ڈھاکہ کے بعد اس وقت بھارت کی وزیر اعظم اندرا گاندھی نے اپنے ایک بیان میں کہا تھا کہ بھارت نے اپنی ایک ہزار سال مسلم غلامی کا بدلہ لے لیا ہے۔ بھارت کی مسلح مداخلت اور جارحیت کے بغیر شاید ایسا ہونا ممکن نہ ہوتا لیکن محض بھارت جارحیت کو اس کے لیے ذمہ دار ٹھہرا کر بات ختم کر دینا تاریخی اعتبار سے درست نہ ہوگا۔ ہمیں کھلے دل اور صاف ذہن سے ان تمام محرکات کا جائزہ لینا ہوگا جس کی وجہ سے یہ سانحہ پیش آیا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اس قومی سانحہ سے کچھ سیکھ لیا جاتا اور کوشش کی جاتی کہ ان غلطیوں کا اعادہ نہ کیا جائے جن کی

۱۹۷۰ء کے عشرہ میں اس قدر بھاری قیمت ادا کر چکے ہیں۔ لیکن افسوس سے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ہم نے ملک کے دائیں بازو سے محروم ہو جانے کا غم جلد ہی فراموش کر دیا۔

مزید افسوس اس بات کا ہے کہ تاریخ اور حالات سے سبق حاصل کرنے کی بجائے ہم مستقل اپنی غلطیوں کو دہرائے جا رہے ہیں جن کے باعث مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بنا۔ اللہ تعالیٰ ہماری قوم اور حکمرانوں کو عقل سلیم عطا فرمائے اور ہمارے ملک کو تحفظ اور عافیت میں رکھے۔

مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان میں بعض بنیادی فرق تھے، یہ اختلاف مذہب کے علاوہ زندگی کے ہر پہلو میں تھا۔ زبان، لباس، ثقافت، سیاست، غرض کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جس میں مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان میں گہری یگانگت پائی جاتی ہو مقابلہ میں مغربی پاکستان میں واقعہ جغرافیائی علاقے صوبہ سرحد، پنجاب، سندھ اور بلوچستان میں آباد لوگوں میں کافی باتیں مشترک تھیں۔ دوسرے یہ کہ اردو زبان برصغیر کے مسلمانوں کی زبان تھی مغربی پاکستان میں کم وبیش ہر جگہ سمجھی جاتی تھی۔ پاکستان بننے کے فوراً بعد یہی خیال تھا کہ پاکستان کی قومی زبان ایک ہی ہو گی اور وہ اردو ہو گی۔ اردو زبان مسلمانان برصغیر کی میراث تھی جو بہت ترقی یافتہ اور بلیغ زبان تھی۔ اردو ادب، شاعری، تنقید غرض ہر اعتبار سے مکمل زبان تھی لیکن مشرقی پاکستان کے لوگ اپنی زبان بنگلہ پر فریفتہ تھے اور کیوں نہ ہوتے کہ بنگلہ بذات خود بہت ترقی یافتہ زبان ہے بلکہ برصغیر میں اس وقت تک واحد نوبل انعام یافتہ شخصیت رابندر ناتھ ٹیگور بنگلہ زبان ہی میں شاعری کرتے اور موسیقی ترتیب دیتے تھے اور اسی پر انہیں نوبل انعام کا حقدار قرار دیا گیا۔

جب قائداعظم مشرقی پاکستان کے دورہ پر گئے تو انہوں نے وہاں ایک تقریر کے دوران کہہ دیا کہ پاکستان کی ایک ہی زبان ہوگی اور وہ زبان اردو ہوگی۔ اس اعلان

سے تمام مشرقی پاکستان میں احتجاج اور ہنگامے شروع ہو گئے جو بڑھتے بڑھتے طلباء اور یونیورسٹی تک پہنچ گئے۔ پولیس فائرنگ سے بدقسمتی سے بعض قیمتی جانیں ضائع ہوئیں۔ جن کی یادگار آج بھی ڈھاکہ یونیورسٹی میں شہید مینار کی شکل میں موجود ہے۔ یہ واقعہ دراصل مشرقی اور مغربی پاکستان میں اختلافات کی بنیاد بنا بعد میں خلیج وقت کے ساتھ بڑھتی چلی گئی۔ حکمرانوں کی کوتاہ بینی اور عاقبت نااندیشی نے جلتی پر تیل کا کام دیا اور اختلافات انجام کار ملک کے دولخت ہونے پر منتج ہوئے۔

قیام پاکستان کے وقت مشرقی پاکستان کی آبادی مغربی پاکستان سے مقابلۃً زیادہ تھی۔ اگر جمہوری اقدار کا پاس رکھا جاتا تو جس جماعت کی پارلیمنٹ میں اکثریت ہوتی اسی کو حکمرانی کا حق ملنا چاہیے تھا لیکن مغربی پاکستان کے سیاستدان شاید مشرقی پاکستان کی بالا دستی قبول کرنے کو تیار نہ تھے۔ اسے سیاسی تنگ نظری کہا جائے یا عاقبت نااندیشی۔ مشرقی پاکستان کے ذہن پر زبان کے مسئلہ پر جو شکوک ابھرے تھے مغربی پاکستان کے سیاست دانوں کی کج فہمی کی بنا پر اور مضبوط ہوئے اور ملک کے دونوں صوبوں کے درمیان فاصلوں میں اضافے کا سبب بنے۔ لوگوں میں احساس پیدا ہونا شروع ہوا (جسے سیاست دانوں نے اپنے مفاد میں خوب استعمال کیا) کہ شاید متحدہ پاکستان میں ہنگاموں سے مفادات کے تحفظ دشوار ہوگا۔ آزادی کے وقت ملک شدید اقتصادی بحران کا شکار تھا۔ صنعت وحرفت نام کو نہ تھی۔ مشرقی پاکستان ہو یا مغربی پاکستان بنک انشورنس کمپنیاں، ذرائع رسل ورسائل کی عدم موجودگی، دفتروں میں فرنیچر، ملازمین کو تنخواہیں ادا کرنے کے لیے سرکاری خزانے میں رقم نہیں۔ کیفیت یہ تھی کہ برصغیر کا پٹ سن پیدا مشرقی پاکستان میں ہوتا تھا لیکن کارخانے سب کے سب کلکتہ میں تھے۔

مشرقی پاکستان جغرافیائی طور پر ڈیلٹائی علاقہ تھا، دریا، سمندر کی طرح عریض

تھے جن پر پلوں کی تعمیر وسائل سے باہر تھی، اس پر اس علاقہ میں طوفان اور سائکلون آتے رہے جن سے عظیم جانی اور مالی نقصان ہوتا۔ جیوٹ یا پٹ سن کی برآمد زرمبادلہ کمانے کا بڑا ذریعہ رہی مشرقی پاکستان کی عوام اور معیشت دانوں نے اعتراض کرنا شروع کیا کہ زرمبادلہ کمایا تو مشرقی پاکستان کی برآمدات سے جاتا ہے (پٹ سن اور چائے وغیرہ) لیکن اس کا خرچ زیادہ تر مغربی پاکستان میں ہوتا ہے۔ ایوب خان کے زمانہ میں دارالخلافہ کراچی سے اسلام آباد منتقل ہوا تو مشرقی پاکستان کے احساس محرومی میں مزید اضافہ کا باعث بنا۔ بنگالیوں کی تشفی کے لیے ڈھاکہ میں ایک اور دارالخلافہ ''سیکنڈ کیپٹل'' کے قیام کی منظوری دی گئی جو نہایت سست روی کا شکار رہا۔ لوگ مشرقی پاکستان سے مغربی پاکستان آتے تھے اسلام آباد کی ترقی دیکھ کر اور سیکنڈ کیپیٹل کا اس سے مقابلہ کر کے دل مسوس کے رہ جاتے۔ پھر فوج کا صدر دفتر راولپنڈی مغربی پاکستان میں، بنکوں کے ہیڈ آفس کراچی میں، قومی ہوائی کمپنی (پی آئی اے) مغربی پاکستان میں، غرض ترقی کی تمام علامات مغربی پاکستان میں اور مشرقی پاکستان میں غربت اور محرومی۔ اس اعتراض کے جواب میں کہ مرکز کی طرف سے مشرقی پاکستان کو رقوم کی فراہمی ان کے جائز حصہ سے کم کی جاتی ہے۔ عام طور پر کہہ دیا جاتا کہ وہاں ایک خاص مد سے زیادہ رقوم خرچ نہیں کی جاسکتیں۔ اس سرزمین کی (پیداوارانہ صلاحیت) کم ہے۔ مشرقی پاکستان کے لوگوں کو یہ دلیل زیادہ متاثر یا مطمئن نہ کر سکتی تھی، یہ ناہمواری مزید بگاڑ کا سبب بنی۔ انتظامی امور میں بھی حالات اس طرح کے پیدا ہونے لگے کہ وفاق کو ایک مضبوط رشتہ میں باندھنے میں رکاوٹ بنیں۔ مغربی پاکستان سے جو اعلیٰ سول سرونٹس مشرقی پاکستان جاتے تھے ان کا رویہ بالعموم غیر ہمدردانہ اور تحکمانہ ہوتا تھا۔ لوگوں کی زبان ان کو آئی نہ تھی جس سے ''حاکم اور محکوموں'' کے درمیان فاصلے کم ہونے کی بجائے بڑھنا شروع ہو گئے۔ عوام ان

افسروں اور حاکموں کو سابقہ نوآبادیاتی نظام کا تسلسل ہی سمجھتے۔ نئے وفاق کی بنیاد مستحکم کرنے میں ہماری سول سروس نے بھی کوئی قابل فخر کردار انجام نہیں دیا اسی طرح فوج میں بھی افسروں اور جوان دونوں سطح پر بنگالیوں کا داخلہ شروع میں مشکل ہوتا۔ وجہ یہ تھی کہ فوج میں بھرتی کا جسمانی معیار جو شروع سے متعین ہو چکا تھا ایسا تھا جس پر بنگالی پورا نہ اُترے۔ سرحد اور پنجاب کے لوگ مقابلتاً زیادہ چوڑے چکلے اور بلند قامت ہوتے۔ بنگالی نسبتاً پست قد اور کم چوڑے چکلے افراد تھے۔ درست یہ ہے کہ فوج نے معیار کو نرم کیا کہ مشرقی پاکستان کے لوگ فوج میں زیادہ تعداد میں شریک ہو سکیں لیکن بداعتمادی کا بیج بویا جا چکا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ یہ پودا پھل پھول کر اتنا تناور درخت بن گیا جس کے نیچے یگانگت اور حب الوطنی کا پنپنا دشوار ہو گیا۔ مشرقی پاکستان کے لوگ ہر اعتبار سے خود کو مظلوم اور مغربی پاکستان کے لوگوں کو ظالم سمجھتے تھے' بالخصوص پنجاب کے خلاف جذبات رفتہ رفتہ اس قدر شدید ہو گئے کہ علامتاً ہر مغربی پاکستانی کو وہ پنجابی کہتے۔ پنجابیوں کی تعداد مغربی پاکستان میں عددی اعتبار سے زیادہ تھی۔ اس وجہ سے ان کا تناسب فوج میں سول سروس میں اور زندگی کے دیگر شعبوں میں زیادہ نظر آتا' چنانچہ بنگالیوں نے سمجھ لیا کہ ان کی محرومی کے لیے اصل ذمہ دار پنجاب کے عوام ہیں۔ ظاہر ہے یہ مفروضہ غلط بنیاد پر قائم کیا گیا تھا۔ کاش وہ سمجھ سکتے یا انہیں سمجھایا جا سکتا کہ غیر جمہوری حکومتوں اور نظام کی بدولت پنجاب کے عوام بھی اسی قدر دکھی اور دل گرفتہ رہے جس قدر مشرقی صوبہ کے لوگ، لیکن چونکہ جمہوریت کی عدم موجودگی میں مکالمہ کی روایت ختم ہو جاتی ہے، پنجاب کے لوگ بنگالی بھائیوں تک دل کی بات پہنچانے میں ناکام رہے۔

ملک کے دولخت ہونے میں بھارتی جارحیت اور توسیع پسندی تو اہم وجوہ تھیں ہی، پاکستان میں سیاسی عمل اور اہل سیاست کی ناکامی، کوتاہ عقلی اور معاملہ فہم نہ ہونے

کو بھی اس میں بڑا دخل ہے۔ اس بات کا ادراک بہت لازم ہے کہ سیاسی مسائل کو سیاسی طریق سے حل کیا جائے۔ وفاق کے تمام حصوں کے ساتھ مساویہ اور برابری کا سلوک ہو۔ ہر صوبہ کی اپنی زبان اور اپنی ثقافت شناخت ہوتی ہے۔ان تمام کو عزت اور احترام سے دیکھا جائے۔ دراصل مختلف ثقافتی دھارے مل کر ہی قومی ثقافت کا روپ اختیار کرتے ہیں، جس طرح انواع و اقسام کے پھول مل کر گلدستہ کی شکل اختیار کرتے ہیں اور اس کے حسن اور دیدہ زیبی میں اضافہ کرتے ہیں۔

اسی طرح علاقائی ثقافتی میراث،قومی ثقافت کی تشکیل کرتی ہے جس کی پرورش کے لیے مسلسل نگہداشت کی ضرورت ہوتی ہے۔ پاکستان کو ایک بار پھر سیاسی اختلافات اور اقتصادی ناہمواری کا سامنا ہے۔ مسائل کے حل میں سوجھ بوجھ،فہم و فراست اور برداشت کی ضرورت ہے۔ بندوق اور تلوار کے دھنی مسائل کے حل میں طاقت کا استعمال لازمی سمجھتے ہیں۔ عارضی کامیابیوں سے سمجھنے لگتے ہیں کہ ان کی سمجھ سب سے ارفع اور سوچ سب سے اعلیٰ ہے حقیقت کچھ اور ہوتی ہے۔ انہیں کچھ اور نظر آتی ہے۔

❀❀❀❀❀

سقوط ڈھاکہ سے ہم نے کیا سبق سیکھا

ڈاکٹر حسین احمد پراچہ لکھتے ہیں:

زخم تازہ ہو تو درد کی ٹیسیں اٹھتی ہیں اور انسان کو مسلسل بے چین رکھتی ہیں اور اگر زخم پرانے ہو جائیں تو اکثر یاد آتے اور تڑپا جاتے ہیں۔ ہمارے جسد ملی سے مشرقی بازو کی علیحدگی ایک المیے کی حیثیت سے ہمارے قومی حافظے میں محفوظ ہے۔ ۱۶ر دسمبر ۱۹۷۱ء کو سقوط ڈھاکہ سے پہلے دو برس بہت پرآشوب رہے۔ پہلے انتخابات کی گہما گہمی رہی پھر فوجی کاروائی، خانہ جنگی اور پاک بھارت جنگ نے وہاں تہلکہ مچائے رکھا۔ بقول صدیق سالک مرحوم ''ان دنوں ہر روز تاریخ کا ایک نیا موڑ مڑ رہی تھی'' ادھر ہمارے سیاہ وسفید کے مالک رات کی تاریکی میں اپنے سیاہ کرتوتوں میں مگن تھے اور انہیں اس بات کا رتی بھر احساس نہ تھا کہ کل تاریخ میں انہیں کن الفاظ سے یاد کیا جائے گا۔ جیسے کوئی تقدیر کا لکھا نہیں ٹال سکتا اسی طرح اپنی خطاؤں اور غلطیوں کے نتائج کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑتا ہے۔ نااہل لوگ جب اجتماعی معاملات کے ذمہ دار بنا جاتے ہیں، تو ان کی انفرادی خطاؤں کی سزا ساری قوم کو ملتی ہے۔ یہ سزا ہمیں ملی اور ہم ابھی تک اس سزا کی اذیت سے گزر رہے ہیں مگر اس سے بڑی سزا یہ ہے کہ ہم نے صحیح معنوں میں اپنا احتساب کیا ہے اور نہ ہی اس دور کی غلطیوں سے سبق سیکھ کر آئندہ کے سفر کی سمت درست کی ہے۔ بہر حال ہر سال جب دسمبر کا مہینہ آتا ہے اور ۱۶ دسمبر کی تاریخ قریب آتی ہے تو ہماری روح بے قرار اور ہمارا دل بے چین ہو جاتا ہے۔

دل کی چوٹوں نے کبھی چین سے رہنے نہ دیا
جب چلی سرد ہوا میں نے تجھے یاد کیا

میں نے ان دنوں ۱۹۶۹ء سے لے کر ۱۹۷۱ء تک کے حالات کو ایک غیر جانبدار مورخ کی آنکھ سے دیکھنے کی کوشش کی ہے بالخصوص مارچ ۱۹۷۱ء کے حالات پر اپنی توجہ مرتکز کی ہے۔ ان دو سالوں کے دوران رونما ہونے والے واقعات کا مختلف ذرائع سے جائزہ لیا ہے۔ اس تحقیقی و تفصیلی جائزے کے دوران میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ قیام پاکستان سے لے کر ۱۹۷۰ء تک ہم نے بہت غلطیاں کیں مشرقی پاکستان کے بھائیوں کو کمتر درجہ کی مخلوق سمجھا۔ ہم نے معاشی، سیاسی اور عسکری اور سماجی ہر سطح پر ایسی خطائیں کیں کہ جن کے وہی نتائج نکلنے چاہیں تھے جو ہمارے سامنے آئے۔ ہماری سب سے بڑی غلطی بلکہ کوہ ہمالیہ سے بڑی غلطی ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات کے نتائج کو تسلیم نہ کرنے کی تھی۔ تاہم مارچ ۱۹۷۱ء کے واقعات کے قریبی جائزے سے یہ حقیقت آشکارا ہوتی ہے کہ جنرل یحییٰ خان کی قیادت میں مغربی پاکستان میں موجود جرنیلوں نے مشرقی پاکستان کو جدا کرنے کا فیصلہ ۱۹۷۱ء میں کر لیا تھا مشرقی پاکستان میں موجود فوجی وسویلین قیادت ہر گزرنے والے لمحے کی تشویشناک صورتحال سے جی ایچ کیو اور جنرل یحییٰ خان کو مطلع کرنے کی کوشش کرتی رہی مگر یہاں پر کوئی ذمہ دار شخص بات سننے کو ہی تیار نہ تھا۔ فوری اور دوٹوک فیصلہ کرنا تو دور کی بات' میں پوری ذمہ داری اور سنجیدگی سے یہ بات کہہ رہا ہوں کہ مارچ ۷۱ء میں ہر قدم پر سقوط ڈھاکہ کے المیے سے بچا جا سکتا تھا مگر واضح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ مغربی پاکستان میں موجود فوجی جنتا کو اس ٹریجڈی سے بچنے کی کوئی تمنا نہ تھی۔

مارچ ۱۹۷۱ء میں قدم قدم پر ایسے فیصلے کئے گئے جو ملک توڑنے والے تھے۔ مشرقی پاکستان کی ۱۶۲ میں سے مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ ۱۶۰ نشستیں حاصل ہوئیں۔ اس کا منطقی نتیجہ یہی تھا کہ اقتدار مجیب الرحمٰن کے حوالے کر دیا جاتا مگر فوجی جنتا نے نہ صرف مجیب الرحمٰن کو اقتدار نہ دیا بلکہ قومی اسمبلی کا بار بار اجلاس بلا کر ملتوی کیا جس

سے مشرقی پاکستان کے لوگوں کو یہ پیغام ملا کہ فوجی قیادت کامیاب پارٹی کو اقتدار حوالے کرنے پر آمادہ نہیں۔ ۲۸ فروری کو ۳ مارچ ۱۹۷۱ء کو ہونے والا اسمبلی اجلاس ملتوی کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا تھا تاہم ابھی اس کا اعلان نہ ہوا تھا۔ گورنر احسن نے مجیب الرحمٰن کو ڈرتے ڈرتے اس فیصلے سے آگاہ کیا۔ اس پر حسب توقع برانگیختہ ہونے کے بجائے شیخ مجیب الرحمٰن نے نہایت معقولیت سے صرف اتنا کہا ''اگر اجلاس کے التوا کے ساتھ ساتھ نئی تاریخ کا بھی اعلان ہو جائے تو مجھے اپنی جماعت کے انتہا پسندوں کو کنٹرول کرنے میں سہولت ہوگی۔ اگر آئندہ تاریخ مارچ میں ہو تو آسانی رہے گی اگر اپریل میں ہو تو مشکلات پیدا ہو جائیں گی اور اگر اپریل کے بعد اجلاس بلانے کا فیصلہ کیا گیا تو میرے لیے حالات پر قابو رکھنا ناممکن ہو جائے گا۔''

اجلاس کا التوا بعض مبصرین کی تحقیق کے مطابق بھٹو اور بھٹو کے حامی جرنیلوں کے ایما پر ہوا۔ یکم مارچ کو ۳ مارچ ۱۹۷۱ء کے قومی اسمبلی 'جلاس کے التوا کا اعلان کر دیا گیا۔ اعلان کے آدھ گھنٹے بعد لوگ ڈھاکہ کی سڑکوں پر نکل آئے۔ بپھرے ہوئے عوام گروہ در گروہ بانس کی لاٹھیاں اور لوہے کی سلاخیں اٹھائے نعرے لگا رہے تھے۔ اس موقع پر مجیب الرحمٰن نے ۲ مارچ ۱۹۷۱ء کو ڈھاکہ میں اور ۳ مارچ کو سارے صوبے میں مکمل ہڑتال کا اعلان کیا۔ تاہم مجیب الرحمٰن کی شخصیت کا دوسرا رخ اسی شام گورنر ہاؤس لے آیا جہاں اس نے اعلیٰ فوجی حکام سے نہایت عاجزانہ انداز میں اپیل کی ''حضور اب بھی وقت ہے کہ مجھے اجلاس کی نئی تاریخ لے دیجیے۔ میں اب بھی صورت حال پر قابو پا لوں گا البتہ اگر غیر معینہ عرصے کے لیے تاخیر ہوگئی تو وقت ہاتھ سے نکل جائے گا۔''

یکم مارچ سے لے کر ۲۵ / مارچ تک مجیب نے ہر قدم پر فوجی جنتا سے تعاون کیا۔ ۷ مارچ کو ان کی تجویز کے مطابق کوئی ایسا اعلان نہ کیا جو بنگلہ دیش کے قیام کی

طرف لے جاتا ہو۔ ۲۵ مارچ انتخابی نتائج کو فوجی بوٹوں تلے روند کر مشرقی پاکستان میں فوجی ایکشن کا اعلان کر دیا گیا اور یوں اس المیے کی طرف تیز رفتاری سے سفر کا آغاز کر دیا گیا جس کی تکمیل ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ہوگئی۔

آج ۳۶ برس بعد بھی پاکستان پر فوجی حکومت ہے جو اپنی من مانی کر رہی ہے۔ آئین ایک بے سہارا بچے کی طرح فوجی حکمرانوں کی طرف دیکھ رہا ہے جو اسے قہر آلود نگاہوں سے گھور رہے ہیں۔ گزشتہ شب میں ایک مذاکرے میں لیفٹیننٹ جنرل (ر) کمال متین الدین، عرفان صدیقی، سپریم کورٹ کے سینئر وکیل محمد اکرام چوہدری کے ساتھ شریک گفتگو تھا۔ جنرل صاحب نے سقوط مشرقی پاکستان کے بارے میں ایک ضخیم کتاب ''Tragedy of Errors'' لکھی ہے۔ ان کی تحقیق کا لب لباب یہ ہے کہ طاقت سے مسئلے حل نہیں ہوتے، پیچیدہ ہو جاتے ہیں۔ عرفان صدیقی کا کہنا تھا کہ ہم نے سقوط ڈھاکہ کے المیے سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا اور ابھی تک ہم غلطیوں پر غلطیاں کئے جا رہے ہیں۔ کبھی بلوچستان میں فوجی ایکشن ہوتا ہے اور کبھی وزیرستان میں فوج اپنے ہی لوگوں کے خلاف ہتھیار اٹھا لیتی ہے۔ محمد اکرام چودھری کا کہنا یہ تھا کہ صرف ایک راستہ ہی پاکستان کی حفاظت کا ضامن ہو سکتا ہے کہ ہم حقیقی معنوں میں آئین کی حفاظت اور پاسداری کا تہیہ کر لیں اور اس کی بالادستی کو تہہ دل سے مان لیں۔ جنرل متین الدین نے کہا سقوط ڈھاکہ کا سب سے بڑا سبق یہ ہے کہ انتخابی فیصلہ کو مان لینا چاہیے۔

❀❀❀❀❀

مشرقی پاکستان میں پاکستانی فوج......حقائق کیا ہیں

جناب سکندر خان بلوچ لکھتے ہیں:

اے۱۹ء کی جنگ پر کچھ کتابیں فوجی افسران نے لکھیں لیکن وہ زیادہ تر جنگی نکتہ نظر سے لکھی گئیں۔ خاص کر جنگ کے ان سیکٹرز کے متعلق جن میں وہ تعینات تھے چند ایک سویلین نے اس ضمن میں کوششیں کیں لیکن وہ محض اخباری رپورٹوں کی مدد سے واقعات کی تفصیل ہے۔ کسی صحیح سکالر کی کتاب تا حال میری نظر سے نہیں گزری جو حالات کی تہہ میں جا کر حالات و واقعات کا صحیح تجزیہ پیش کرے۔

ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ شائد ہم نے میدان جنگ میں بھارت سے اتنی شکست نہیں کھائی جتنی میڈیا اور پروپیگنڈا کے محاذ پر کھائی ہے۔ اے۱۹ء کی جنگ بھی موثر میڈیا کی کلاسک مثال ہے۔ بھارتی میڈیا نے ہمارے خلاف ایسے ایسے الزامات لگائے جو انسانی بس میں ہی نہیں تھے، پاکستان کو منظم طریقے سے بدنام کیا۔ محیر العقول قسم کے الزامات لگا کر پوری دنیا کو ہمارے خلاف کر دیا اور بالآخر پاکستان کو دولخت کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ پاکستانی فوج کے خلاف تین بڑے الزامات لگائے گئے اول یہ کہ تیس لاکھ بنگالیوں کو فوج نے بے دردی سے قتل کیا۔ دوم تین لاکھ عورتوں کی آبروریزی کی اور سوم یہ کہ گاؤں کے گاؤں جلا دیئے' یہی کچھ بھارتی میڈیا نے بین الاقوامی میڈیا کا فیڈ کیا اور بین الاقوامی میڈیا نے بغیر تفتیش کئے پاکستان کے تشخص کو اس برے طریقے سے مسخ کیا کہ ہم پوری دنیا میں نہ صرف تنہا رہ گئے بلکہ پوری دنیا کی نفرت کا شکار بنے۔ سب سے پہلا کام تو بھارتیوں نے یہ کیا کہ اس ساری بغاوت کو''جنگ آزادی'' کا نام دیا اور اس لفظ نے ہمیں محرم سے مجرم بنا دیا۔

بنگلہ دیش کے ایک مشہور اسکالر ڈاکٹر عبدالمنعم چودھری نے''جنگ آزادی'' پر

اپنی مشہور کتاب ''Behind The Myth of 3 Million'' میں لکھا ہے کہ مجیب الرحمٰن جب جنگ کے بعد مغربی پاکستان سے رہا ہوئے اور ۸ جنوری ۱۹۷۲ء کو ڈھاکہ آنے کے لیے لندن پہنچے تو انہوں نے وہاں بیان دیا ''بنگلہ دیش میں دس لاکھ افراد مارے گئے ہیں'' لیکن دس جنوری کو جب ڈھاکہ پہنچے اور بھارتی ایجنسیوں سے ملے تو انہوں نے اپنا بیان تبدیل کر لیا اور کہا ''اس جنگ میں تیس لاکھ آدمی مارے گئے ہیں اور تاریخ میں آزادی کے لیے اتنی عظیم قربانی کی مثال کہیں نہیں ملتی'' پھر اس دن جب ایجنسیوں نے مزید برین واش کیا تو جناب مجیب الرحمٰن نے اپنے بیان میں مزید اضافہ کیا اور فرمایا کہ ''تیس لاکھ آدمی قتل ہوئے اور تین لاکھ عورتوں عزتیں برباد کی گئی ہیں۔'' یہ بیسویں صدی کا سب سے بڑا جھوٹ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستانی فوج وہاں پر غیر ملک میں نہیں بلکہ اپنے ہی ملک میں تعینات تھی اور اپنے ملک میں چاہے حالات جیسے بھی ہوں اتنی بڑی گھناؤنی کاروائی کرنا ممکن نہیں۔ نہ فوج کو اس مقصد کے لیے تیار کیا جاتا ہے اور نہ اسے اس قسم کے جرائم کی اجازت دی جاتی ہے۔

۱۲ مارچ ۱۹۷۱ء تک مشرقی پاکستان میں مغربی پاکستان کی کل فوج کی تعداد محض ایک ڈویژن یعنی بارہ ہزار نفوس سے زیادہ نہ تھی۔ ان میں ایک بڑی تعداد بنگالیوں کی بھی شامل تھی۔ ان میں لڑاکا فوج کے جوانوں کی تعداد زیادہ سے زیادہ ۸ ہزار تھی باقی سب سروسز کے لوگ تھے، جب مارچ میں تحریک سول نافرمانی شروع ہوئی اور مکتی باہنی کے تربیت یافتہ غنڈوں نے مغربی پاکستان کی فوج اور سویلین آبادی کو تہہ تیغ کرنا شروع کیا تو فوج کی طاقت محض یہی کچھ تھی۔ ان کے مقابلے میں ایک لاکھ لڑاکا تربیت یافتہ ایسٹ بنگال رجمنٹ، ایسٹ پاکستان سول آرمڈ فورسز اور ایسٹ پاکستان رائفلز کے لوگ موجود تھے۔ مشرقی پاکستان پولیس اس کے علاوہ تھی اور یہ سب بنگالی تھے۔ بھارت کی ایسٹرن کمانڈ کے چیف آف جنرل اسٹاف جنرل جیکب جو بھاتی جنگی

منصوبہ بندی کے منتظم اعلیٰ بھی تھے کے مطابق تقریباً ڈیڑھ لاکھ کے قریب بھارت میں مکمل تربیت یافتہ اور مسلح مکتی باہنی اور ان کے ساتھ ہزاروں کی تعداد میں مغربی بنگال کے گوریلا موجود تھے جو مختلف مقامات پر گھیراؤ جلاؤ کے لیے بھیجے گئے تھے۔ یہ لوگ پورے علاقے میں مختلف راستوں سے مغربی پاکستان، پاکستان کو پسند کرنے والی بنگالی آبادی اور سب سے بڑھ کو بہاری آبادیوں سے پوری طرح واقف تھے۔ ان لوگوں نے مغربی پاکستانیوں کے لیے پرو پاکستانی بنگالیوں کے لیے اور خاص کی بہاریوں کے لیے قیامت ڈھا دی۔ ان کی دکانیں جلا دی گئیں۔ مردوں کو قطاروں میں کھڑا کر کے مار دیا گیا۔ عورتوں کی برے طریقے سے آبروریزی کے بعد رائفل کی سنگینوں سے پیٹ چاک کیے گئے اور ملٹری ایکشن سے پہلے تک جو اعداد و شمار سامنے آئے ان کے مطابق ۱۵ ہزار محب وطن پاکستانی سانتاہار کے علاقے میں' ۱۰ ہزار چٹا گانگ کے علاقے میں' ۹۰۰ سراج گنج کے علاقے میں اور ۲ ہزار میمن گنج کے علاقے میں شہید کر دیئے گئے باقی علاقوں کی حالت اس سے مختلف نہ تھی۔ شہید ہونے والے تمام لوگ مغربی پاکستانی بہاری اور پاکستان پسند بنگالی تھے۔ یہ سب قتل پاکستان کے ذمے لگائے گئے۔ بڑی حیران کن بات ہے۔ کیا پاکستانی فوج پاگل ہو گئی تھی کہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنے لوگوں کو شہید کرتی؟ نہیں! ہرگز نہیں۔ یہ تمام کاروائی بھارت کی تربیت یافتہ مکتی باہنی نے کی اور اس کا الزام پاکستانی فوج پر لگا دیا گیا جس کی بیرونی میڈیا میں خوب تشہیر کی گئی۔

جب ایسٹ بنگال رجمنٹ اور ایسٹ پاکستان رائفلز نے ہتھیاروں سمیت بغاوت کی تو انہیں پاکستانی فوج کے ٹھکانوں کا پوری طرح علم تھا جہاں کہیں پاکستانی فوج کی چھوٹی ٹکڑیاں تھیں، انہیں بے دردی سے مار دیا گیا۔ مثلاً پبنہ میں ۳۰۰ جوان اور کشتیا میں ۱۵۰ جوان بے دردی سے اڑا دیئے گئے۔ کرنل عبدالرشید جنجوعہ ایک

ایسٹ بنگال رجمنٹ کی کمان کر رہے تھے میجر ضیاء الرحمٰن سابق صدر بنگلہ دیش نے رات کو انہیں اپنے بنگلے سے پکڑا، باندھ کر دفتر لایا، اپنے دفتر میں کرسی پر بٹھا کر سنگین سے چھلنی کر دیا۔فوجدار ہاٹ کیڈٹ کالج کے پرنسپل کرنل فضل حق کے بنگلے پر رات کو حملہ کیا گیا اور ان کے اپنے بنگالی اردلی نے ان کے پیٹ میں چاقو کے وار کیے۔اس قسم کے بے شمار کیس رونما ہوئے جن کا تاریخ میں کہیں بھی ذکر نہیں۔ ان لوگوں کو جہاں کہیں بھی موقع ملا بے وردی سے مغربی پاکستانیوں، پرو پاکستانیوں اور بہاریوں کو قتل کیا، اسی طرح پتہ چلا کہ ایک میڈیکل کالج کے ہاسٹل میں کچھ مغربی پاکستانی طالبات مکتی باہنی نے پکڑ رکھی تھیں۔ایک کپتان صاحب کو چند سپاہیوں کے ساتھ انہیں بچانے کے لیے بھیجا گیا' جب وہ ہوسٹل کا گیٹ پھلانگ کر اندر داخل ہوا تو دروانے اندر سے بند تھے۔لڑکیوں کے کمرے کا دروازہ توڑ کر اندر گیا تو ۸ میں سے ۴ غائب تھیں اور بقیہ محض انڈر ویئر میں چارپائیوں کے ساتھ بندھی تھیں۔ انہیں ہمارے جوان بستری کی چادروں میں لپیٹ کر حفاظتی ایریا میں لے گئے۔ کپتان صاحب اپنے پر قابو نہ رکھ سکے۔ ہاسٹل کا چکر لگایا کچھ بنگالی نوجوان رائفلوں کے ساتھ پہرہ دے رہے تھے اس نے غصے میں سب کو اڑا دیا اسی طرح ایک جگہ پر اطلاع ملی کہ کچھ بہاری خاندانوں کو مکتی باہنی والوں نے قید کر رکھا ہے۔ ایک میجر صاحب اور کچھ جوانوں بھیجا گیا مگر افسوس کہ ان کے پہنچنے سے پہلے یہ لوگ قتل ہو چکے تھے۔ تمام مردوں کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے عورتیں بالکل ننگی تھیں۔ ریپ کے بعد ان کی چھاتیاں کاٹ دی گئی تھیں حتی کہ معصوم بچوں کو نہ صرف قتل کیا گیا بلکہ ان کے جسم کے سوراخوں میں بانس کے ڈنڈے دے دیئے گئے تھے۔ میجر صاحب یہ سب کچھ دیکر ذہنی توازن کھو بیٹھے۔ انہیں علاج کے لیے سی ایم ایچ بھیجنا پڑا۔ ان حالات کا ذکر تاریخ میں کیوں نہیں کیا گیا؟ ہماری نوجوان نسل کو ان غیر انسانی اور وحشیانہ کاروائیوں

کی تفصیل سے بے خبر کیوں رکھا گیا؟ افسوس تو اس بات کا ہے کہ ان تمام کارروائیوں کے پوری طرح فوٹو لئے گئے فلمیں بنائی گئیں اور پاکستانی فوج کے مظالم کے نام سے بین الاقوامی میڈیا میں تشہیر کی گئی اور نوجوان بنگالیوں میں پاکستانی فوج کے خلاف نفرت پھیلائی گئی۔

اسی طرح بنگالی میجر صفی اللہ ۲ ایسٹ بنگال رجمنٹ کا سیکنڈ ان کمانڈ تھا۔ یہ شخص مغربی پاکستانیوں کے سخت خلاف تھا۔ اس کے بہت پہلے سے بھارتیوں سے رابطے قائم ہو چکے تھے اور باقاعدگی سے اگرتلہ جاتا رہا تھا۔ یہ خفیہ طور پر بنگالی افسروں اور جوانوں کو بھی منظم کرتا رہا۔ مغربی پاکستانیوں کو قتل کرنے اور بغاوت کی باقاعدہ منصوبہ بندی کی۔ ۲۷ مارچ کو اس شخص نے زبردستی یونٹ کی کمانڈ سنبھال لی۔ اس یونٹ کے ساتھ مغربی پاکستان کے چار آفیسرز کچھ جے سی اوز اور تقریباً تیس کے قریب جوان تھے' اس نے ان سب کو گھیر کر شوٹ کر دیا۔ کچھ آفیسرز اور جوانوں نے فیملیز ساتھ رکھی ہوئی تھیں، ان سب کو بے دردی سے بے حرمتی کے بعد ذبح کیا۔ جب مغربی پاکستانی فوج وہاں پہنچی تو بھیانک منظر دیکھ کر جوان اپنے حواس قابو میں نہ رکھ سکے اور پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ ایک نوجوان کپتان کی بیگم مادر زاد ننگی پڑی تھی۔ اس کا پیٹ چاک تھا' پاؤں کٹے تھے، جسم جگہ جگہ سے نوچا ہوا تھا اور اس کا معصوم بچہ اس کی خشک چھاتیوں سے دودھ پینے کی کوشش کر رہا تھا۔ کپتان صاحب خون میں لت پت مردہ پڑا تھا۔ یہی حالت تقریباً باقی فیملیز کی تھی۔

ایک صوبے دار صاحب کی چار جوان بیٹیاں تھیں۔ انہیں گینگ ریپ کے بعد بے دردی سے قتل کر دیا گیا تھا۔ سب کے پیٹ چاک اور انتڑیاں باہر نکلی ہوئی تھیں، گلے میں رسیوں کے ساتھ کارڈ بندھے ہوئے تھے، ''پنجابی کے لیے تحفہ'' میجر جنرل سکھونت سنگھ نے اپنی کتاب ''India's Wars Since independence''

میں لکھا کہ اس یونٹ نے سب سے زیادہ مغربی پاکستانیوں کو قتل کیا۔ اسی طرح میمن سنگھ کیڈٹ کالج میں ایک پنجاب رجمنٹ کے کپتان صاحب بطور ایڈ جوٹنٹ تعینات تھے۔ ان کے گھر پر حملہ کیا گیا۔ خاوند کے سامنے اس کی بیوی کی بے حرمتی کرنے کے بعد اسے ایذائیں دے دے کر ذبح کیا گیا۔ اس کا چھوٹا سا بچہ ماں کی چیخیں سن کر چلاتا رہا لیکن کسی کو رحم نہ آیا۔ ماں کو ختم کرنے کے بعد ان ظالموں نے بچے کو ہوا میں اچھالا اور نیچے بندوق کی سنگین پر روکا۔ تھوڑی دیر کے لیے بچہ تڑپا اور پھر اللہ کو پیارا ہو گیا۔ کپتان صاحب کو پکڑ کر باری باری اس کی ٹانگیں کاٹیں پھر بازو کاٹے اور آخر میں اس کے گلے میں رسی ڈال کر جیپ کے پیچھے باندھ دیا۔ چند منٹوں کے بعد وہ بھی اپنی فیملی سے جا ملا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

۲۷ مارچ کو چٹا گانگ میں ۲ کمانڈو بٹالین کے پچاس آدمی شہید کر دیئے گئے جن میں کمانڈنگ آفیسر سمیت ۳ اور آفیسرز بھی شامل تھے۔ اتنے ہی لوگ زخمی ہوئے۔ فوجی بھی آخر انسان ہیں کوئی فرشتے تو نہیں۔ جب ان کے سامنے ان کی ساتھی، ان کی بیٹیاں، بیویاں بہنیں اسی طرح بے دردی کے ساتھ قتل کی جائیں گی، انہیں گینگ ریپ کیا جائے گا تو وہ اپنے حواس کو کیسے قابو میں رکھ سکتے تھے؟ ان حالات میں انہوں نے یقیناً کچھ مقامات پر بدلے لینے کی کوشش کی اور ان کے خلاف انضباطی کاروائی کی گئی لیکن یہ کہنا کہ پاکستانی فوج اتنے بڑے پیمانے پر قتل و غارت اور آبرو ریزی کی مرتکب ہوئی سراسر بہتان ہے اور ''را'' کا گھڑا ہوا جھوٹ ہے۔

چاہیے تو یہ تھا کہ ہماری حکومت یہ تمام واقعات بین الاقوامی میڈیا کے سامنے لاتی یا بین الاقوامی عدالت میں لے جاتی مگر افسوس کہ بے حس اور نااہل حکومت نہ تو اس وقت کچھ کر سکی اور نہ ہی جنگ ختم ہونے کے بعد ہماری تاریخ کی مشہور ترین جمہوری حکومت۔

یہ تھے مارچ میں حالات جب فوجی ایکشن کا حکم ملا۔ اب ان حالات میں پاکستانی فوج ۳۰ لاکھ آدمی کیسے مار سکتی تھی جبکہ ہر سپاہی کو ہر وقت اپنی جان کا خطرہ تھا اور ہر جوان نے جیب میں حمائل شریف رکھی ہوئی تھی۔ ۲ لاکھ مسلح درندہ صفت بنگالی فوجی، مکتی باہنی اور بھارتی گوریلوں کی موجودگی میں اتنی قتل و غارت اور اتنے ریپ کیسے کر لئے گئے جبکہ فوج کسی ایک جگہ اکٹھی ہی نہ تھی بلکہ چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں ڈیڑھ لاکھ مربع کلومیٹر میں پھیلی ہوئی تھی۔

اس وقت مغربی پاکستان میں تقریباً ۲۵ ہزار کے قریب بنگالی جوان، آفیسرز، سویلین اور ان کی فیملیز موجود تھیں۔ اس خطرے سے کہ یہاں بدلہ لینے کی کوشش نہ کی جائے، تمام حالات و واقعات سے مغربی پاکستان کو بے خبر رکھا گیا، شہدا کی لاشوں کو بھی یہاں نہ لانے دیا گیا۔ قوم کو مکمل اور صحیح حالات سے بے خبر رکھنا بہت بڑا جرم تھا جس کی سزا پوری قوم کو بھگتنا پڑی اور بھارت نے یہ سب کچھ ہماری فوج کے پلڑے میں ڈال کر خوب اچھالا۔ پوری دنیا ہم سے نفرت کرنے لگی اور مغربی پاکستان سے کوئی شخص جواب نہ دے سکا۔ اپنی فوج اپنی ہی قوم کی نظروں میں مجرم بن گئی۔ ہماری میڈیا اور پروپیگنڈہ مہم اتنی بودی اور بے اثر تھی کہ مسلم ممالک بھی ہمیں ہی مجرم سمجھتے تھے۔

مکتی باہنی اور باغی فوجیوں کی فیملیز فوجی ایکشن سے پہلے ہی بارڈر پار بھارت میں رہائش پذیر ہو چکی تھیں جن کی بھارت بہت اچھے طریقے سے دیکھ بھال کر رہا تھا اور پناہ گزینوں کے کیمپوں کی تصاویر دکھا دکھا کر پوری دنیا کو متاثر کرتا رہا اور امداد بٹورتا رہا۔ مسلح باغی مشرقی پاکستان میں افراتفری پھیلانے کے لیے قتل و غارت میں مصروف رہے۔

جب فوجی ایکشن شروع ہوا تو یہ سب باغی بھی بھاگ کر بھارتی کیمپوں میں

چلے گئے۔ان کے پاس نقصان اٹھانے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ پاکستانی فوج چونکہ علاقے اور زبان سے ناواقف تھی اس لیے ان حالات میں سراغ رسانی کا موثر نظام بھی قائم نہیں ہو سکتا تھا اور مکتی باہنی والوں کا خوف اتنا تھا کہ کوئی بھی بنگالی یا بہاری ان کی یا ان کے گھروں کی نشاندہی کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔اس لیے ان کے خلاف کسی قسم کی کاروائی ممکن نہ تھا۔اس کے برعکس وہ دریاؤں کے ذریعے چپکے سے مشرقی پاکستان میں داخل ہوتے ،قتل و غارت کی کاروائیاں کر کے روپوش ہو جاتے۔ ہمارے لیے انہیں تلاش کرنا ممکن ہی نہیں تھا نہ ہم ان کی کاروائیوں کو روک سکتے تھے۔

فوجی کاروائی کے بعد مغربی پاکستان سے مزید فوج ،ٹیکنیکل لوگ، پولیس اور کچھ ریٹائرڈ ریزروسٹ وہاں بھیجے گئے۔ یہ لوگ بالکل ہی علاقے سے، نئے ماحول سے اور سب سے بڑھ کر زبان سے ناواقف تھے۔ پولیس والوں کو مکتی باہنی والوں نے چن چن کر مارنا شروع کیا بلکہ ان لوگوں کی حفاظت ایک مسئلہ بن گئی لہٰذا ان لوگوں کو مکتی باہنی کے حملوں سے بچانے کے لیے کچھ اہم علاقوں میں فوجی یونیفارم پہنانا پڑی۔ اس لیے یہ لوگ بھی ہتھیار ڈالنے والوں میں فوجی شمار ہوئے۔

مارچ میں جب فوجی کاروائی ہوئی تو اس وقت سے لے کر دسمبر تک پاکستانی فوج کی تعداد مع پولیس تقریباً ۶۰ ہزار تک پہنچ سکی۔ ان ۶۰ ہزار میں لڑاکا فوج محض ۲۵ ہزار تھی۔ ان ۲۵ ہزار میں بھی ایک معقول تعداد ریٹائرڈ اور بوڑھے فوجیوں کی تھی جو وہاں بھیجے گئے تھے۔اس تمام فوج کو سختی سے حکم دیا گیا تھا کہ نظم ونسق بحال کریں۔ انہیں یہ بھی سختی سے حکم تھا کہ کسی شخص پر فائر نہ کریں مبادا کہ وہ پرو پاکستانی ہو اور بھارت کو پروپیگنڈے کا موقع مل جائے۔ ساتھ یہ بھی خوف تھا کہ گولی چلانے سے عداوت بڑھے گی جو متحدہ پاکستان کے لیے نقصان دہ ہوگی۔فوج نے اپنی طرف سے آخری لمحے تک کوشش کی کہ سول سوسائٹی کا ڈھانچہ برقرار رہے اور کوئی ایسی کاروائی نہ

کی جائے جس سے نفرت مزید بڑھے۔ مغربی پاکستان میں خبروں کی بلیک آؤٹ بھی اسی سلسلے کی کڑی تھی۔ بہر حال جو کوئی بھی ایسے جرائم کا مرتکب ہوا تھا اسے یقیناً سخت سزا ملنی چاہیے تھی۔ اب ان حقائق کی روشنی میں بنگلہ دیشی الزامات پر ایک دفعہ نظر ڈال لیں۔ تیس لاکھ قتل اور تین لاکھ ریپ، مندرجہ ذیل واقعات غور طلب ہیں:

۱...... دوسری جنگ عظیم ۶ سال جاری رہی اور کم و بیش ۲۹ ممالک نے حصہ لیا بہت سے ممالک تباہ ہوئے بلکہ روندے گئے۔ آرٹلری، ٹینک، ائرفورس حتی کہ ایٹم بم تک استعمال ہوئے فوجیں تباہ ہوئیں پھر بھی اس جنگ کی کل ہلاکتیں تقریباً تین کروڑ پنتیس لاکھ تھیں۔ بالفاظ دیگر دو لاکھ اموات فی ملک سالانہ۔ اس میں سے آدھے سویلین تھے اور آدھے فوجی یعنی ایک لاکھ سویلین جبکہ مشرقی پاکستان کا فوجی ایکشن محض ۹ ماہ جاری رہا۔ اس ایکشن کا مقصد محض امن وامان بحال کرنا تھا نہ کہ قتل و غارت اور ریپ کرنا۔ قتل وغارت سے نفرت تو بڑھ سکتی ہے لیکن امن قائم نہیں ہوسکتا۔ مزید یہ کہ پاکستانی فوج کے پاس معمولی آرٹلری اور انفنٹری کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ کیا دنیا میں کہیں بھی ایسی مثال ممکن ہے۔ کہ امن وامان قائم کرنے کے لیے چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں پھیلی ہوئی فوج محض بندوقوں سے تیس لاکھ انسان مار دے اور تین لاکھ ریپ کرے اور وہ بھی اپنے ملک میں ہرگز نہیں۔

۲...... مکتی باہنی، ایسٹ بنگال رجمنٹ اور ایسٹ پاکستان رائفلز کے لوگ مکمل طور پر تربیت یافتہ اور مسلح تھے جو بنگلہ دیش کے چپے چپے پر موجود تھے۔ چونکہ وہ مقامی لوگ تھے اس لیے موثر طریقے سے گوریلا کارروائیاں کر رہے تھے۔ مزید مدد کے لیے ہندوستانی فوج اور فوجی گوریلے بھی موجود تھے جو مکتی باہنی کی رہنمائی میں حملے کرتے تھے۔ ان لوگوں کا سراغرسانی موثر نظام بھی موجود تھا۔ ان حالات میں ۲۵ ہزار پاکستانی فوجی اگر ۳۰ لاکھ کو مار دیتے ہیں تین لاکھ ریپ کرتے ہیں تو یہ مافوق

الفطرت قسم کی کاروائی ہوسکتی ہے انسانی، ہرگز نہیں۔

۳......اگر پورے ساٹھ ہزار فوجیوں اور پولیس والوں کو رائفلیں دے کر انسان مارنے پر لگا دیا جائے تو ہر فوجی کو کئی ہزار آدمی روزانہ مارنا پڑیں گے اور کئی عورتیں ہر آدمی کو ہر روز ریپ کرنا پڑیں گی اگر بنگالیوں کے ہاتھ باندھ کر لائن میں کا اکٹھا کھڑا کر دیا جائے تو پھر بھی فی جوان کئی ہزار آدمی روزانہ رائفلوں سے نہیں مار سکتا چہ جائیکہ آزاد لوگوں کو مارنا۔ صرف فاتر العقل انسان ہی اس پر یقین کر سکتا ہے۔

۴...... بنگالی اس علاقے کے مقامی لوگ تھے انہیں فوج کی ہر حرکت کا بخوبی علم تھا فوج جہاں بھی پہنچتی مکتی باہنی شہر خالی کروالیتی تھی۔ لوگ گاؤں یا جنگلوں میں بھاگ کر چھپ جاتے۔ ائر فورس بھی نہیں تھی کہ بم گرا کر لوگ مارے جاتے۔ آرٹلری بھی سویلین کے خلاف کبھی استعمال نہیں ہوئی نہ اس کا الزام بھارت یا بنگلہ دیشیوں نے کبھی لگایا ہے تو پھر اتنی تعداد میں کب کہاں اور کیسے لوگ مارے گئے ہیں؟

۵......اگر اتنے لوگ مارے گئے تھے تو یہ کہاں دفن کئے گئے؟ یقیناً اجتماعی قبریں بنی ہوں گی۔ جنگ کے بعد بنگلہ دیش حکومت یا انٹرنیشنل ایجنسیاں ان قبروں کا کھوج لگاتیں۔ آخر وہ کیوں نہیں ملیں؟ فوج کو اتنا وقت کیسے مل گیا کہ وہ لڑنے یا اپنا دفاع کرنے کی بجائے اجتماعی قبریں کھودتی رہی؟ یقیناً فوج کے پاس اتنا وقت تھا نہ وسائل۔ وہ تو اپنے شہداء کی قبریں نہ کھود سکی چہ جائیکہ تین لاکھ بنگالیوں کی قبریں!

۶......فوجی جو جیبوں میں قرآن حکیم لے کر پھر رہے تھے انہیں ہتھیار ڈالنے تک یقین تھا کہ حالات ٹھیک ہو جائیں گے تو انہیں تین لاکھ عورتیں کہاں مل گئیں؟ جبکہ شہر اور گاؤں خالی تھے اور قرآن کریم جیب میں رکھ کر بھی جنگی ڈیوٹی سے ہٹ کر

ریپ میں کیسے مشغول ہو گئے۔ اگر یہ سچ مان لیا جائے تو ان تین لاکھ عورتوں کے بچے جننے کے لیے موجودہ ہسپتال ناکافی ہوں گے۔ کیا کسی نے ایسا کوئی ریکارڈ پیش کیا ہے کہ جنگ کے ۹ ماہ بعد کتنے بچے پیدا ہوئے؟ اور ان تین لاکھ عورتوں کی آبادکاری کب اور کیسے کی گئی؟

۷...... بنگلہ دیشی اسمبلی کے ممبر کرنل اکبر حسین کے مطابق صرف تین لاکھ لوگوں نے جنگی نقصانات کے لیے کلیم داخل کئے لیکن وزیر خزانہ عبدالمھین کے مطابق صرف ۷۲ ہزار کلیم وصول ہوئے تھے جن میں سے ۲۲ ہزار بوگس تھے۔ صرف ۵۰ ہزار جائز تھے جن کے نقصان کا ازالہ کیا گیا۔ کہاں تیس لاکھ اور کہاں ۵۰ ہزار۔

۸...... ڈاکٹر عبدالمومن چودھرہ کی کتاب کے مطابق حکومت بنگلہ دیش نے ریپ کی گئی خواتین کے لیے ویلفیئر سنٹر کھولے تھے لیکن یہ نہیں بتایا کہ تین لاکھ کے لیے کتنے سنٹر کھلے پھر ان کا کیا ہوا؟ ریکارڈ کے مطابق صرف سو خواتین کی شادی کی گئی تھی باقی کا کیا بنا؟

۹...... عوامی لیگ کے ایک معتبر صحافی کی رپورٹ کے مطابق ۱۶ لاکھ بنگالی بھارتی مہاجر کیمپوں میں مختلف وجوہات کی وجہ سے مر گئے۔ ان کا کیا بنا اور یہ کس کھاتے میں لکھے گئے؟

۱۰...... جیسور کے مقتدر مذہبی رہنما مولانا خوندکر عبدالخیر کے بیان کے مطابق ان کا علاقہ پرامن رہا کچھ گاؤں سے معمولی تعداد میں لوگ بھاگ کر بھارت گئے۔ بہت سے گاؤں میں ایک بھی موت واقع نہیں ہوئی۔ اگر پاکستانی فوج قتل وغارت گری میں مشغول تھی تو یہ علاقہ پرامن کیسے رہا؟

۱۱...... بنگلہ دیش ہی کے ایک مشہور صحافی مسٹر جوہری نے لکھا کہ ”مجھے سمجھ نہیں آئی کہ ۸ ماہ کی معمولی نوعیت کی گوریلا کاروائیوں میں تیس لاکھ لوگ کیسے مارے گئے اور

تین لاکھ عورتوں کی کس طرح عصمت دری کی گئی؟

۱۲......حمود الرحمٰن کمیشن کے مطابق اس جنگ میں صرف ۳۵ ہزار لوگ مارے گئے تھے جبکہ جنرل کمال متین الدین اپنی کتاب ''Tregedy of Error'' میں یہ تعداد ایک لاکھ لکھتے ہیں اور ان میں سے ۸۰ فیصد لوگ مغربی پاکستانی اور بہاری تھے۔

۱۳......''The Daily Telegraph'' کے صفحہ نمبر ۶۱ پر پیٹر گل نے جو تجزیہ پیش کیا ہے وہ کافی حقائق سے قریب تر معلوم ہوتا ہے۔ اس تجزیئے کے مطابق ''پاکستانی فوج ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان میں ایک بغاوت فرو کرنے میں مشغول تھی نہ کہ غیر ملک سمجھ کر اس پر قبضے کے لیے کوشاں تھی۔ اس لیے شیخ مجیب الرحمٰن کے تخیلاتی اعداد و شمار اگر حقائق سے ۵۰ سے ۶۰ گنا زیادہ نہیں ہیں تو کم از کم ۲۰ گنا تو ضرور مبالغہ آمیز ہیں۔ اور پھر اس تمام قتل و غارت کا حساب کہاں ہے جو بنگالیوں (مکتی باہنی) نے کیے؟ دراصل جب ۱۶ دسمبر کو پاکستانی فوج نے ہتھیار ڈالے تو نظم و نسق ختم ہو چکا تھا۔ مکتی باہنی کے لوگ بہاریوں، پرو پاکستانی بنگالیوں اور وہ محبّ وطن بنگالی رضا کاروں جنہوں نے پاکستانی فوج کا ساتھ دیا تھا کے خلاف غصے سے پاگل ہو چکے تھے۔ بوڑھوں بچوں اور خواتین کو گھروں میں بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔ نوجوانوں کو باہر میدانوں میں جمع کر کے بڑے بڑے مجمعوں کے سامنے تالیوں کی گونج میں سنگینوں، چاقوؤں اور چھریوں سے بے دردی سے شہید کر دیا گیا۔ ڈھاکہ اور گرد و نواح میں رہنے والے پرو پاکستانیوں اور بہاریوں کو ڈھاکہ کے پلٹن میدان میں جمع کیا گیا لاکھوں لوگوں کے مجمع کے سامنے انہیں اس بے دردی سے مارا گیا کہ انسانیت کانپ اٹھی بھارتی فوج اور بنگلہ دیش کے رہنما وہاں موجود تھے لیکن ان نہتے، بے بس اور مجبور انسانوں کو بچانے کے لیے کوئی آگے نہ بڑھا۔ انسانیت دم توڑ گئی۔ مکتی باہنی کے لوگ وحشی

بن گئے۔ مختلف گروپ قتل و غارت گری میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے کوشاں رہے۔ ان تمام لوگوں کے گھر اور دکانیں لوٹ کر آگ لگا دی گئی۔ یہ تمام خبریں پوری دنیا کے اخبارات میں چھپیں۔ ٹی وی پر آئیں لیکن ہیومن رائٹس اور یونائیڈ نیشن والے بھی خاموش رہے۔ شائد یہ قتل بھی بعد میں بھارت نے ہمارے کھاتے میں ڈال دیئے۔ قتل و غارت گری کی یہ تصاویر غیر ممالک میں رہنے والے پاکستانیوں نے اپنے عزیز و اقارب کو بھیجیں لیکن یہاں پھر بھی خبروں پر سنسر رہا۔ پوری قوم صحیح حالات سے بے خبر رہی۔ مغربی پاکستان میں اس وقت جو بنگالی تھے وہ یہاں پورے عزت و احترام کے ساتھ آخر تک اپنے گھروں میں پوری مراعات کے ساتھ رہتے رہے۔ ایک بھی بنگالی پر یہاں حملہ نہیں ہوا ہم پھر بھی انہیں بھائی سمجھتے رہے۔ جنگ کے بعد انہیں پوری مراعات کے ساتھ مختلف کیمپوں میں رکھا گیا اور عزت و احترام سے واپس بھیجا گیا۔

✿✿✿✿✿

۱۶ دسمبر...... سقوط ڈھاکہ

ایم ایم حسن صاحب لکھتے ہیں:

مصباح الدین ایک نہایت دیندار شخص تھا اور اپنی طالب علمی کے دوران مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا ایک نہایت سرگرم رکن تھا۔ اس نے تحریک پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا مگر اس بار اس سے مل کر ایک دھچکا سا لگا۔ اس کے تیور بدلے ہوئے اور وہ چھوٹتے ہی بولا ''پھر آ گئے حکمرانوں کے نمائندے!''

عصبیت کا زہر جب انسان کے رگ وپے میں سرایت کر جاتا ہے تو اس کی عقل اس درجہ مفلوج ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے بدترین اور کریہہ افعال کے جواز میں بھی دلیلیں تلاش کر لیتا ہے۔ جب مصباح الدین جیسے متوازن اور دیندار شخص کی یہ ذہنی کیفیت تھی تو ایک عام بنگالی کے خیالات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ سابق صدر پاکستان جنرل یحییٰ خان مرحوم نے ۱۹۷۰ء میں ون یونٹ توڑ کر ''ایک شخص ایک ووٹ'' کی بنیاد پر عام انتخابات کرائے تھے اور یہ دعویٰ کیا تھا کہ یہ انتخابات پاکستان کی تاریخ میں سب سے زیادہ ستھرے اور منصفانہ تھے۔ ان انتخابات میں شیخ مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ نے قومی اسمبلی میں اکثریت حاصل کی تھی مگر مغربی پاکستان میں بھٹو کی پیپلز پارٹی کا پلا بھاری تھا۔ جب بھٹو کے زیر اثر جنرل یحییٰ خان نے بنگالیوں کو اقتدار منتقل کرنے سے گریز کیا تو مشرقی پاکستان میں فسادات کی آگ بھڑک اٹھی۔ قیام پاکستان کے بعد ایک مدت تک مشرقی پاکستان کی فضا نہایت خوشگوار تھی اور بنگالیوں میں تعصب نہ تھا بلکہ بہت سے بنگالیوں نے قومی یکجہتی کی خاطر اپنی اولاد کو اردو کی تعلیم دینی شروع کر دی تھی اور ہمارے بعض ملنے والے فخر کے ساتھ اپنے بچوں کو میری بیوی کے سامنے پیش کرتے تھے اور کہتے''

دیکھیے یہ کیسی شستہ اردو بولتے ہیں'' مگر یہ ہماری بدنصیبی تھی کہ رفتہ رفتہ مغربی پاکستان کے ساتھ تعلقات کشیدہ ہونے لگے۔ کسی حد تک بنگالیوں کی شکایتیں حق بجانب تھیں۔ اگرچہ پاکستان اسلام کے نام پر وجود میں آیا تھا مگر عملی طور پر اسلامی معاشرتی عدل وانصاف، اخوت اور مساوات کی قدریں مفقود تھیں۔ بنگالیوں کو یہ شکوہ تھا کہ انہیں اپنی آبادی کی مناسبت سے ملازمتوں میں اور وسائل ورقوم کی تقسیم میں جائز حصہ نہیں ملتا تھا۔ پھر اکثر اعلیٰ افسران جو مغربی پاکستان سے تعینات کیے جاتے تھے وہ بنگالی بھائیوں کے ساتھ حقارت سے پیش آتے تھے اور اپنے آپ کو کوئی برتر مخلوق تصور کرتے تھے وہ عام طور پر ان کے ساتھ میل جول سے گریز کرتے تھے۔ مغربی پاکستان کے خلاف نفرت کا جذبہ ابھارنے میں بھارتی پروپیگنڈہ اور تعلیمی اداروں کے ہندو اساتذہ کا بھی بڑا عمل دخل تھا۔ ایسے معلم مشرقی پاکستان کے سکولوں اور کالجوں میں بھاری تعداد میں موجود تھے جو مشنری جذبے کے ساتھ معصوم طالبعلموں کی ذہنی آلودگی میں مصروف تھے۔ انہیں یہ بتایا جاتا تھا کہ ان کے لیے آزادی کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ وہ پہلے انگریز کے غلام تھے اور اب مغربی پاکستان کے لوگ ان پر حکومت کرتے ہیں اور اسلام کے نام پر ان کا استحصال کیا جا رہا ہے، اس طرح چوبیس برس کے علاقے میں جو نسل پروان چڑھی تھی اس کے دل میں اپنے مغربی پاکستان بھائیوں کے خلاف عناد پیدا کیا گیا تھا۔

جب عام انتخابات میں اکثریت حاصل کرنے کے باوجود بھی بنگالی اقتدار سے محروم رہے تو بڑھتے ہوئے بھارتی پروپیگنڈے نے ان کے شبہات کو یقین میں تبدیل کر دیا اور وہ سڑکوں پر آ نکلے۔ فوج نے مشرقی پاکستان کا نظم ونسق سنبھال لیا اور مارچ کے اواخر تک حالات قابو میں آگئے تھے۔ محبّ وطن بنگالیوں کا یہ کہنا تھا کہ وہ ایسا وقت تھا جب فوج کو بارکوں میں واپس چلا جانا چاہیے تھا اور حکومت کو اختلافی

مسائل کا کوئی سیاسی حل تلاش کرنا تھا کیونکہ اس زمانے میں عام امن پسند شہری عوامی لیگ کی غنڈہ گردی سے تنگ آ چکے تھے اور تمام کاروبار ٹھپ ہو کر رہ گیا تھا اور خوراک کی شدید تنگی تھی جبکہ سکول کالج مدت سے بند تھے۔ کسی کی جان و مال اور عزت محفوظ نہیں تھی۔ فوج کے طویل قیام کے بعد ظلم و تشدد اور بربریت کی شکایات عام ہو گئیں اور بہت سے بنگالی افسر اور جوان، ایسٹ پاکستان رائفلز اور پولیس کے محکموں سے بھگوڑے ہو گئے۔ انہوں نے بھی بنگالی نوجوانوں کی طرح بھارت میں پناہ لی اور بھارت نے مشرقی پاکستان کی سرحد پر اتنے تربیتی مراکز قائم کر کے پہلے مکتی باہنی کی بنیاد رکھ دی تھی جس میں انہیں شامل کر لیا گیا۔ بنگالی نوجوان کو گوریلا جنگ اور تخریب کاری کی تربیت دی جاتی تھی اور چونکہ مشرقی پاکستان کی بھارت کے ساتھ کوئی قدرتی سرحد نہ تھی اس لیے یہ لوگ اپنے علاقوں میں آسانی سے واپس لوٹ کر سرگرم عمل ہو جاتے تھے۔ میں جب ڈھاکہ پہنچا ان دنوں گوریلا جنگ اپنے شباب پر تھی اور شہر کا کوئی علاقہ اس کی زد سے محفوظ نہ تھا حتی کہ سول لائن میں بھی، جہاں پر ہمارا قیام تھا' اکثر دھماکے ہوتے رہتے تھے۔ کبھی بجلی کا ٹرانسفارمر تباہ ہو جاتا تو کبھی گیس کی لائن اڑا دی جاتی اور کبھی پانی کے ذخیرے کو نشانہ بنایا جاتا۔ پھر ہر روز سویرے دو چار لاشیں سڑک پر پڑی ہوئی نظر آتی تھیں مگر ان تشویشناک حالات میں بھی مشرقی پاکستان کے جی او سی جنرل ''ٹائیگر'' نیازی کے حوصلے بلند تھے اور ان کی طبیعت جولانیوں پر تھی۔

مجھے ان دنوں ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے اسلام آباد جانا پڑ گیا' میں نے ڈائریکٹر انٹیلی جنس بیورو مسٹر رضوی کی بڑی منت سماجت کی اور ان سے عرض کیا کہ اگرچہ پانی سر سے گزر چکا ہے مگر اب بھی اس بات کا کچھ امکان ہے کہ مذاکرات کے ذریعے کوئی سیاسی حل تلاش کیا جا سکتا ہے کیونکہ بنگال کے بزرگ سیاستدان

جنہوں نے ہندوؤں کے مظالم سہے ہیں' اس معاملے میں بھارت کی براہ راست مداخلت کے مخالف ہیں لیکن رضوی صاحب کا ردعمل مایوس کن تھا اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گویا کہ ارباب حکومت نے مشرقی پاکستان کی فاتحہ پڑھ لی تھی۔ ڈی آئی جی اسپیشل برانچ کی حیثیت سے میرا ایک ناگوار فریضہ یہ بھی تھا کہ مجھے ہر منگل کو گورنر ہاؤس میں صوبے کی تازہ ترین سیاسی صورتحال پر تبصرہ کرنا ہوتا تھا۔ اس میٹنگ میں گورنر اور جی او سی کے علاوہ دیگر اعلیٰ' سول اور ملٹری افسران بھی شرکت کرتے تھے۔ ان دنوں جنرل ٹکا خان مشرقی پاکستان کے گورنر تھے۔ وہ مجھ سے کہتے ''ہاں بھئی حسن! تو سنا اپنی گپ شپ'' انہیں میری باتوں پر اعتبار نہ آتا' اگرچہ بعد کے حالات نے وہ تمام حقائق درست ثابت کئے۔ بعد کو جنرل ٹکا خان کی جگہ ڈاکٹر مالک کو مشرقی پاکستان کا گورنر تعینات کر دیا گیا۔ جنرل یحییٰ خان نے شاید یہ سوچا کہ ممکن ہے کہ کوئی بنگالی گورنر حالات پر قابو پانے میں کامیاب ہو جائے اور اس محبّ وطن اور شریف النفس انسان نے ملک کو تباہی سے بچانے کی خاطر یہ کانٹوں بھرا تاج اپنے سر پر پہن لے مگر انہیں اس مصیبت میں گرفتار کرنے کے بعد یحییٰ خان کے پاس ان کے مفید مشورے سننے کے لیے کوئی وقت نہ تھا۔ ڈاکٹر مالک کا یہ شکوہ تھا کہ جب بھی وہ صدر پاکستان سے ٹیلیفون پر کوئی ضروری بات کرنا چاہتے تھے تو انہیں یہ جواب ملتا کہ وہ بے حد مصروف ہیں......

کب مست شراب وعیش و طرب تکلیف توجہ فرمائے
آواز شکست دل ہی تو ہے آواز شکست جام نہیں

جب بھارت نے یہ محسوس کیا کہ مکتی باہنی کے دل باوجود ان کی تربیت' پشت پناہی اور ان کے فوجی افسران کی در پردہ قیادت کے پاک افواج کا مقابلہ کرنے سے قاصر ہیں تو اس نے یہ تکلف برطرف کرتے ہوئے ۲۰ نومبر کو جیسور پر اپنی پوری

قوت کے ساتھ حملہ کر دیا بھارت نے اپنی اس کھلی جارحیت کے ذریعے پاکستان پر جنگ مسلط کر دی اور اسے بھی مجبوراً جوابی کاروائی کرنی پڑی، یوں پورے مشرقی پاکستان کو جنگ کے شعلوں نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ بھارتی فضائیہ نے جنگ کے آغاز میں ہی بمباری کر کے ڈھاکہ ائیرپورٹ کا ناکارہ کر دیا تھا اور مشرقی پاکستان میں ہماری فضائیہ کا مختصر سا دستہ ایک عضو معطل ہو کر رہ گیا تھا، چونکہ شہر کے حالات انتہائی مخدوش ہو چکے تھے اس لیے گورنر نے ہمیں یہ مشورہ دیا کہ ہم سب گورنر ہاؤس منتقل ہو جائیں کیونکہ وہاں پر فوج کا کڑا پہرا تھا۔ چنانچہ ۸ دسمبر کو ہم سب وہاں پہنچ گئے۔ اگلے روز میرے ایک پرانے مہربان ریٹائرڈ بنگالی پولیس افسر عبدالحق نے یہ اطلاع دی کہ انہیں مکتی باہنی کے معتبر ذرائع سے یہ خبر ملی ہے کہ بھارتی فوج نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ ڈھاکہ کے مضافات میں پہنچ کر مکتی باہنی کو آگے کر دیں گے تاکہ ڈھاکہ کی فتح کا سہرا اس کے سر رہے اور یوں اسے غیر بنگالیوں کے قتل عام کا موقع بھی فراہم ہو جائے گا لیکن انہوں نے اطمینان دلایا تھا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے کیونکہ انہوں نے ہمارے بچاؤ کی تدبیر سوچ لی ہے ان کی اس تسلی کے باوجود ہم سخت پریشانی میں مبتلا تھے مگر بعد کو ان کا یہ پیغام ملا کہ بھارتی فوج کے مذموم عزائم کی بھنک انٹرنیشنل ریڈ کراس کمیٹی کے عملداروں تک پہنچ گئی ہے اور انہوں نے بین الاقوامی سطح پر دباؤ ڈال کر ان کے ناپاک عزائم خاک میں ملا دیئے ہیں، اس دوران مغربی پاکستان سے موصول ہونے والے پیغامات میں برابر یہ تسلیاں دی جا رہی تھیں کہ شمال کی جانب سے بڑا بھائی (چین) مدد کو پہنچ رہا ہے اور جنوب میں امریکی چھٹا بحری بیڑا حرکت میں آگیا ہے۔ بھارتی فوجیں ڈھاکہ کے مضافات میں پہنچ چکی تھی اور بھارتی توپخانے کی گھن گرج گورنر ہاؤس میں صاف سنی جا سکتی تھی، اب وہ علاقہ بھی غیر محفوظ ہو گیا تھا۔ ۱۴ دسمبر کو گورنر

ڈاکٹر عبدالمالک نے یہ فیصلہ کیا کہ ہم سب ہوٹل انٹر کونٹیننٹل منتقل ہو جائیں کیونکہ پورے شہر میں ہمارے لیے وہی ایک پناہ گاہ رہ گئی تھی۔ وہاں پر انٹرنیشنل ریڈ کراس کمیٹی کی نگرانی میں اقوام متحدہ کی فوج کا پہرہ تھا۔ چنانچہ ہم سب لوگ مع ڈاکٹر عبدالمالک کی جرمن بیوی کے اس عمارت میں منتقل ہو گئے۔ بالآخر ۱۶ دسمبر کی وہ منحوس گھڑی آن پہنچی جب بھارت کی ہندو اور سکھ سینا کے مسلح دستے اسلامی جمہوریہ پاکستان کے مشرقی بازو کو روندتے ہوئے فاتحانہ شان سے ڈھاکہ کے گلی کوچوں میں داخل ہونے لگے۔ یہ وہی ڈھاکہ تھا جو صدیوں اسلامی تہذیب و ثقافت کا گہوارہ رہا تھا۔ اسی سرزمین میں پاکستان کی خالق مسلم لیگ کی بنیاد رکھی گئی تھی اور اسی ارض وطن نے وہ اکابرین پیدا کیے تھے جنہوں نے برصغیر کے مسلمانوں کو انگریز اور ہندو کے تسلط سے آزاد کرانے میں اہم کردار ادا کیا تھا مگر آج ہماری اپنی نادانی نے وہ دن دکھایا تھا کہ وہاں پر بسنے والے ہمارے مسلمان بھائی ہندو افواج کی پذیرائی بطور نجات دہندہ کر رہے تھے۔ جب شام کے وقت تین بھارتی ٹینک ہوٹل انٹر کونٹیننٹل کے سامنے نمودار ہوئے تو ہمارے بنگالی بھائیوں نے ان کا پرجوش استقبال کیا اور ان کے حق میں اور پاکستان کے خلاف خوب نعرے لگائے اور میری چشم گنہگار نے یہ ناپاک منظر بھی دیکھا کہ مسلمان دوشیزاؤں نے ہندو اور سکھ فوجیوں کے گلے میں پھولوں کی مالائیں ڈالیں اور پھر ان پر گلاب کی پنکھڑیاں نچھاور کیں اور پھر فرط عقیدت سے ان کے منہ بھی چومے......

ہاں میری چشم گنہگار نے یہ بھی دیکھا

علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید اور سقوط ڈھاکہ

آپ باضابطہ طور پر میدان سیاست میں اس وقت داخل ہوئے جب سقوطِ

مشرقی پاکستان کا المناک سانحہ رونما ہوا۔ اس سانحہ نے آپ کے جذبات کی دنیا میں تلاطم پیدا کر دیا تھا۔ آپ اتنے مضطرب ہوئے کہ آپ نے نظری سیاست کو ترک کر کے عملی سیاست میں کودنے کا ارادہ کرلیا۔ جب مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بنا تو اس وقت ابتسام الٰہی ظہیر کی عمر بمشکل چار ماہ تھی۔ اور یہ ان کا پہلا بیٹا تھا۔ اس کی پیدائش پر علامہ مرحوم نے بڑی خوشی اور مسرت کا اظہار کیا تھا۔ اور غالباً اسی مسرت اور خوشی کی نسبت سے ان کا نام ابتسام یعنی مسکراہٹ رکھ دیا تھا۔ لیکن بنگال کے علیحدہ وطن بننے پر آپ اتنا مغموم ہوئے کہ آپ نے بے ساختہ یہ کہا تھا۔

میرا ایک ہی بیٹا ہے اگر کٹ جاتا مر جاتا تو مجھے اتنا افسوس نہ ہوتا جتنا آج مشرقی پاکستان کی علیحدگی پر ہوا ہے۔ آپ نے سقوط ڈھاکہ کے موقع پر چینیا والی مسجد لاہور میں جو خطبہ ارشاد فرمایا تھا اس میں آپ نے یہ کہا تھا۔

> مسجدیں تمہیں بلاتی رہیں، منبر و محراب تمہیں آواز دیتے رہے، رب کا قرآن تمہیں روکتا رہا، رسول اللہ ﷺ کا فرمان تم کو ٹوکتا رہا، لیکن تم نے ہر چیز کو پامال کر دیا اور نتیجتاً تم خود پامال ہو کر رہ گئے ہو۔

خطبہ کا ایک دوسرا مقام ملاحظہ ہو

> آج ڈھاکہ کی مسجد بیت المکرّم اپنی ماں کعبۃ اللہ کو کہہ رہی ہوگی اے میری ماں آج مجھ کو تیرے رکھوالے اغیار کے حوالے کر کے بھاگ نکلے ہیں۔

ذوالفقار علی بھٹو

سقوط ڈھاکہ کے بعد جنرل یحییٰ خان کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔ بعد ازاں عوامی نمائندے ذوالفقار علی بھٹو نے ۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو صدرِ مملکت اور چیف مارشل

لاء اینڈ منسٹریٹر کا عہدہ سنبھالا۔ بھٹو حکومت کی مرکزی کابینہ میں نور الامین، ڈاکٹر مبشر حسن، محمود علی قصوری، ملک معراج خالد، شیخ رشید، غلام مصطفیٰ جوتوئی، عبدالحفیظ پیرزادہ، محمد حنیف اور راجہ تری دیو رائے شامل تھے۔ جبکہ صوبوں میں ممتاز علی بھٹو کو گورنر سندھ، غلام مصطفیٰ کھر کو گورنر پنجاب، غوث بخش رائیسانی کو گورنر بلوچستان اور حیات محمد شیر پاؤ کو گورنر سرحد مقرر کیا گیا۔

۱۹۷۳ء کا آئین

ذوالفقار علی بھٹو نے ایک نیا دستور مرتب کیا جو ملک میں ۱۴ راگست ۱۹۷۳ء کو نافذ کیا گیا اس کے تحت فضل الٰہی چوہدری بطور صدر مملکت اور بھٹو نے بطور وزیر اعظم حلف اٹھایا۔

بھٹو صاحب کی اقتدار حاصل کرنے کی خواہش ان کی ضد اور ہٹ دھرمی سے پوری تو ہوگئی لیکن وہ حکومت کو چلا نہ سکے اور نہ ہی عوام سے روٹی، کپڑا اور مکان دینے کے جو حسین وعدے انہوں نے کیے تھے وہ وعدے وفا کر سکے۔ انہوں نے اپنے دور اقتدار جو کہ ۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء سے ۵ جولائی ۱۹۷۷ء تک بنتا ہے۔ میں اپنے کارکنوں اور اراکین قومی و صوبائی اسمبلی کو کھلی چھٹی دے رکھی تھی۔ ان کے وزراء بھی کسی سے پیچھے رہنے والے نہ تھے اور جب چاہتے، جہاں چاہتے اندھیر نگری مچاتے پھرتے۔ پیپلز پارٹی کے دور اقتدار کے بارے میں ۱۲ جون ۱۹۷۲ء کے روزنامہ امروز کی اشاعت نے جو خبر شائع کی اس سے اس دور میں پیپلز پارٹی کے اراکین قومی و صوبائی اسمبلی اور دیگر عہدے داروں کے بہیمانہ، افسوسناک اور شرمناک مظالم کی نشاندہی ہوتی ہے۔ جو انہوں نے معصوم لڑکیوں اور دیگر عوام پر ڈھائے۔ سمن آباد لاہور سے دن دیہاڑے دو طالبات کو پیپلز پارٹی کی اعلیٰ قیادت

کے ایک رکن کے ایما پر اغوا کروایا گیا۔ اس کے علاوہ بھی پارٹی کے جیالوں کے مظالم سے متعلق ایک اور اخبار روزنامہ نوائے وقت کی ۲۱/ جون ۱۹۷۲ء کی اس خبر سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔

"پیپلز پارٹی کے کارکنوں کا بسوں پر پتھراؤ خواتین کے برقعے اتار لیئے۔

مندرجہ بالا چند خبروں سے اندازہ لگانا کافی آسان ہے کہ اس دورِ حکومت میں "عوام کتنے مطمئن اور پرسکون تھے۔" عوام جو کہ پہلے ہی پاکستان کے دو ٹکڑے ہونے پر بددلی اور مایوسی کا شکار تھے۔ انہیں ایسی حکومت سے زخموں پر مرہم رکھنے کی کوئی توقع نہ تھی، جس حکومت کے سربراہ کا بذاتِ خود ان کو زخم لگانے میں اہم رول تھا۔ حالات پہلے ہی اس قدر بھیانک اور مایوس کن تھے اوپر سے حکمران طبقے نے اور ہی لوٹ مار مچانے کے ساتھ ساتھ عوام کو ظلم کی چکی میں پسنے کے لیے ہر روز کوئی نہ کوئی شوشہ کھڑا کیا ہوتا اور یہ کہنا بجا ہوگا کہ اس وقت کی تاریخ کا مطالعہ کرنے کے بعد انسان اسی نتیجے پر پہنچتا ہے کہ اس دور کو پاکستان کی تاریخ کا ایک سیاہ باب کہا جا سکتا تھا۔ جب ہر طرف شریف انسان کی پگڑی اچھالی جاتی تھی وہ سر اٹھا کر چل نہیں سکتا تھا۔ ایسا دور جس میں نہتے طلباء کو برہنہ کر کے ان پر مظالم ڈھائے جاتے، ایسا دور جس میں کراچی میں مزدوروں کو گولیوں کا نشانہ بنایا گیا۔ اس کے علاوہ خواتین کی تذلیل اس دور کی روایت تھی۔ ترقی پسندی کے نام پر عورت کو شرم وحیاء کے زیور سے محروم کیا جا رہا تھا۔ فحاشی وعریانی عام تھی۔ ایسے حالات پر احتجاج کرنے والی خواتین پر نتھ فورس (جو کہ ذوالفقار علی بھٹو نے خود بنوائی تھی) چھوڑ دی جاتی۔ جو خواتین پر ڈنڈے برساتی ان کے بالوں کو نوچتی۔ یہ وہ دور تھا جب اردو جو کہ ہماری قومی زبان ہے اس کے حامیوں پر پولیس سے

تشدد کروایا جاتا۔ اس طرح لسانی مسئلہ پیدا کر دیا گیا۔ یہ وہ دور تھا جب سندھ میں آباد کار غیر سندھیوں کے ساتھ انتہائی ظالمانہ سلوک کیا گیا۔ اس طرح صوبائی تعصب کو ہوا دی گئی۔ علماء کی تذلیل کی گئی۔ مساجد کی بے حرمتی کی گئی۔ جس کی ایک مثال مسلم مسجد لاہور کے ساتھ کیا تھا۔ شرمناک اور رولا دینے والا سلوک ہے۔ مسجد کی بالکونی سے قرآن پڑھتے ہوئے بچوں کو نیچے گرا دیا گیا۔ پولیس جوتوں سمیت اللہ کے گھر کے اندر چلی گئی۔ اور کعبے کی بیٹی کی بے حرمتی کی گئی۔ یہ کیسا منحوس دور تھا جب اللہ کے گھر کو بھی نہیں بخشا گیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کوئی مسلمان تو ایسا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ تو پھر یہ کون لوگ تھے؟

اسی دور میں صحافیوں کے ساتھ انتہائی برا سلوک کیا جاتا تھا۔ پیپلز گارڈ کے ذریعے صحافیوں پر حملے کروائے گئے۔ غرض کہ یہ ایک ایسا دور تھا جس میں حکومت کے ظلم سے کوئی بھی نہیں بچ سکا سوائے ایک طبقے کے جو حکومت کا اپنا تھا۔ یعنی پیپلز پارٹی والے۔ لیکن ان سب حالات کے باوجود دعویٰ پھر بھی جمہوریت کا کیا جاتا تھا کہ عوام کی اپنی حکومت ہے، جمہوریت ہے۔ لیکن یہ کیسی جمہوریت تھی کہ جس میں مخالف پارٹیوں کے اراکین پر مظالم ڈھائے گئے۔ جمہوریت میں تو ایسا کوئی تصور نہیں ہے۔ بلکہ اس میں تو حزب مخالف کی بھی سنی جاتی ہے۔ اسے برداشت کیا جاتا ہے جبکہ اس دور میں تو مخالفین کی بات سننا تو درکنار ان کو برداشت ہی بہت مشکل سے کیا جاتا تھا اور بعض مواقعوں پر تو مخالفین کو ختم ہی کروا دیا جاتا۔ جس کی مثال نواب محمد احمد خان کا قتل ہے۔ مخالفین کو غرض کہ ہر ممکن اذیتوں سے ہمکنار کیا جاتا۔ مندرجہ بالا مظالم جو بھٹو حکومت نے اپنے مخالفین پر ڈھائے کی لمبی فہرست میں سے چند ایک ہیں، جو خود کو عوامی قائد کہلوانے والے کی خود ساختہ فورسز نتھ فورس، (F.S.F) پیپلز گارڈ کے ذریعے نہتے عوام پر ڈھائے گئے۔ اتنے مظالم ڈھانے

کے باوجود اپنی معیاد ختم ہو جانے کے بعد بھٹو نئے انتخابات نہ کرانے پر اڑ گئے جو کہ اصولاً ہو جانے چاہیے تھے۔ یہ وہی ذوالفقار بھٹو تھے جن کے بارے میں فیلڈ مارشل ایوب خان نے ایک موقع پر کہا تھا کہ:

''بھٹو کا رجحان اکھاڑ پچھاڑ اور تباہ کاری کی طرف زیادہ ہے جو کہ اس کی اور قوم کی بد قسمتی ہے۔''

جب ایوب خان نے یہ کہا تھا اس وقت بھٹو اقتدار میں تھے اور بظاہر ان کی شکست کے کوئی آثار نظر نہ آرہے تھے لیکن وقت جو کہ ہمیشہ سچ بات کو ظاہر کر کے رہتا ہے۔ وقت نے یہ بات ظاہر کر دی کہ ایوب خان جس کا پاکستان کی تاریخ میں ایک اپنا مقام ہے اور وہ انتہائی بہادر، ذہین اور تجربہ کار انسان کی حیثیت سے یہ بات کہہ رہے تھے۔ جو وقت کے ساتھ ساتھ واقعی سچ ثابت ہو گئی اور آہستہ آہستہ ہر چیز ان کی اکھاڑ پچھاڑ، ضد، ہٹ دھرمی اور تخریب کارانہ ذہن کی بدولت تہہ و بالا ہو کر رہ گئی۔ وہ اپنی کرتوتوں کی وجہ سے پہلے اقتدار سے محروم کر دیئے گئے اور پھر کال کوٹھڑی تک دھکیل دیئے گئے۔

مقررہ معیاد گزر جانے کے بعد بھی وہ کسی طرح بھی عام انتخابات کے انعقاد کی طرف نہیں آرہے تھے۔ لیکن عوام کے بے حد اصرار پر وہ انتخابات کرانے پر راضی تو ہو گئے لیکن اس میں بھی ان کی ایک چال کارفرما تھی۔ گو کہ انہوں نے انتخابات مقررہ معیاد کے بعد کروا تو دیئے لیکن عام انتخابات میں دھاندلی کی انتہا کر دی تا کہ دوبارہ حکومت انہیں کے پاس آجائے اور یہ سب ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کیا گیا۔ دھاندلی اتنی وسیع پیمانے پر کی گئی تھی کہ اس کا نوٹس بیرونی پریس نے بھی لیا۔ پہلے تو بھٹو یہ بات ماننے پر کسی طرح بھی راضی نہ تھے کہ دھاندلی ہوئی۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ کوئی بھی ان کی بات پر کان نہیں دھر

رہا تو بعد میں انہوں نے خود ہی اقرار کرلیا کہ دھاندلی ہوئی تھی۔ ۱۲/اپریل ۱۹۷۷ء کو انہوں نے فارن پریس کو ایک بیان دیتے ہوئے کہا کہ:

انتخابات میں دھاندلی ہوئی ہے اور یہ دھاندلی کچھ زیادہ ہی پرجوش بیوروکریٹس کے ارکان اور کچھ حاسد قسم کے پارٹی ممبرز اور وزراء نے کی ہے۔''

اگر ان کی نیت دھاندلی کی نہیں تھی اور وہ آزادانہ اور منصفانہ الیکشن کے خواہاں تھے تو انہیں پہلے ہی سے ایسے اقدامات کرنے چاہیے تھے جن سے دھاندلی کو روکا جاسکے۔ لیکن انہوں نے ایسا نہ کیا۔

اگر ان کی نیت صاف ہوتی تو وہ پہلے ہی ایسے اقدامات کرتے اور دھاندلی کو روکنے کے خصوصی احکامات جاری کرتے۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ ان کا ارادہ ہی ابھی کرسی چھوڑنے کا نہیں تھا۔ جو کہ انہیں بہت پیاری تھی بعد میں انہوں نے اپنے بعض بیانات میں بھی اپنی اس خواہش کو بار بار دہرایا کہ کرسی ان کے لیے کیا اہمیت رکھتی ہے۔ انہیں ذرا بھی خیال ہوتا کہ اس طرح دھاندلی سے ملک کی بدنامی ہوگی تو وہ سختی سے ایسے اقدامات کی تلقین کرتے کہ دھاندلی نہ ہونے دی جائے۔ کیونکہ دھاندلی سے پاکستان کی تو بدنامی ہونا ہی تھی ان کی حکومت کی بدنامی بھی لازمی بات تھی لیکن وہ اس طرف مخلص ہی نہ تھے۔ اور نہ ہی انہوں نے دھاندلی کی روک تھام کے لیے کوئی اقدامات کیئے اور نہ ہی کوئی احکامات جاری کیئے۔ حکومت کے اس فعل سے پاکستان کی بہت بدنامی ہوئی۔ عوام جو کہ پہلے ہی پے در پے صدموں میں مایوسی اور بددلی کا شکار تھے جو اسلام سے اور پاکستان سے دل کی گہرائیوں سے محبت کرتے تھے اور جس چمن کی انہوں نے اپنے خون سے آبیاری کی تھی، جس گلشن کا ایک ایک کونا انہوں نے اپنے لہو سے سیراب کیا تھا۔ انہوں نے جب دیکھا کہ

ان تلوں میں تیل نہیں اور حکومت کے موجودہ فعل سے پاکستان کی بدنامی بھی انہیں کسی طرح نہیں بھولتی تھی۔ اس کے علاوہ ۱۹۷۳ء کے دستور کے پاس ہوئے، جس میں بظاہر اسلامی رنگ نمایاں نظر آتا تھا عوام بہت پر امید اور مطمئن تھے۔ لیکن وقت نے ثابت کر دیا کہ یہ سب دکھاوے اور کاغذی کاروائی کے سوا کچھ نہ تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ نہ ہی بھٹو حکومت ان کے مسائل کے حل کی طرف کوئی توجہ دے رہی ہے اور نہ ہی اسلامی دفعات کے نفاذ میں سنجیدہ دکھائی دیتی ہے اوپر سے پیپلز پارٹی اور حکومت کے اپنے لوگوں نے اسلام کی کھلم کھلا مخالفت بھی شروع کر دی تھی۔ چنانچہ اس صورتحال سے دل برداشتہ ہو کر عوام نے حکومت کے خلاف منظّم سخت ردعمل اور احتجاج کا فیصلہ کیا۔ ان تمام واقعات کے پیش نظر اپوزیشن پاکستان قومی اتحاد اور حکومت کے مخالفین نے مل کر ایک تحریک شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ جس کا نام ''تحریک نظام مصطفیٰ'' رکھا گیا۔

[پاکستان کا مطلب کیا ص ۹۳ تا ۹۷]

پاکستان میں قومی اتحاد کی تحریک اور بھٹو حکومت کا خاتمہ

بھٹو حکومت نے مارچ ۱۹۷۷ء میں قومی اسمبلی کے انتخابات کا انعقاد کیا جس میں پاکستان پیپلز پارٹی نے قومی اسمبلی کی '۱۵۶' اور قومی اتحاد نے ۳۶ نشستیں حاصل کیں۔ حزب مخالف نے حکومت پر انتخابی دھاندلی کا الزام لگایا۔ اور نئے انتخابات کا مطالبہ کیا۔ پاکستان قومی اتحاد نے ملک میں نظام مصطفیٰ کے نفاذ کے لیے ایک ملک گیر تحریک کا آغاز کیا۔ بھٹو نے قومی اتحاد کے رہنماؤں کے ساتھ مذاکرات کیئے جو کہ ناکام ہو گئے۔ ملک میں خانہ جنگی کو روکنے کے لیے ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو جنرل ضیاء الحق نے بھٹو حکومت کو ختم کر کے مارشل لاء نافذ کر دیا۔

بھٹو دور کے اہم واقعات

❶ ۲۸ رمئی ۱۹۹۸ء کے دن جب پاکستان نے سات ایٹمی دھماکوں کی گونج میں پہلی اسلامی ایٹمی طاقت ہونے کا اعزاز حاصل کیا پاکستان کی تاریخ میں یوم استحکام پاکستان کے طور پر ہمیشہ یاد رکھا جائے۔ پاکستان کے ایٹمی قوت بننے کی داستان غریب و سادہ اور رنگین ہے۔ یہ کہانی سقوط ڈھاکہ کے غم ناک مناظر سے ابھرتی ہے اور ۲۸ سال بعد چاغی کی ہیبت ناک چٹانوں پر اہل پاکستان کے لیے جوشِ اول کا اظہار بن کر نقش ہو جاتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سقوط ڈھاکہ کا زخم بھرنے والا نہیں سقوط ڈھاکہ کی ذمہ داری طالع آزما فوجی جرنیلوں پر عائد ہوتی ہے یا ابن الوقت سیاست دانوں پر اس بحث میں پڑے بغیر کہا جا سکتا ہے کہ اس اندوناک حادثے نے بحیثیت قوم سبھی کا سر شرم سے جھکا دیا ہے۔ سبھی یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ آئندہ کے لیے اس سانحے سے بچنے کی تدبیر کیا ہو؟

ادھر پاکستان کے ازلی دشمن بھارت نے اسی پر بس نہیں کیا ۱۹۷۴ء میں ایٹمی دھماکہ بھی کر دیا۔ اندرا گاندھی کی طرف سے یہ گویا اعلان تھا کہ آئندہ بھی پاکستان کو چین سے بیٹھنے نہیں دیا جائے گا۔ مایوسی اور ملال کے انہی ایام میں جب وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے ایٹمی توانائی کے حصول کے لیے تگ و دو کرنے کا فیصلہ کیا تو قوم نے ان کے اس اقدام کو پسند کیا۔ بھٹو کے سیاسی اور معاشی نظریات سے قوم کو کچھ حاصل ہوا یا نہیں اس سے قطع نظر یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ بھٹو وہ پہلے حکمران تھے جنہوں نے پاکستان کو ایٹمی طاقت بنانے کا خواب دیکھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ فرانس سے ایٹمی پراسینگ پلانٹ کے حصول کا معاہدہ کر کے بھٹو نے

خواب کو حقیقت بنانے کے عمل کا با قاعدہ آغاز کر دیا۔ اسے اہل پاکستان کی خوش قسمتی ہی کہنا چاہیے کہ ہالینڈ میں مقیم یورینیم افزودہ کے ماہر پاکستانی انجینئر ڈاکٹر عبدالقدیر خان (۱) بھی حکومت پاکستان کی دعوت پر تشریف لے آئے۔ ۳۱ جولائی ۱۹۷۶ء کو انجینئرنگ ریسرچ لیبارٹریز کے نام سے ایک خود مختار ادارے کا قیام عمل میں لایا گیا۔ جسے یکم مئی ۱۹۸۱ء میں جنرل ضیاء الحق نے ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی خدمات کے اعتراف میں اے کیو خان ریسرچ لیبارٹریز کے نام سے موسوم کر دیا۔ جنرل ضیاء الحق کا دور پاکستان کے ایٹمی پروگرام کی حفاظت کے نقطہ نظر سے بڑا مشکل دور تھا۔ افغانستان میں سوویت یونین کے خلاف جنگ میں امریکہ کے سب سے بڑے اتحادی تھے۔ سوویت یونین کے خلاف اس جنگ میں پاکستان

---

(۱) ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا تعارف

ڈاکٹر عبدالقدیر خان عالمی شہرت یافتہ پاکستان کے ایٹمی سائنس دان ہیں۔ وہ بھوپال میں یک استاد عبدالغفور کے ہاں ۱۹۳۶ء میں پیدا ہوئے۔ والدہ کا نام زلیخا بیگم تھا، ابتدائی تعلیم بھوپال میں ہی حاصل کی۔ تقسیم ہند کے بعد کراچی آ کر ڈی جے سائنس کالج سے بی ایس سی کا امتحان پاس کیا اور سرکاری ملازمت اختیار کر لی۔ بعد ازاں میٹالرجی کی تعلیم کے حصول کے لیے ۱۹۶۱ء میں پہلے جرمنی گئے لیکن پھر وہاں سے ہالینڈ چلے گئے جہاں سے انہوں نے ڈیلفٹ یونیورسٹی میں میٹالرجی کی تعلیم حاصل کی۔ وہاں انہیں ڈاکٹر ڈبلیو جی برجر کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ ۱۹۷۷ء یا ۱۹۷۸ء میں پاکستان آ کر کہوٹہ کے ایٹمی پلانٹ کا چارج سنبھال لیا۔ ۱۹۸۳ء میں ہالینڈ کی ایک عدالت نے ان پر ایٹمی راز چرانے کے الزام میں چار سال کی سزا سنائی۔ پاکستان سے ایس ایم ظفر نے اس مقدمے کی پیروی کی جس کے نتیجے میں انہیں تمام الزامات سے بری کر دیا گیا انہوں نے ایٹم کو پُر امن طریقے سے استعمال کرنے کے لیے بھرپور کردار ادا کیا ہے۔ سابق صدر مملکت (جنرل ضیا الحق) نے ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کہوٹہ کے ایٹمی پلانٹ کا نام ڈاکٹر عبدالقدیر ریسرچ لیبارٹریز رکھا۔ ڈاکٹر صاحب نے دفاع پاکستان کے سلسلے میں ابھی اہم کردار ادا کیا ہے اور بہت سے دفاعی آلات وغیرہ بنا کر دیئے ہیں۔ ۲۲ مارچ ۱۹۸۹ء کو انہیں پاکستان اکیڈمی آف سائنسز کا فیلو منتخب کیا گیا۔

۱۹۹۸ء میں پاکستان نے ایٹمی دھماکے کئے، اس سلسلے میں ان کے کردار کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

فرنٹ لائن سٹیٹ بن چکا تھا۔ سی۔ آئی۔ اے کے اہل کار پاکستان میں آزاد گھومتے پھرتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود نہایت مہارت سے پاکستان کے ایٹمی پروگرام کی پیش رفت کو ان کی نگاہوں سے اوجھل رکھا گیا۔ بہرحال امریکیوں کو ۱۹۸۴ء کے لگ بھگ یقین ہو گیا کہ پاکستان ایٹم بم بنانے کا عمل مکمل کر چکا ہے۔ چنانچہ ۱۹۸۷ء میں جب بھارت نے پاکستان کی سرحد کے قریب براس ٹیک مشقیں شروع کیں اور راجیو گاندھی نے پاکستان پر حملہ آور ہونے کے اشارے دیئے تو جنرل ضیاء الحق نے بڑی راز داری کے ساتھ ان کے کان میں یہ بات ڈال دی کہ بھارت غلط فہمی میں نہ رہے پاکستان ایٹم بم بنا چکا ہے اور اگر پاکستان کی سلامتی کو خطرے میں ڈالا گیا تو اپنے تحفظ کے لیے پاکستان اسے اپنے دشمن پر گرانے سے گریز نہیں کرے گا۔ ظاہر ہے اس کے بعد راجیو گاندھی کے لیے کہنے سننے کی گنجائش نہ رہی اور یوں پاکستان پر بھارتی حملے کا خطرہ ٹل گیا۔ بھارت کے ایک دم سہم جانے سے بھارت سمیت دنیا پر واضح ہو گیا کہ پاکستان غیر اعلانیہ ایٹمی طاقت ہے ان وجوہات میں جانے کی ضرورت نہیں کہ ایٹمی صلاحیت حاصل ہو جانے کے باوجود پاکستان نے باضابطہ ایٹمی دھماکہ کیوں نہیں کیا؟ پاکستان کے نقطہ نظر سے اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ پاکستان بلا وجہ امن پسند دنیا کو اپنی طرف متوجہ کرنا یا اپنے خلاف کرنا نہیں چاہتا تھا انسانی ارادہ و عمل سے بے نیاز قدرت کو بھی شائد یہی منظور تھا۔ بہرحال کچھ عرصہ بعد بھارت ہی کے ایک جارحانہ اقدام کے نتیجے میں پاکستان کو باضابطہ ایٹمی طاقت بننے کا بہتر موقع مل گیا۔ گویا پاکستان کے ساتھ ''دیر آید درست آید'' والا معاملہ ہو گیا بھارت نے ۱۹۷۴ء میں باضابطہ ایٹمی دھماکہ کر چکا تھا۔ اس کے باوجود بھارت نے ۱۱ رمئی ۱۹۹۸ء کو مزید ۱۶ دھماکے کر دیئے۔ ظاہر ہے اب پاکستان کے لیے اس کے سوا

کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ بھارت کے ایٹمی دھماکوں کا جواب ایٹمی دھماکوں ہی سے دے تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام میں آئے۔ اس میں شک نہیں کہ بھارت کے ایٹمی دھماکوں کے فورا بعد امریکہ نے پاکستان کو جوابی ایٹمی دھماکوں سے باز رکھنے کے لیے امکان بھر کوشش کی نواز شریف کے بقول امریکی صدر کلنٹن نے اس مقصد کے لیے انہیں پانچ بار ٹیلی فون کیا۔ لیکن نواز شریف نے ۲۸ رمئی ۱۹۹۸ء کو چھ ایٹمی دھماکے کر دیئے۔ پاکستان کے ایٹمی طاقت بن جانے کا سب سے بڑا فائدہ پاکستان کو یہ پہنچا ہے کہ بھارت پاکستان سے جنگ آزما ہونے کے معاملے میں ہمیشہ کے لیے محتاط ہو گیا ہے۔ اس کا اول کریڈٹ تو مسٹر بھٹو کو ہی جاتا ہے جنہوں نے جنون کی حد تک اس کام میں دلچسپی لی اور ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو ہالینڈ سے بلا کر دوسرے سائنس دانوں کے ساتھ اس کام پر لگایا۔ اس کام کے لیے مطلوبہ فنڈز مہیا کرتے رہے۔ دوسرے نمبر پر اس کا کریڈٹ نواز شریف کو بھی جاتا ہے۔ جنہوں نے سپر طاقت کی مخالفت کے باوجود اپنی عوام کی خواہش پر ایٹمی دھماکے کر دیئے۔ بھٹو نے اپنے دورِ حکومت میں جتنے بھی کام کیے ہیں ان میں سے ان کا یہ کام لائق ستائش ہے۔

❷ اس میں کوئی شک نہیں کہ مسٹر بھٹو بے دین آدمی تھے لیکن دسمبر ۱۹۷۴ء میں قومی اسمبلی سے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار کروا دیا۔ ان کا یہ کارنامہ بھی بہت لائق ستائش ہے ان سے پہلے بھی کئی وزیر اعظم آئے تھے لیکن ان میں سے کسی نے بھی عوام کی خواہش کے مطابق یہ مسئلہ حل نہیں کیا۔ ان میں سے کسی میں بھی یہ جرأت و دلیری نہ تھی۔ لیکن مسٹر بھٹو نے کسی کی پروا کیئے بغیر یہ مسئلہ حل کر کے عوام کو خوش کر دیا۔

❸ پاکستان بننے کے بعد بھٹو دور تک ہفتہ وار چھٹی اتوار کی چلی آ رہی تھی لیکن مسٹر بھٹو

نے عوام کے مطالبہ پر جمعہ کی چھٹی منظور کر لی لیکن بعد میں جب نواز شریف آئے تو انہوں نے جمعہ کی چھٹی ختم کر کے اتوار کی چھٹی بحال کر دی۔ حالانکہ نواز شریف اور اس کا خاندان مذہبی تھا۔ اس سے یہ توقع نہ تھی کہ جمعہ کی چھٹی ختم کر دیں۔

4 ۲۲ تا ۲۴ رفروری ۱۹۷۴ء کو دوسری اسلامی سربراہی کانفرنس کا انعقاد کیا گیا۔ جس میں عالم اسلام کے نامور رہنماؤں نے حصہ لیا۔ اس سے پاکستان کی عزت و وقار میں اضافہ ہوا۔

حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے اقتدار سنبھالنے کے صرف چار روز بعد ۲۴ دسمبر ۱۹۷۱ء کو چیف جسٹس آف پاکستان مسٹر جسٹس حمود الرحمٰن کی سربراہی میں کمیشن تشکیل دیا تاکہ یہ کمیشن مشرقی پاکستان (اب بنگلہ دیش) میں پاکستان کی فوجی شکست کے بارے میں تحقیق کر سکے۔ کمیشن نے متعدد اعلیٰ فوجی اور سول افسروں سے پوچھ گچھ کی اور بالآخر نومبر ۱۹۷۴ء کو حکومت کو رپورٹ پیش کی۔ یہ رپورٹ ۴۵۲ صفحات پر مشتمل تھی، لیکن اس رپورٹ کو منظر عام پر نہ لایا گیا اور عوام مشرقی پاکستان میں فوجی شکست کے بارے میں نہ جان سکے۔

جنرل ضیاء الحق کا دور

جنرل ضیاء الحق نے ۵ رجولائی ۱۹۷۷ء کو مارشل لاء نافذ کر کے عنانِ حکومت کو سنبھالا۔ اس موقع پر قوم سے خطاب میں فرمایا:

"اب مسٹر بھٹو کی حکومت ختم ہو چکی ہے سارے ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا ہے۔ قومی اور صوبائی اسمبلیاں توڑ

دی گئی ہیں۔ صوبائی گورنر ہٹا دیئے گئے ہیں۔ البتہ دستور کو منسوخ نہیں کیا گیا ہے اس کے بعض حصوں پر عمل درآمد روک دیا گیا ہے۔''

ضیاء دور کے اہم واقعات

❶...... ملک کا نظم ونسق چلانے کے لیے پانچ مارشل لاء ایڈمنسٹریڈ مقرر کیے گئے۔

❷...... ضیاء حکومت نے ذوالفقار علی بھٹو کو گرفتار کر لیا ان کی بیوی نصرت بھٹو نے اس کے خلاف سپریم کورٹ میں رٹ دائر کی عدالت نے حکومتی اقدام کو درست قرار دیا۔

❸...... ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف نواب محمد احمد خان کے قتل کا مقدمہ درج کیا گیا لاہور ہائی کورٹ نے ۱۸/ مارچ ۱۹۷۸ء کو بھٹو کو پھانسی کی سزا سنائی۔ بعد ازاں سپریم کورٹ نے ۶/ فروری ۱۹۷۹ء کو یہ فیصلہ درست قرار دیا اور ۲ مارچ ۱۹۷۹ء کو فیصلہ بحال رکھا۔ چنانچہ ۴/ اپریل ۱۹۷۹ء کو بھٹو کو پھانسی دے دی گئی۔

❹...... دسمبر ۱۹۷۹ء میں سوویت یونین نے افغانستان میں ایک لاکھ فوجی اور سینکڑوں ٹینک داخل کر دیئے۔ روسی قبضہ ۱۹۸۸ء تک جاری رہا۔ جنیوا معاہدے کے تحت روسی فوج واپس چلی گئی۔

❺...... فروری ۱۹۸۱ء میں حکومت مخالف جماعتوں نے تحریک بحالی جمہوریت تشکیل دی جس نے ۱۹۸۱ء تا ۱۹۸۶ء تک ضیاء حکومت کے خلاف تحریک چلائی مگر ناکام ہوگئی۔

❻...... دسمبر ۱۹۸۱ء میں ملک میں مجلس شوریٰ قائم کی گئی۔

❼...... دسمبر ۱۹۸۴ء میں ضیاء الحق نے ملک میں صدارتی ریفرنڈم کا انعقاد کیا جس

میں وہ بھاری اکثریت سے ملک کے صدر منتخب کیے گئے۔

8 ...... ۱۹۸۵ء میں ملک میں عام انتخابات کا انعقاد کیا گیا۔ جس کے نتیجے میں محمد خان جونیجو ملک کے وزیر اعظم بنے۔

9 ...... ۳۱ دسمبر ۱۹۸۵ء کو ملک سے مارشل لاء ہٹا لیا گیا۔

[کون کیا ہے ص ۱۴۰]

مجلس شوریٰ کا قیام

دسمبر ۱۹۸۱ء میں مجلس شوریٰ قائم کی گئی، مجلس شوریٰ کا قیام ضیاء الحق کی اپنی اختراع تھی۔ اس سے ان کا مقصد اپنے اقتدار کو طول دینا تھا۔ اور اس مجلس میں جتنے لوگ شوریٰ کے ممبر بنے ان کی اکثریت بھی ضیاء حکومت کے اپنے ہی من پسند تھے ورنہ اس سے پہلے مجلس قائم کرنے کا پاکستان میں کوئی رواج نہیں تھا۔

ریفرنڈم کا ڈھونگ

جنرل ضیاء الحق نے صدر بننے کے لیے ریفرنڈم کا ڈھونگ رچایا۔ ریفرنڈم کے ووٹ کا متن درج ذیل ہے۔

کیا آپ اسلام چاہتے ہیں؟

اگر آپ اسلام چاہتے ہیں تو آئندہ پانچ سال کے لیے ضیاء الحق صدر ہوں گے

ہاں ———— یا نہیں ————

ظاہر ہے اسلام تو قوم کا ہر فرد چاہتا ہے پھر ضیاء الحق کی اس میں خصوصیت کونسی ہے؟ یہ تو قوم کو بے وقوف بنانے والی بات تھی۔ ضیاء الحق سے پہلے ایوب خان بھی یہ ڈھونگ رچا کر صدر بن گئے تھے۔ لیکن افسوس کی بات تو یہ ہے کہ ضیاء

الحق تو آ گیا لیکن اسلام جس کے نام پر ووٹ مانگا گیا تھا وہ نہیں آیا۔

اسلام کو بدنام کیا گیا

ضیاء الحق کے دور پر تبصرہ کرتے ہوئے مجید نظامی اپنے مخصوص دھیمے انداز میں بتاتے ہیں کہ وہ اسلام کے نام پر ''اقتدار'' پر قابض ہوئے تھے۔ اسلام تو نافذ نہ ہو سکا البتہ سرکاری افسروں نے اپنے دفاتر میں مصلے بچھائے اور بغیر وضوء کے نمازیں ٹکائیں۔

جنرل ضیاء نے اپنے دورِ حکومت میں اسلام کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا۔ ضیاء الحق سے پہلے جتنے بھی سربراہ حکومت آئے ان میں سے کوئی بھی دین دار نہ تھا انہوں نے اسلام کا نام بھی زیادہ استعمال نہیں کیا۔ قوم بھی جانتی تھی کہ یہ لوگ اسلام نہیں لائیں گے اور نہ ہی انہوں نے کوئی اسلام لانے کا دعویٰ کیا تھا۔ ان کے برعکس جنرل ضیاء الحق دین دار شخص تھے۔ اسلامی ذہن رکھنے والے تھے۔ دین دار لوگوں سے ان کو عقیدت بھی تھی خاص طور پر مفتی محمد شفیع کے بہت مداح اور عقیدت مند تھے۔ پارٹیشن سے پہلے جلندھر میں ضیاء الحق کا نکاح بھی مفتی صاحب نے ہی پڑھایا تھا۔ مولانا اشرف علی تھانوی کا خلیفہ مجاز ڈاکٹر عبدالحی عارفی سے بھی ضیاء الحق کو عقیدت تھی۔ بدیں وجہ انہوں نے اپنی لڑکی کے نکاح کے موقع پر مولانا تقی عثمانی کو فون کیا کہ حضرت صاحب کو فلاں تاریخ کو میرے ہاں لائیں میری لڑکی کی شادی ہے۔ نکاح حضرت عارفی صاحب سے پڑھوانا ہے۔ چنانچہ مولانا تقی عثمانی اور ڈاکٹر عارفی اس تاریخ کو اسلام آباد پہنچے۔ جنرل ضیاء الحق ائیر پورٹ پر ان کا استقبال کرنے کے لیے بذات خود پہنچے ہوئے تھے۔ گاڑی میں بیٹھا کر ان کو اسلام آباد لائے۔ مولانا تقی عثمانی کا بیان ہے کہ جنرل ضیاء الحق ڈاکٹر عارفی کے لیے عقیدت ومحبت میں بچھے جا رہے تھے۔ ڈاکٹر عارفی نے نکاح سے پہلے

ایک گھنٹہ وعظ ونصیحت کی جس میں ضیاء الحق کو وزراء اور کچھ جرنیل پندرہ سولہ کے قریب موجود تھے۔ مفتی شفیع اس سے پہلے فوت ہو چکے تھے ورنہ انہی کو بلانا تھا۔ مفتی شفیع مرحوم کے بیٹے مولانا تقی عثمانی سے بھی ان کو عقیدت تھی اسی لیے ان کو اپنا خاص فون نمبر دیا ہوا تھا کہ جب بھی کوئی ضرورت پیش آئے اس نمبر پر رابطہ کرسکیں اور مولانا تقی عثمانی کو انہوں نے کہا ہوا تھا کہ آپ جب بھی اسلام آباد تشریف لائیں تو آپ میرے مہمان ہوں گے اور کھانا میرے ساتھ ہی کھائیں گے۔ کسی سربراہ مملکت کی کسی سے محبت کی یہ انتہا ہے مفتی محمد شفیع کی تفسیر معارف القرآن گھر میں نمایاں جگہ پر رکھی ہوئی تھی۔ اور اس کا مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ ضیاء الحق نے مفتی محمد شفیع مرحوم کے مدرسہ دارالعلوم کراچی کا معائنہ بھی کیا تھا اور مفتی مرحوم کی قبر پر فاتحہ بھی پڑھی تھی۔

اتنا دین دار ہونے کے باوجود اپنے گیارہ سالہ دورِ اقتدار میں اسلام تو نہ لا سکے مگر اسلام کا نام بے تحاشہ استعمال کر کے اسلام کو بدنام کرتے رہے۔ جس سے لوگ یہ سمجھنے لگے کہ ضیاء الحق کے دور میں جو اسلام ہے بس یہی اسلام ہے جس کے لانے کا قوم مطالبہ کرتی چلی آ رہی تھی حالانکہ اسلام کی کوئی بات بھی ضیاء الحق نافذ نہیں کر سکے۔

اگر اسلام آ جاتا تو ملک سے ہر قسم کی برائی ختم ہو جاتی اور لوگوں کی عزتیں اور جان ومال محفوظ ہو جاتے اور قوم اسلام کی برکات سے محظوظ ہوتی۔ لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا مگر ایک فائدہ ضرور ہوا کہ ضیاء الحق اسلام کا نام لے لے کر گیارہ سال اقتدار پر قابض رہے۔

جونیجو وزارت ۱۹۸۵ء تا ۱۹۸۸ء

۱۹۸۵ء کے غیر جماعتی انتخابات کے نتیجے میں محمد خان جونیجو نے حکومت

تشکیل دی۔

الیکشن ۱۹۸۵ء

بد دیانتی کی انتہا

ملک میں جب بھی الیکشن ہوتے ہیں تو دھاندلی کی اکثر شکایات سننے میں ملتی ہیں۔ جس کے پاس پیسے اور بدمعاش زیادہ ہوتے ہیں تو وہ اپنے مدمقابل کو کبھی کامیاب نہیں ہونے دیتا ہر قسم کی بددیانتی اور دھاندلی سے کام لیا جاتا ہے مگر سیالکوٹ میں جو بددیانتی اور بدمعاشی ہوئی، اس کی کہیں مثال نہیں ملتی۔

۱۹۸۵ء کے غیر جماعتی انتخابات میں حلقہ N.A ۱۰۴ سیالکوٹ کی نشست پر تین آدمیوں کا مقابلہ تھا۔

(۱) وفاقی مجلس شوریٰ کے چیئر مین خواجہ محمد صفدر

(۲) وفاقی مجلس شوریٰ کے رکن جناب میاں محمد نعیم الرحمٰن ایڈووکیٹ

(۳) جماعت اسلامی کے سرکردہ رہنما اور صنعت کار پروفیسر امین جاوید

اسی نشست سے ۱۹۷۰ء میں پیپلز پارٹی کے منتخب M.P.A چوہدری غلام قادر کی ضمانت ضبط ہوگئی تھی۔ مذکورہ حضرات کا مختصر سا تعارف پیش خدمت ہے۔

❶ **خواجہ محمد صفدر:** ان کا شمار مسلم لیگ پنجاب کے سرکردہ قائدین میں ہوتا ہے انہوں نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز تحریک پاکستان کے ایک کارکن کی حیثیت سے کیا۔ ۱۹۵۱ء میں انہیں مسلم لیگ نے سیالکوٹ شہر سے پنجاب اسمبلی کے لیے ٹکٹ دیا مگر وہ جناح عوامی لیگ کے امیدوار اور پاکستان بننے کے بعد پنجاب کے پہلے وزیر اعلیٰ نواب افتخار حسین ممدوٹ کے مقابلہ میں ناکام ہو گئے۔ تاہم جب نواب صاحب نے یہ نشست چھوڑ دی تو خواجہ صاحب دوسری

بار مسلم لیگ کے ٹکٹ پر M.L.A ۱۹۵۶ء کی ون یونٹ اسمبلی میں وہ اسی ضلع سے M.P.A منتخب ہوئے۔ ۱۹۶۲ء میں وہ مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور کونسل مسلم لیگ کے رہنما کی حیثیت سے وہ اپوزیشن بنچوں پر بیٹھے۔ انہیں مغربی پاکستان اسمبلی میں قائد حزب اختلاف بنایا گیا۔ ۱۹۶۵ء میں خواجہ صاحب کنونیشن مسلم لیگ کے امیدوار خواجہ جمیل کے مقابلے میں M.P.A منتخب ہوئے۔ انہیں دوبارہ قائد حزب اختلاف بنایا گیا۔ ۱۹۷۰ء میں خواجہ صاحب سیالکوٹ شہر سے پیپلز پارٹی کے امیدوار مسٹر اکبر منہاس (دھوبی) جسے محلے کے اکثر لوگ بھی نہیں جانتے تھے کے مقابلہ میں شکست فاش کھا گئے یہ خواجہ صاحب کے انتہائی ناکام لیڈر ہونے کی نشانی ہے۔ ۱۹۷۷ء میں انہیں قومی اتحاد کی طرف سے قومی اسمبلی کا ٹکٹ دیا گیا۔ جب قومی اتحاد کو مارشل لاء کی حکومت نے وفاقی کابینہ میں نمائندگی دی تو خواجہ صاحب وفاقی وزیر خوراک وزراعت بنائے گئے۔ اور وفاقی مجلس شوریٰ کے چیئرمین بھی نامزد کیے گئے۔

❷ محترم جناب میاں محمد نعیم الرحمٰن ایڈووکیٹ: ان کا تعلق آرائیں برادری اور وکلاء سیالکوٹ سے ہے۔ انتہائی اچھی شہرت کے حامل اور شہر سیالکوٹ کی ہر دل عزیز شخصیت ہیں۔ مظلوموں اور بے کس و بے سہارا لوگوں کی مدد کرنا وہ اپنا اخلاقی و دینی فریضہ سمجھتے ہیں۔

❸ پروفیسر امین جاوید: ان کا تعلق بھی آرائیں برادری سے ہے اور جماعت اسلامی سیالکوٹ کے امیر ہیں اور بہت اچھے دیندار ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے صنعت کار بھی ہیں۔ شہر میں اچھی شہرت رکھتے ہیں مگر جس جماعت کے ٹکٹ پہ الیکشن لڑا اس کو عام لوگ ووٹ دینے کے لیے تیار نہیں کیونکہ جماعت اسلامی کا تعلق سیاست کے ساتھ ساتھ دینی جماعتوں سے بھی ہے اور ہمارے ملک میں یہ بدقسمتی

کی بات ہے کہ لوگ دیندار جماعتوں کو ووٹ دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں لوگ بہت سے غلط کام کرتے ہیں اس کے نتیجے میں پکڑے جاتے اور مشکلات میں پھنس جاتے ہیں پھر اپنی مشکلات کو حل کرانے کے لیے ممبروں کو استعمال کرتے ہیں اس سلسلہ میں کوئی دینی جماعت کا آدمی ان کی غلط کاریوں پر مدد کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا جبکہ دوسرے ممبران ان کی ہر قسم کی مدد کرتے ہیں۔ اس لیے پروفیسر امین جاوید کا کامیاب ہونا غیر یقینی تھا۔ اصل مقابلہ تو خواجہ صاحب اور جناب میاں نعیم الرحمٰن کا تھا۔

شہر میں خواجہ صاحب کی پوزیشن

خواجہ صاحب کئی بار الیکشن میں کامیاب ہوئے مگر انہوں نے شہر میں کوئی کام نہیں کیا اور نہ ہی وہ کسی کی مشکل گھڑی میں کام آئے۔ اس لیے شہر کی اکثر عوام ان کے مخالف تھی۔ ان میں ایک عیب یہ بھی تھا کہ وہ اپنے اور لوگوں کے درمیان فاصلہ رکھتے تھے اور عام لوگوں سے ملنا پسند نہیں کرتے تھے اور نہ ہی عوام کے دکھ سکھ میں کام آتے تھے۔ اور تو اور وہ چھوٹے افسروں سے بات چیت اور ملاقات کو اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ مجھے ایک مرتبہ ڈی، ایس، پی کے بارے میں خواجہ صاحب سے بات کرنے کا موقع ملا، ہمارا کوئی جائز کام تھا جس میں ڈی، ایس، پی ٹال مٹول کر رہے تھے۔ وہ ہمارا کام نہیں کرنا چاہتے تھے۔ خواجہ صاحب سے ہم نے ذکر کیا کہ آپ ان کو کہیں ہمارا کام کر دیں مگر خواجہ صاحب نے فرمایا کہ میں ایس، پی سے نیچے والے افسران سے بات نہیں کیا کرتا۔ ایس، پی سے کوئی کام ہو تو بتائیں میں ان کو ٹیلی فون کر دوں گا اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ خواجہ صاحب عام آدمی کے کتنے کام آتے ہوں گے۔ اور لوگوں کی کتنی مشکلات حل

کرتے ہوں گے۔ عام لوگوں کو تو چھوٹے افسران خاص طور پر ایس، ایچ، او وغیرہ سے ہی کام ہوتا ہے۔ جو لیڈر مشکلات میں عوام کی مدد نہیں کرتا لوگ اس کو ووٹ دینے کے لیے بھی تیار نہیں ہوتے۔ مگر حکومت ان کو کامیاب دیکھنا چاہتی تھی کیونکہ وہ جنرل ضیاء الحق صاحب کے گہرے دوست تھے۔ انہوں نے سیالکوٹ کی انتظامیہ کو خاص طور پر ہدایت کر رکھی تھی کہ خواجہ صاحب کو ہر صورت میں کامیاب کروانا ہے کیونکہ ضیاء الحق خواجہ صاحب کو قومی اسمبلی کا اسپیکر بنانا چاہتے تھے۔ اس لیے خواجہ صاحب کو کامیاب کروانے کی بطور خاص سیالکوٹ انتظامیہ ایس، پی، صلاح الدین نیازی اور ڈی، ایس پی اسماعیل قریشی کو ہدایت کی ہوئی تھی۔ بہر کیف مقابلہ ہوا۔ رات ۸ بجے جب ووٹوں کی گنتی ہوئی تو میاں نعیم الرحمٰن صاحب (۸۰۰۰) آٹھ ہزار ووٹوں کی برتری سے کامیاب ہو گئے اور خواجہ صاحب ہار گئے اور اس کا اعلان بھی کر دیا گیا مگر رات ۳ بجے پھر اعلان ہوا کہ خواجہ صاحب کامیاب ہو گئے ہیں اور میاں نعیم الرحمٰن صاحب ہار گئے، یہ کھلم کھلی بدمعاشی تھی۔ حالانکہ ضیاء الحق بھی دین دار تھے اور خواجہ صاحب بھی نمازی اور درویش صفت انسان تھے مگر اللہ کا خوف دونوں کو ہی نہیں آیا۔

خواجہ صاحب کی سادگی اور درویشی کا یہ عالم تھا کہ گھر کا سودہ سلف بازار سے خود ہی ایک ٹوٹی پھوٹی سائیکل پر لایا کرتے تھے اور شہر میں بھی اسی سائیکل پر گھوما کرتے تھے جبکہ اللہ کا دیا ہوا ان کے پاس بہت کچھ تھا۔

خدایا تیرے سادہ لوح بندے کدھر جائیں
درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری ہے

لوگوں نے میاں صاحب کو ووٹ دے کر کامیاب کیا تھا مگر ان سے یہ حق چھین کر دوسرے شخص کو دے دیا گیا کل قیامت کے دن جب خواجہ صاحب اور

میاں صاحب اللہ کے حضور پیش ہوں گے وہاں اس کا حساب دینا پڑے گا اور احادیث کے بموجب حقوق العباد معاف نہیں ہوں گے اور میاں صاحب کا جو حق چھینا گیا ہے وہ سارے سیالکوٹ شہر کا حق تھا۔ تو اللہ کے حضور جب پیشی ہوگی تو تمام افراد کے حقوق کیسے ادا ہوں گے اللہ تعالیٰ معاف کرے لوگ قیامت کو بھول کر ہی ایسی حرکات کرتے ہیں۔ پھر جس مقصد کے لیے میاں صاحب کا حق چھینا گیا وہ بھی پورا نہ ہوا کیونکہ جنرل ضیاء الحق کی خواہش تھی کہ خواجہ صاحب کو قومی اسمبلی کا اسپیکر بنایا جائے مگر بھرپور کوشش کے باوجود ضیاء الحق اس میں کامیاب نہ ہو سکے کیونکہ ان کے خلاف گروپ مضبوط تھا انہوں نے عابدہ حسین کے شوہر فخر الامام کو قومی اسمبلی کا اسپیکر منتخب کر لیا۔ ضیاء الحق کی خواہش پوری نہ ہو سکی، خواجہ صاحب جس قدر ظاہر میں حکومت کی شدت سے مخالفت کرتے تھے اسی قدر درپردہ وہ حکومت کے حامی بھی ہوتے تھے۔ اسی لیے بننے والی تمام حکومتوں میں وہ محفوظ رہے۔ کسی بھی حکومت نے مخالف سمجھ کر ان سے کوئی انتقامی کاروائی نہیں کی بلکہ انہیں اپنا ہی آدمی سمجھتی رہی۔ بلاشبہ یہ خوبی خواجہ صاحب میں ہی تھی اور ہم اس کے معترف ہیں میاں صاحب میں یہ خوبی نہیں ہے ان کا ظاہر و باطن یکساں ہے۔

جونیجو حکومت کی برطرفی

محمد خان جونیجو پاکستان کی تاریخ کے سب سے زیادہ شریف النفس اور پاکستان کی دولت کو اپنی دولت نہ سمجھنے والے وزیر اعظم تھے۔ محمد خان جونیجو نے وزاتِ عظمیٰ کا عہدہ سنبھال کر آزاد حکمتِ عملی اپنائی۔ اس سلسلے میں ضیاء الحق کے وفادار ساتھیوں سے جان چھڑانے کے لیے دوبارہ وفاقی کابینہ تشکیل دی۔ اس طرح جونیجو، ضیاء چپقلش کا آغاز ہوا۔ بعد ازاں اوجڑی کیمپ کے واقعہ کے بعد یہ

اختلاف شدید ہو گئے۔ بطور وزیر اعظم جونیجو نے جرنیلوں سمیت افسر شاہی کو سوزوکی میں بٹھانے کی کوشش کی اور اسٹیبلشمنٹ کو اپنا دشمن بنا لیا۔ انہوں نے ۱۹۸۸ء میں غیر ملکی ٹور جاپان کا کیا تھا جس میں مجید نظامی بھی ان کے ہمراہ تھے۔ آخری رات کو ہوٹل کے کمرے میں مجید نظامی کو جونیجو کا فون آیا...... وہ کہہ رہے تھے سائیں ہم باقی ٹور کینسل کر رہے ہیں صبح واپسی کی تیاری کریں۔ مجید نظامی جو اقتدار کی کشمکش سے بخوبی آگاہ تھے فوراً اس نتیجے پر پہنچ گئے تھے کہ فوجی قبضہ ہو چکا ہے اور صدر ضیاء الحق انہیں ''ڈس مس'' کر چکے ہیں۔ چنانچہ ضیاء الحق نے دفعہ ۵۸ (۲) بی کا استعمال کرتے ہوئے ۲۹ مئی ۱۹۸۸ء کو جونیجو حکومت کو برطرف کر دیا۔

فضائی حادثے میں ضیاء الحق کی ہلاکت

۱۷ اگست ۱۹۸۸ء کو ضیاء حکومت کا خاتمہ ہو گیا جب وہ بہاولپور کے قریب ایک فضائی حادثے کا شکار ہو گئے۔

غلام اسحاق خان (۱۹۸۸ء تا ۱۹۹۳ء)

ضیاء الحق کی ہلاکت کے بعد سینٹ کے چیئر مین غلام اسحاق خان نے صدر کا عہدہ سنبھالا۔ اور ۱۶ نومبر ۱۹۸۸ء کو انتخابات کروانے کا اعلان کیا۔

۱۹۸۸ء کے عام انتخابات

نومبر ۱۹۸۸ء کے عام انتخابات میں قومی اسمبلی میں محترمہ بے نظیر بھٹو کی قیادت میں پاکستان پیپلز پارٹی نے ۹۳ نشستیں حاصل کر کے پہلی پوزیشن حاصل کی۔ اس کے مقابلے میں اسلامی جمہوری اتحاد نے ۵۴ اور جمعیت علمائے اسلام نے ۷ نشستوں پر کامیابی حاصل کی۔ صوبائی انتخابات میں پنجاب میں اسلامی جمہوری اتحاد نے ۱۰۸ اور پاکستان پیپلز پارٹی نے ۹۳ نشستیں حاصل کیں۔ صوبہ

سندھ میں پاکستان پیپلز پارٹی کو ۶۷ نشستوں کے ساتھ اکثریت حاصل ہوئی جبکہ ایم کیو ایم ۳۱ نشستوں کے ساتھ دوسرے نمبر پر رہی۔ صوبہ بلوچستان میں کوئی بھی سیاسی جماعت واضح برتری حاصل نہ کرسکی۔

بے نظیر کا پہلا دورِ وزارت

(۱۹۸۸ء تا ۱۹۹۰ء)

۱۹۸۸ء کے انتخابات میں پاکستان پیپلز پارٹی نے مرکز میں ۹۳ نشستیں حاصل کیں اس کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو نے ۲ر دسمبر ۱۹۸۸ء کو وزارتِ عظمیٰ کا عہدہ سنبھالا وہ پاکستان کی پہلی خاتون وزیر اعظم تھیں۔ محترمہ کا پہلا دورِ وزارت ۶ر اگست ۱۹۹۰ء تک جاری رہا اس عرصہ کے دوران کئی اہم واقعات رونما ہوئے جن میں درج ذیل نمایاں تھے۔

(i) ۱۵ر دسمبر ۱۹۸۸ء کو گورنر نے بلوچستان اسمبلی کو برطرف کردیا۔
(ii) ۲۹ر دسمبر ۱۹۸۸ء کو اسلام آباد میں چوتھی سارک کانفرنس کا انعقاد کیا گیا۔
(iii) اپریل ۱۹۸۹ء میں پیپلز ورکس پروگرام کا آغاز کیا گیا۔
(iv) یکم اکتوبر ۱۹۸۹ء کو پاکستان دولت مشترکہ کا دوبارہ رکن بن گیا۔
(v) ۶ر اگست ۱۹۹۰ء کو صدر غلام اسحاق خاں نے بے نظیر حکومت کو برطرف کردیا۔

نواز شریف کا پس منظر

نواز شریف کا پس منظر یہ ہے کہ ان کے والد سیلف میلڈ آدمی تھے۔ میاں شریف پاکستان بننے سے پہلے امرتسر سے ہجرت کر کے لاہور آگئے تھے ریلوے روڈ کے قریب واقع لوہے کے کارخانے ''اتفاق'' کے نزدیک ہی انہوں نے رہائش بھی اختیار کی اور کاروبار کا آغاز بھی کیا لیکن کاروبار کے وسعت اختیار کر جانے کے بعد

ماڈل ٹاؤن ایکسٹینشن میں آ گئے جہاں انہوں نے ایک ہی قطار میں سات کوٹھیاں بنوائیں۔ ان میں چھ باقی بھائیوں کے لیے اور ایک ان کی رہائش کے لیے تھی میاں صاحب نے بچوں کو پڑھایا لکھایا۔ نواز شریف نے ایل ایل بی اور شہباز شریف نے گریجویشن تک تعلیم مکمل کی۔

میاں شریف، نواز شریف اور شہباز شریف کو اس لیے بھی مشورے دیتے رہتے تھے کہ وہ ایک بڑے خاندان کے ''ہیڈ آف دی فیملی'' ہونے کی وجہ سے اور کاروبار کے چیئرمین کی حیثیت سے اچھے ایڈمنسٹریٹر'' تھے۔ وہ پورے خاندان کے ''چیئرمین'' تھے اور ''چیئرمین'' کہلاتے تھے۔ میاں صاحب بھائیوں میں درمیان میں آتے تھے لیکن اپنے بڑے بھائیوں پر بھی ان کا پورا کنڑول تھا۔ میاں شریف محنتی انسان تھے ''اتفاق فاؤنڈری'' انہوں نے اپنے زور بازو سے بنائی تھی لیکن اتنی ترقی کے باوجود میاں گھرانے کی نشست و برخاست ''پنجابی'' اور ''مشرقی'' سٹائل کی تھی۔ مجید نظامی نے اپنی آنکھوں سے تو نہیں دیکھا مگر سنا ہے کہ وہ باورچی خانہ میں بیٹھ کر عادتاً یا روایتاً کھانا کھایا کرتے تھے۔

ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں جب انہوں نے ''نیشلائزیشن'' کی تو اس میں اتفاق سے ''اتفاق انڈسٹری'' بھی شامل تھی اور یہ بات ''میاں'' فیملی کو سیاست میں لے آئی کیونکہ میاں صاحب اپنے سنہرے خوابوں کو ماضی کے دھندلکے میں روپوش ہوتا نہیں دیکھ سکتے تھے وہ نہیں چاہتے تھے کہ ایک جنبش کاتب تقدیر انہیں مائل بہ حسرت کر دے۔ وہ اپنے خوش آئند خواب میں کوئی پر درد باب تحریر نہیں کرنا چاہتے تھے انہوں نے وہ کامیابی حاصل کی تھی کہ جو اس دہر میں کمیاب اور سایہ ہما جیسی نایاب تھی.... مگر مقدر کا لکھا سارے پرندے اڑا دیا کرتا ہے۔ بدقسمتی سے میاں شریف نے آخری عمر میں جلاوطنی کا دکھ بھی برداشت کیا۔

مجید نظامی کے ساتھ رابطہ میاں شریف نے بھٹو کی ''نیشلائزیشن'' کے بعد کیا تھا۔ میاں صاحب کے جرنیلوں کے ساتھ تعلقات تھے۔ ان میں جنرل اقبال اور جنرل جیلانی دو نمایاں جرنیل تھے جن سے آہستہ آہستہ میاں صاحب نے خاصی قربت حاصل کر لی تھی۔

جنرل جیلانی جب گورنر پنجاب ہوئے تو انہیں ''کیبنٹ'' بنانے کی ضرورت پیش آئی تو انہوں نے نواز شریف کو اپنا ''وزیر'' بنایا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ شہباز شریف کو وزیر بنانا چاہتے تھے لیکن میاں شریف کا خیال تھا کہ نواز شریف ان کا بڑا بیٹا ہے لہٰذا یہ حق اسی کو ملنا چاہیے۔ لہٰذا نواز شریف آئے اور پھر سیاست میں ترقی کرتے چلے گئے۔ پہلے ''صوبائی وزیر خزانہ'' پھر ''وزیر اعلیٰ'' اور پھر ''وزیر اعظم'' بن کر مسند اقتدار پر جلوہ افروز ہوتے چلے گئے۔ شہباز شریف بھی وزیر اعلیٰ بنے۔ لوگ شہباز شریف کو ''گڈ گورننس'' کی وجہ سے زیادہ بہتر لیڈر تصور کرتے ہیں۔

[جب تک میں زندہ ہوں ص ۹۴]

نواز شریف کی وزارت کا پہلا دور

(۱۹۹۰ء تا ۱۹۹۳ء)

بے نظیر حکومت کی برطرفی کے بعد ملک میں ۲۴/ اکتوبر اور ۲۷/ اکتوبر ۱۹۹۰ء کو بترتیب قومی وصوبائی اسمبلیوں کے انتخابات منعقد کیے گئے ان میں اسلامی جمہوری اتحاد نے ۹۱ نشستوں کے ساتھ قومی اسمبلی میں اکثریت حاصل کی۔ علاوہ ازیں اتحاد نے صوبہ پنجاب اور صوبہ سرحد میں بھی نمایاں کامیابی حاصل کی۔ پاکستان پیپلز پارٹی نے قومی اسمبلی میں پاکستان ڈیموکریٹک الائنس

کے نام کے تحت صرف ۱۰ نشستیں حاصل کیں۔ تاہم اتحاد نے صوبہ سندھ میں ۴۷ نشستوں کے ساتھ اکثریت حاصل کی۔

انتخابات کے نتیجے میں نواز شریف نے ۶ نومبر ۱۹۹۰ء کو وزیرِ اعظم کی حیثیت سے حلف اٹھایا۔ یہ وزارت جولائی ۱۹۹۳ء تک جاری رہی۔ اس دور کا خاص واقعہ اسلام آباد، لاہور موٹر وے کا افتتاح تھا۔ علاوہ ازیں صدر اور وزیر اعظم میں محاذ آرائی ہوئی جس کے نتیجے میں صدر نے ۱۸ اپریل ۱۹۹۳ء کو نواز حکومت کو برطرف کر دیا۔ سپریم کورٹ نے ۲۶ مئی ۱۹۹۳ء کو یہ حکومت بحال کر دی۔ حکومت کی بحالی کے بعد بھی صدر اور وزیر اعظم میں محاذ آرائی جاری تاہم ۱۹ جولائی ۱۹۹۳ء کو یہ صورت حال ختم ہوگئی کیونکہ فوج کی مداخلت پر غلام اسحاق خاں اور نواز شریف دونوں اپنے عہدوں سے مستعفی ہو گئے۔

۱۹۹۳ء کے عام انتخابات

۶ اور ۱۹ اکتوبر کو ملک میں عام انتخابات کا انعقاد کیا گیا۔ پاکستان پیپلز پارٹی نے اسمبلی میں ۸۶ جبکہ پاکستان مسلم لیگ (ن) نے ۷۳ نشستیں حاصل کیں۔

بے نظیر بھٹو کا دوسرا دورِ وزارت

(۱۹۹۳ء تا ۱۹۹۶ء)

۱۹۹۳ء کے انتخابات کی بنیاد پر بے نظیر بھٹو نے ۱۹ اکتوبر ۱۹۹۳ء کو بطور وزیر اعظم حلف اٹھایا۔ پنجاب میں پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ (ن) نے مل کر مخلوط حکومت تشکیل دی۔ بے نظیر بھٹو کی وزارت کے دوسرے دور میں بے نظیر اور نواز شریف کے درمیان محاذ آرائی جاری رہی۔ سیاسی مخالفین کو انتقام کا نشانہ بنایا گیا۔ صدر فاروق احمد لغاری نے ۵ نومبر ۱۹۹۶ء کو بے نظیر حکومت کو برطرف کر دیا اور انتخابات

کے لیے معراج خالد کو نگران وزیر اعظم مقرر کیا۔

[کون کیا ہے صفحہ ۱۴۳]

سردار فاروق خان لغاری

(۱۹۹۳ءتا ۱۹۹۷ء)

۱۳/نومبر ۱۹۹۳ء کو صدارتی انتخابات کا انعقاد کیا گیا جس میں پیپلز پارٹیز کے امیدوار سردار فاروق خان لغاری نے ۲۷۴ ووٹ حاصل کر کے پاکستان مسلم لیگ (ن) کے امیدوار وسیم سجاد کو شکست دی۔ سردار فاروق خان لغاری کے عہد صدارت کا ایک اہم واقعہ بے نظیر بھٹو کی وزارت کی برطرفی ہے۔ بعد ازاں ۲/دسمبر ۱۹۹۷ء کو صدر اپنے عہدہ سے مستعفی ہو گئے۔

صدر فاروق خان لغاری کی چوری و بددیانتی

ایوانِ صدر کے سیکرٹری الطاف گوہر لکھتے ہیں کہ فاروق لغاری جب صدر بنے تو انہوں نے اپنے پہلے خطاب میں بہت سی باتیں کیں جو اچھی اور قابلِ عمل تھیں جس مین انہوں نے رشوت ستانی اور بدعنوانی کا بھی ذکر کیا مگر دبے لفظوں میں اتنا تو فرمایا کہ رشوت کا کاروبار حکومت کی ہر سطح پر چل رہا ہے مگر یہ نہ کہا کہ ''چوں کفر از کعبہ بر خیزد کجا ماند مسلمانی'' جب تک وزیر اعظم اور ان کے ساتھی بے ایمانی، بدعنوانی، رشوت ستانی، کمیشن سازی، قرض خوری اور سودوں میں دولتی مارنا جائز سمجھتے رہیں گے اور غریب عوام کے خون پسینے کی کمائی کو مالِ مفت سمجھ کر ہڑپ کرتے جائیں گے۔ حکومت کی ہر سطح پر رشوت ستانی اور اقرباء پروری ہوتی رہے گی۔ اب پہلے والا دور نہیں رہا۔ کہ راشی حضرات اب اپنا حصہ یوں وصول کرتے ہیں کہ اس کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ مگر ایک پرانا اصول آج بھی ہماری رہنمائی کر سکتا

ہے اور وہ اصول یہ ہے کہ انسان بالخصوص اہل اقتدار اپنی شہرت کی حفاظت کریں۔ شہرت عورت کی آنکھ کی طرح ہے۔ ایک دفعہ شرم جاتی رہے تو پھر خوش اعمالی کا کوئی ثبوت کام نہیں آتا۔ یہ درست ہے کہ لوگ اپنے حریفوں کی شہرت کو خراب کرنے کے لیے طرح طرح کے الزامات لگاتے رہتے ہیں مگر انسان کا اپنا ضمیر سب سے بڑا قاضی ہے کسی اعلیٰ عہدہ دار پر جب رشوت ستانی یا بدعنوانی کا الزام لگے تو اسے چاہیے کہ وہ بلا تأخیر اپنے آپ کو مؤاخذہ کے لیے پیش کر دے۔ ابھی چند ہفتوں کی بات ہے کہ ایک بین الاقوامی ادارے نیٹو کے سیکرٹری جنرل پر رشوت ستانی کا الزام لگا اور ثبوت کے طور پر ایک پندرہ سال پرانے تجارتی سودے کی طرف اشارہ کیا گیا۔ سیکرٹری جنرل اپنی بے گناہی پر اصرار کرتے رہے مگر ان کی قومی اسمبلی نے معاملہ عدالت کے سپرد کر دیا۔ ہمارے ہاں ٹیپ پر وہ گفتگو سنائی جاتی ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مہران بینک کے اسکینڈل میں سردار فاروق احمد لغاری آصف زرداری، آفتاب شیر پاؤ، انور سیف اللہ اور کئی سیاسی شخصیتیں بری طرح سے آلودہ ہیں۔ حیرت ہے کہ ان میں سے کسی ایک شخص کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ اپنے دامن سے رشوت ستانی کا سیاہ دھبہ مٹانے کے لیے کسی عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے، ساری بات ہنسی مذاق میں ڈال دی گئی۔ افواج پاکستان کے سابق سربراہ مرزا اسلم بیگ نے سرعام اقرار کیا تھا کہ انہوں نے مہران بنک سے چوبیس کروڑ روپے حاصل کیئے۔ چودہ کروڑ تو اپنے خفیہ اداروں کو دے دیئے اور باقی؟ حساب دوستاں دردل، ان کو حکومت نے کسی عدالت کے سامنے پیش نہیں کیا۔ وہ بڑے زوروں سے کہتے تھے کہ میں واحد شخص ہوں جس نے مہران بینک سے روپیہ بھی لیا اور پھر بڑی جرأت سے اسے تسلیم بھی کر لیا۔ وہ فرماتے تھے کہ مجھے گھر بیٹھ کر تسبیح کے دانے گننے کی ضرورت نہیں۔ مجھے تو اللہ نے اتنا دیا ہے کہ میں لوگوں کو انگلیوں پر نچا سکتا ہوں۔

سردار فاروق احمد لغاری جب صدرِ مملکت کے عہدے پر فائز ہوئے تو لوگوں کو ان سے بڑی امیدیں تھیں۔ وہ ایک تعلیم یافتہ، تجربہ کار سیاست دان تھے۔ اور روپے پیسے کے معاملے میں بھی ان کی شہرت اچھی تھی۔ عام خیال یہی تھا کہ ان کے دورِ اقتدار میں حکومت کا کاروبار صحت مندانہ روش پر چلے گا مگر مہران بینک اسکینڈل نے ان کی شہرت اور نیک نامی پر سوالیہ نشان لگا دیا۔ انہوں نے اپنی زمینوں کو یونس حبیب کے ذریعے گمنام لوگوں کے ہاتھوں فروخت کر دیا تھا۔ پھر یہ بات زیرِ بحث رہی کہ وہ زمین خریداروں کے قبضے میں ہے یا سردار فاروق لغاری کے قبضے میں؟ وزیرِ داخلہ نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ زمین مہران بینک کی ملکیت ہے اس سے معاملہ اور الجھ گیا تھا جب مملکت کے سربراہ کے بارے میں اس طرح کے الزامات قومی اسمبلی میں لگائے جائیں اور حکومت کی طرف سے ان کی کوئی وضاحت بھی پیش نہ کی جائے تو عوام کی تشویش کا آپ اندازہ کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب تک یہ سارا معاملہ طے نہیں ہو جاتا صدر مملکت کی طرف سے رشوت ستانی اور بدعنوانی کو ختم کرنے کا مطالبہ شک کی نظر ہی سے دیکھا جائے گا۔

لوگ یہ ماننے کو تیار تھے کہ ممکن ہے سردار فاروق احمد لغاری سے کسی غلط فہمی کی بنا پر غلطی ہو گئی ہو لیکن دو باتیں ثابت ہو چکی تھیں۔ زمین کا خریداروں کے نام انتقال ہونا اور سردار فاروق کا زمین کی قیمت بذریعہ چیک وصول کرنا اس بنا پر جب تک یہ معاملہ عدالتی سطح پر طے نہ ہوتا لغاری صاحب کو اپنی نیک نامی کی خاطر وصول شدہ رقم مہران بینک کو واپس کر دینی چاہیئے تھی۔ اگر اس بات کا اعلان لغاری صاحب اپنے خطاب میں کر دیتے تو ملک بھر میں ان کے اس اقدام کی تعریف کی جاتی۔ پھر یہ سوال بھی نہ اٹھتا کہ زمین کس کی ملکیت میں تھی اور اس کی پیداوار سے کون فائدہ اٹھاتا رہا سردار لغاری اگر بعد میں یہ اعلان فرما دیتے اور زمیں کی قیمت

اور اس کی پیداوار سے حاصل شدہ رقم مہران بینک کو واپس کر دیتے تو بطور صدر مملکت ان کے لیے یہ ممکن ہو سکتا تھا کہ وہ حکومت کے کاروبار سے رشوت ستانی اور بدعنوانی کا خاتمہ کر سکتے۔

اس اعلان کے دوسرے ہی دن آپ دیکھتے کہ آصف زرداری صاحب اپنے گھوڑوں کی خریداری اور ان کی دیکھ بھال کے بارے میں ساری تفصیلات عوام کے سامنے رکھنے پر مجبور ہو جاتے۔ ٹی وی پر آپ جو پرائم منسٹر ہاؤس میں گالف کورس اور ریس کا میدان بنایا گیا ہے اسے بھی دیکھ لیتے اور ان تمام غیر ملکی اور ملکی اَطبّاء سے بھی آپ کا تعارف ہو جاتا جو گھوڑوں کی صحت اور پرورش کے ذمہ دار تھے۔ تمام سائیس بھی آپ کے سامنے آجاتے جو ایئر کنڈیشنز کمروں میں گھوڑوں کے ساتھ اپنا وقت گزارتے تھے۔ دوسرے وزیر اور مشیر بھی اپنی مال سازی کی حکایات بیان کرنے لگ جاتے۔

لوگوں کا اعتماد اٹھ چکا تھا۔ ریاست کے ادارے بری طرح مجروح ہو چکے تھے۔ صدرِ مملکت نے جب اپنے خطاب کا آغاز سورہ رحمٰن سے کیا تو ان کا فرض تھا کہ وہ انصاف کے ترازو کو زور سے تھام لیتے اور کسی کو ریاست کے میزان میں خلل ڈالنے کی اجازت نہ دیتے۔ اگر یہ ممکن نہ تھا تو پھر سورۃ رحمٰن کی آیات کی طرف اشارہ کرنا اخفاء اور ریا کے سوا کوئی مطلب نہیں رکھتا۔

[لکھتے رہے جنوں کی حکایت ص ۳۵۶]

میاں نواز شریف کا الزام

قائد حزب اختلاف نواز شریف نے الزام لگایا کہ صدر مملکت فاروق لغاری نے ڈیرہ غازی خان میں اپنی بنجر زمین کراچی کے ایک بدنام بینک کار یونس حبیب کو بیچ کر ڈیڑھ کروڑ روپے کی رقم حاصل کر لی۔ وزیر داخلہ نصیر اللہ بابر نے کہا کہ

میاں نواز شریف نے اپنے الزام کے ثبوت میں جو دستاویزات پیش کی ہیں وہ سب جعلی ہیں اور زمین کا سودا یونس حبیب سے نہیں کراچی کی چھ کمپنیوں سے ہوا ہے۔

حکومت کی طرف سے یہ شکایت بھی کی گئی ہے کہ الزامات صدر کی ملک سے غیر موجودگی میں لگائے گئے جو نازیبا حرکت تھی۔ صدر لغاری ملک واپس تشریف لائے تو انہوں نے تمام الزامات کو لغو قرار دیتے ہوئے یہ دھمکی دی کہ وہ میاں نواز شریف پر ہتکِ عزت کا مقدمہ دائر کریں گے اور یہ ثابت کریں گے کہ زمین کے سودے کے بارے میں ان پر جو بہتان لگایا گیا ہے وہ قطعی طور پر بے بنیاد ہے۔ صدر لغاری نے واضح لفظوں میں یہ اعلان بھی کیا کہ وہ یونس حبیب نامی کسی شخص کو نہیں جانتے اور نہ کسی ایسے شخص سے ان کا کوئی کاروبار رہا ہے۔

کوئی دس دن بعد صدرِ مملکت کی طرف سے حکومت پاکستان کے ایک سرکاری ترجمان نے وضاحت کی کہ صدر فاروق لغاری کی کسی دی، آئی، پی لاؤنج میں یونس حبیب سے ملاقات ہوئی تھی اور انہوں نے یونس حبیب سے جو میمن بھی ہے اور بینک کار بھی، یہ کہا تھا کہ اگر کراچی میں زرعی زمین خریدنے کے کوئی خواہش مند ہوں تو وہ انہیں اس کی اطلاع کر دیں۔ اب پردے اٹھنے لگے۔ یہ قطعی طور پر ثابت ہو گیا کہ زمین کا سودا یونس حبیب کی وساطت سے ہوا تھا اور زمین خریدنے والے چھ حضرات یونس حبیب کے ذاتی ملازم اور رشتہ دار تھے۔

اس ساری بات کا صدر صاحب پر کوئی اثر نہ ہوا۔ ان کے حلیفوں اور مداحوں نے کہنا شروع کیا ''بھئی کافی ہو گیا ہے اب کہاں تک اس معاملے کو طول دیتے چلے جائیں گے'' صدر نے یونس حبیب کے بارے میں جو غلط بیانی کی تھی اس کے لیے یہ جواز نکالا گیا کہ صدر'' اس وقت ذہنی دباؤ میں تھے'' جب وہ ذہنی دباؤ ختم ہوا تو صدرِ مملکت نے اپنے دامن پر نظر ڈالنے کی بجائے حکومت سے کہا کہ حزب

اختلاف کے قائد کی بدعنوانیوں کی تصویر آشکار کرنی چاہیے۔ حکومت نے ایک طویل الزام نامہ ملک بھر میں مشتہر کیا جس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ میاں نواز شریف جب اقتدار میں تھے تو ان کی تجارتی اور صنعتی کمپنیوں نے یونس حبیب کے مہران بینک سے آسان شرطوں پر قرض حاصل کئے تھے۔ عوام کی نظریں میاں صاحب کے دامن کی طرف اٹھ گئیں۔ انہوں نے اپنے دفاع میں ایک طویل احوال نامہ جاری کیا۔ اس احوال نامہ نے میاں صاحب کے دامن پر جتنے داغ تھے صاف کر دیئے۔ ہر الزام کو جھوٹ قرار دیا گیا مگر اپنے دفاع میں جو وضاحت پیش کی گئی اس سے یہ ظاہر ہو گیا کہ میاں نواز شریف اور ان کے کاروباری اداروں نے مہران بینک سے قرض ضرور حاصل کئے تھے۔ یہ بھی اقرار کیا گیا کہ سال بھر تک اگر کسی قرض کی ادائیگی نہیں ہوتی تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ اس لیے کہ اسٹیٹ بینک سال بھر کی فروگزاشت کو ''نادہندگی'' تصور نہیں کرتا۔ احوال نامہ میں یہ بھی کہا گیا کہ میاں نواز شریف کے اتفاق گروپ نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ نواز شریف کے وزیراعظم بننے کے بعد ان کا گروپ صرف غیر ملکی مالی اداروں سے معاونت حاصل کرے گا مگر اس بات کا کوئی جواب نہ دیا گیا کہ اس فیصلے کے باوجود اتفاق گروپ کے مہران بینک سے مالی روابط کیوں قائم رہے۔

یہ بات بھی تسلیم کی جا چکی ہے کہ میاں نواز شریف کے ایک قریبی ساتھی اور ان کی کابینہ کے وفاقی وزیر داخلہ چوہدری شجاعت حسین نے مہران بینک سے کئی کروڑ کا قرضہ لیا۔ چوہدری صاحب نے کہا کہ قرض لیا ہے ڈاکہ تو نہیں ڈالا، چوری تو نہیں کی۔ قرض ادا نہیں کیا تو کیا ہوا اوروں کی طرح معاف تو نہیں کروایا اور جو روپیہ لیا ہے واپس کروں گا مگر پہلے وزیراعظم کے خسر حاکم علی زرداری اپنا قرض ادا کریں۔

اس الزام تراشی میں اب کوئی اصول، کوئی ضابطہ، کوئی اخلاقی قدر مانع نہیں

رہی ہر ایک کا دامن داغدار نہیں۔ تار تار ہوتا دکھائی دے رہا ہے اور عام لوگوں کا یہ تأثر مستحکم ہوتا جا رہا ہے کہ ''یہ سب چور ہیں'' یہ سارا معاملہ ایک عدالتی کمیشن کے سپرد ہو گیا مگر حکومت کمیشن کی کاروائی سے بے نیاز اپنے الزامات کی دنیا بھر میں تشہیر کرتی رہی حزبِ اختلاف عدالتی کمیشن سے کسی قسم کا تعاون کرنے کے لیے تیار نہیں تھی اس لیے کہ اسے کمیشن پر اعتماد نہیں تھا۔ اسی طرح یہ مطالبہ کیا جا رہا تھا کہ ایک پارلیمانی کمیٹی بنائی جائے جو اس سارے معاملے کی تحقیق کرے۔

مہم کا آغاز چونکہ میاں نواز شریف کی طرف سے ہوا تھا اس لیے لازم تھا کہ وہ اپنے دامن کا جائزہ لیتے۔ اپنے ضمیر کو جواب دیتے۔ اگر اپنے اقتدار کے زمانے میں ان سے کوئی غلطی ہوئی ہے تو صدق دل سے ان کا اعتراف کریں۔ ہر شخص اپنے اعمال کے لیے جواب دہ ہے۔ صدر فاروق احمد لغاری اپنی جگہ میاں نواز شریف اپنی جگہ۔ ملک اور قوم کی بھلائی اسی میں ہے کہ دونوں حضرات سفید چادریں اتار کر رکھ دیں اور فقیر کے ارشاد پر عمل کریں ؎

چٹی چادر لا چھڈ کڑیئے
اوڑھ فقیر دی لوئی
چٹی چادر داغ لگو گا
لوئی نوں داغ نہ کوئی

امیروں کی سفید چادر اتار پھینکو اور فقیر کی کملی اوڑھ لو، سفید چادر پر داغ لگے گا اور یہ کملی بے داغ رہے گی۔

دونوں طرف کے سیاسی رہنما یہ نہ بھولیں کہ وہ عوام کا اعتماد کھو چکے ہیں ان میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو دوبارہ عوام کا اعتماد حاصل کرنے کے قابل ہیں مگر انہیں اپنے اعمال نامہ کا خود جائزہ لینا ہوگا۔ توبہ کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا مگر توبہ

اسی صورت میں قبول ہوتی ہے جب انسان یہ وعدہ کر لے کہ آئندہ وہ بداعمالی کی راہ سے دور رہے گا۔ عوام کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے اور وقت آنے والے ہے جب وہ سیاست دانوں سے کہیں گے ''بہت ہو چکی اپنا پاندان اٹھایئے اور جایئے''

[لکھتے رہے جنوں کی حکایت ۴۵۴]

نواز شریف کی وزارت کا دوسرا دور

(۱۹۹۷ء تا ۱۹۹۹ء)

۱۹۹۷ء میں عام انتخابات کا انعقاد کیا گیا جس میں مسلم لیگ (ن) نے قومی اسمبلی کی ۱۳۴ نشستیں جیت کر واضح برتری حاصل کی۔ اس کے نتیجے میں ۱۷ فروری ۱۹۹۷ء کو میاں نواز شریف نے وزیر اعظم کا عہدہ سنبھالا۔ صوبہ پنجاب میں شہباز شریف کو وزیرِ اعلیٰ منتخب کیا گیا۔ صوبہ سندھ میں پاکستان پیپلز پارٹی کے لیاقت جتوئی صوبہ سرحد میں پاکستان مسلم لیگ (ن) کے مہتاب عباسی نے وزارت تشکیل دی۔

نواز شریف کی وزارت کے دوسرے دور کے اہم واقعات درج ذیل ہیں:

(i) ۲۶ رنومبر ۱۹۹۷ء کو لاہور، اسلام آباد موٹر وے کا افتتاح کیا گیا۔

(ii) ۱۳ راگست ۱۹۹۷ء کو انسداد دہشت گردی کا بل منظور کیا گیا۔

(iii) ۲۸ رمئی ۱۹۹۸ء کو پاکستان نے چاغی کے مقام پر پانچ ایٹمی دھماکے کیے جس سے وہ ایٹمی قوت رکھنے والا دنیا کا ساتواں ملک بن گیا۔

(iv) اپریل ۱۹۹۷ء میں تیرہویں ترمیم، جولائی ۱۹۹۷ء میں چودھویں ترمیم اور اگست ۱۹۹۸ء میں آئین میں پندرھویں ترمیم منظور کی گئی۔

(v) ۲۱ رفروری ۱۹۹۹ء کو بھارتی وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی اور میاں نواز شریف نے قرار دادِ لاہور پر دستخط کیے۔

(vi) مئی اور جون ۱۹۹۹ء میں کارگل کے مقام پر پاک بھارت افواج میں جھڑپیں ہوئیں۔

میاں نواز شریف کی سادگی یا غلط فہمی؟

مجید نظامی اپنی سوچوں کے آسمان ، وادیوں اور میدانوں میں بکھری ہوئی باتوں کے ڈھیر کو یادوں کی ہواؤں سے کریدتے تھے وہ کہتے ہیں کہ انہیں ایک مرتبہ منگلا میں ایک لیکچر دینے کے لیے بلایا گیا۔ جن دنوں وہ لیکچر کے لے منگلا گئے تھے اس وقت پرویز مشرف منگلا کے کور کمانڈر تھے۔ کچھ دنوں بعد اچانک خبر ملی کہ انہیں چیف آف آرمی سٹاف بنا دیا گیا ہے اور یہ انتخاب ''معیار اور باری کے بغیر ہے'' مجید نظامی نے نواز شریف اور میاں صاحب سے پوچھا:

یہ آپ اجنبی گھر میں کہاں سے لے آئے ہیں؟

تو میاں صاحب کہنے لگے:

اِدا اَگا پیچھا کوئی نہیں۔

تو مجید نظامی نے کہا:

دراصل یہ آپ کی غلط فہمی ہے ...فوج میں (چیف آف آرمی سٹاف) سردار ہوتا ہے اور فوج سردار کی سرداری کو مانتی ہے لہذا یہ نہ کہیے کہ ''اگے پچھے کوئی نیں'' اس کے بعد سب نے دیکھا کہ پرویز مشرف نے Coup detat کیا۔

[جب تک میں زندہ : دل ص ۱۰۳]

پرویز مشرف

(۱۹۹۹ء تا حال)

۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو جنرل پرویز مشرف نے نواز شریف کی حکومت کو برطرف کر

کے ملک کا انتظام خود سنبھال لیا۔ ۱۹۷۳ء کے آئین پر عمل درآمد روک کر عارضی آئینی حکم نمبر ایک جاری کیا گیا۔ پرویز مشرف نے بطور صدر اور چیف ایگزیکٹو کے اختیارات سنبھال لیے۔

نواز شریف کی جمہوری حکومت پر شب خون کیوں مارا گیا؟

نواز شریف اور جنرل پرویز مشرف کے مابین اندرون خانہ کچھ اختلاف چلے آرہے تھے۔ جنرل پرویز مشرف کو یہ خطرہ تھا کہ نواز شریف انہیں ہٹا کر کسی اور کوان کی جگہ پر مقرر کرنے والے ہیں۔ جنرل پرویز مشرف نے پہلے سے ہی یہ اعلان کیا ہوا تھا کہ نواز شریف جنرل جہانگیر کی طرح استعفیٰ لے کر مجھے فارغ کرنا چاہیں گے تو میں ایسا ہرگز نہیں کروں گا۔ اسی اندرونی کشمکش کے دوران پرویز مشرف سری لنکا میں ایک اجلاس میں شرکت کرنے کے لیے چلے گئے۔ اوران کو پوری طرح خدشہ تھا کہ نواز شریف مجھے کہیں ریٹائر نہ کردیں اسی ڈر کے ساتھ یہاں سے گئے اور اسی ڈر کی کیفیت میں وہاں سے لوٹے۔ واپسی پر طیارہ کیس کی جو کہانی پرویز مشرف نے بیان کی ہے نواز شریف اور اس کا خاندان اس کو قطعی طور پر بے بنیاد قرار دیتا ہے۔ چنانچہ بیگم کلثوم نواز شریف نے جو اپنی کتاب ''جبر اور جمہوریت'' لکھی ہے اس سے یہی محسوس ہوتا ہے کہ نواز شریف اور اس کا خاندان اس کہانی کو بے بنیاد قرار دیتے ہیں البتہ یہ بات درست ہے کہ نواز شریف نے پرویز مشرف کو (۱۲ اکتوبر) ریٹائرڈ کر کے جنرل ضیاء الدین بٹ کوان کی جگہ مقرر کردیا تھا اور یہ اعلان ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر بھی ہو چکا تھا۔ اسی بات کا انتقام لینے کے لیے (۱۲ / اکتوبر ۱۹۹۹ء کو واپسی پر) جنرل مشرف نے طیارہ کیس والی کہانی از خود گھڑ لی اور اپنے ساتھی جرنیلوں تک پہنچائی۔ انہوں نے نواز

شریف حکومت کا تختہ الٹ کر حکومت پر قبضہ کر لیا اور نواز شریف، شہباز شریف اور نواز شریف کے بیٹے حسین نواز اور چند دیگر ساتھیوں کو گرفتار کر کے نامعلوم مقام پر منتقل کر دیا۔ اور بعد میں پھر ان پر مقدمہ چلا۔ مقدمے کا جو فیصلہ ہوا اس کے مطابق نواز شریف اور شہباز شریف کو مجرم قرار دیا گیا اور دوسرے افراد کو رہا کر دیا گیا۔ کچھ عرصہ جیل میں رہنے کے بعد مارشل لاء حکومت سے ڈیل کے بعد سعودی عرب کے شاہ عبداللہ، نواز شریف خاندان کو مہمان کے طور پر سعودی عرب لے گئے اور جدہ میں رہنے کے لیے ان کو ایک بنگلہ دے دیا۔ اس طرح نواز شریف خاندان ملک بدر ہے حکومت انہیں ملک میں آنے نہیں دیتی۔

وزیر اعظم جونیجو کی توہین آمیز برطرفی

جنرل پرویز مشرف سمجھتے ہیں کہ نواز شریف نے جو ان کے ساتھ سلوک کیا اس میں پورے فوجی ادارے کی توہین تھی اس توہین کا انتقام جنرل پرویز مشرف نے یوں لیا کہ پہلے تو نواز شریف اور ان کے رفقاء کو جیل میں ڈالے رکھا اور پھر بعد میں ان کے ساتھیوں کو تو رہا کر دیا لیکن نواز شریف اور ان کی پوری فیملی کو ملک بدر کر دیا اور ان کی ملک واپسی پر بھی پابندی لگا دی۔ جبکہ نواز شریف کو چیف آف آرمی سٹاف مقرر کرنے اور ان کو برطرف کرنے کا آئینی طور پر پورا اختیار تھا۔ جس طرح پرویز مشرف نے نواز شریف کے ساتھ سلوک کیا۔ اسی طرح پرویز مشرف کے پیٹی بند بھائی جنرل ضیاء الحق نے وزیر اعظم محمد خان جونیجو کی توہین آمیز طریقے سے ''ڈس مس'' کیا تھا۔

حالانکہ جونیجو پاکستان کی تاریخ کے سب سے زیادہ شریف النفس اور پاکستان کی دولت کو اپنی دولت نہ سمجھنے والے وزیر اعظم تھے۔ وہ جاپان کے غیر ملکی ٹور پر تھے کہ ایک رات محمد خان جونیجو نے مجید نظامی کو فون کرتے ہوئے کہا کہ سائیں ہم باقی ٹور

کینسل کر رہے ہیں صبح واپسی کی تیاری کریں۔

گویا جونیجو سمجھ گئے تھے کہ ضیاء الحق نے انہیں برطرف کر دیا ہے۔ اگر برطرف کرنا ہی تھا تو غیر ملکی ٹور سے پہلے یا ٹور کے مکمل ہونے کے بعد ملک واپس پر بھی کیا جا سکتا تھا۔

لیکن ضیاء الحق نے ٹھیک اس وقت جب آپ غیر ملکی (جاپان کے) دورے پر تھے وہ دورہ جو حکومت پاکستان کی طرف سے مقرر تھا اور جس پر وطن عزیز کے لاکھوں روپے لگے ہوئے تھے کے دوران ہی ۱۶ کروڑ عوام کے منتخب وزیر اعظم محمد خان جونیجو کو توہین آمیز طریقے سے ''ڈس مس'' کر دیا۔

ہم جنرل پرویز مشرف سے پوچھتے ہیں کہ آپ نے تو نواز شریف کی کاروائی کو توہین آمیز سمجھا لیکن جو آپ کے چیٹی بند بھائی ضیاء الحق نے ۱۶ کروڑ عوام کے منتخب وزیر اعظم سے جو سلوک کیا آپ اسے ۱۶ کروڑ عوام کی توہین نہیں سمجھتے؟

اگر سمجھتے ہیں تو اس وقت اس توہین آمیز کاروائی سے آپ نے اپنے چیف کو کیوں نہیں روکا؟ اور آج تک آپ نے کسی محفل و مجلس میں اس پر تنقید کی بھی نہیں۔ گویا کہ آپ ان کی اس کاروائی پر راضی تھے۔ ۱۶ کروڑ عوام تو اپنی توہین کا جنرل ضیاء الحق سے بدلہ نہ لے سکے لیکن قدرت نے جو ان سے انتقام لیا وہ سب کے لیے عبرت کا نشان ہے۔ جس ذات نے ضیاء الحق کو عبرت کا نشان بنایا وہ آپ سے بھی انتقام لینے کی قدرت رکھتی ہے اس ذات سے ڈرنا چاہیے جس کی لاٹھی بے آواز ہے۔

وردی کا مسئلہ

پرویز مشرف نے بیک وقت دو عہدے اپنے پاس رکھے ہوئے ہیں۔ صدر اور چیف آف آرمی سٹاف پاکستان کی عوام ان دونوں عہدوں کو اپنے پاس رکھنے کو پسند

نہیں کرتی۔اصولی طور پر یہ چیف آف آرمی سٹاف ہیں اور ملازم ہیں۔اور کوئی ملازم آئینی طور پر ملک کا سربراہ نہیں بن سکتا مگر پرویز مشرف فوج کی طاقت سے دونوں عہدوں پر فائز چلے آرہے ہیں اور ملک میں شدید مخالفت پائی جاتی ہے چنانچہ گزشتہ سال متحدہ مجلس کے ساتھ ق لیگ کے صدر شجاعت حسین کی وساطت سے ایک معاہدہ طے پایا جس کے مطابق ایک مقررہ تاریخ تک دونوں عہدوں پر فائز رہیں گے اور اس کے بعد ایک عہدہ کو چھوڑ دیں گے لیکن بعد ازاں پرویز مشرف نے اس معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کوئی عہدہ چھوڑا نہیں۔اس طرح انہوں نے پاکستانی قوم سے جھوٹ بولا اور دھوکہ دیا۔لہٰذا ایسا آدمی دونوں عہدوں کے قابل نہیں ہے۔حدیث میں ذکر آیا ہے جو بادشاہ ہوکر قوم سے جھوٹ بولتا ہے اور وعدہ خلافی کرتا ہے اس کی دبر پر قیامت کے دن ایک جھنڈا لگایا جائے گا اور سارے محشر کے سامنے اس کی تذلیل کی جائے گی کہ یہ فلاں دھوکے باز ہے جس کے بارے میں حدیث میں ایسی سزا آئی ہوں بھلا وہ اسلامی ملک کا سربراہ کیسے بن سکتا ہے؟

بیگم کلثوم نواز شریف لکھتی ہیں:

''اس حکومت سے سالمیت پاکستان کو جتنا خطرہ آج ہے اس سے پہلے کبھی نہ تھا۔اس کا اندازہ صرف اور صرف وہی شخص کرسکتا ہے جس کے اندر جذبہ حب الوطنی ہو۔مہنگائی کے اس دور میں موجودہ حکومت نے ہنود و یہود کی سوچی سمجھی سازش کے تحت چودہ کروڑ عوام کے منہ سے روٹی کا آخری نوالہ بھی چھین لیا ہے۔قوم سے ٹیکسوں اور مہنگائی کے نتیجہ میں اکٹھا کیا گیا پیسہ ملک کے کسی کام نہیں آرہا بلکہ خود ساختہ حکومت کی ناقص کارکردگی کے باعث ملک کے لیے حاصل کیے گئے قرضوں پر سود کے طور پر ادا کیا جارہا ہے۔

اس وقت کرپشن پاکستان کی ۶۰ سالہ تاریخ میں اپنے عروج پر ہے۔ڈیفنس

ایریاز میں حکومت کے منظور نظر اور چہیتوں کو پلاٹس دینے کی لوٹ سیل لگی ہوئی ہے۔ کہیں پلاٹس رشوت میں دیئے جا رہے ہیں اور کہیں مربعے الاٹ کیے جا رہے ہیں۔ عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے نیوی کے سابق چیف منصور الحق کو وطن واپس لانے کی جھوٹی طفل تسلی دی جا رہی ہے۔ مگر ملک کے اندر منصور الحق کے کئی کرپٹ بھائی حکومت کے پروں تلے پناہ لئے ہوئے ہیں۔ ان میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جنہوں نے اسلام آباد میں ۳۴ لاکھ کا پلاٹ لے کر سوا کروڑ کا بیچا۔ جنہوں نے مہنگی ترین گاڑیاں کسٹم ڈیوٹی دیئے بغیر خریدیں اور مہنگے داموں بیچ ڈالیں۔ وہ لوگ جن کی دس پندرہ سال پہلے بے سروسامانی کا یہ عالم تھا کہ کینٹین کنٹریکٹر کے مقروض ہوا کرتے تھے آج کروڑ پتی کیسے بن گئے؟ قوم پوچھ رہی ہے جو بچے کل تک اپنے بیٹ مین کے ساتھ سائیکل پر بیٹھ کر کینٹ پبلک سکول جایا کرتے تھے آج وہ پاکستان کے مہنگے ترین علاقوں میں محلات نما کوٹھیوں، لمبی لمبی گاڑیوں اور چار چار مربعوں میں پھیلی ہوئی انڈسٹریل سٹیٹ کے مالک کیسے بن گئے؟

قوم پوچھتی ہے: کیا یہ جائیداد ان کو آباؤ اجداد سے ورثہ میں ملی ہے یا خاکی کرائم کالر کا کرشمہ ہے؟ کیا ان لوگوں کو احتساب دیمک کی طرح چاٹ گئے۔ اور خود مشکل کی گھڑی میں عوام اور اپنی فوج کو بے یارو مددگار دشمن کی قید میں چھوڑ کر کفن کے اوپر پاکستانی جھنڈا اوڑھ کر قبر میں گھس گئے۔ مگر انتقام قدرت دیکھیے: ۲۸ سال بعد حمود الرحمٰن کمیشن کی رپورٹ کی صورت میں قیامت تک ذلت آمیز تاریخی فیصلہ ان کی قبروں کا کتبہ بن گیا ہے۔ میں کہتی ہوں کہ فوج کے خود احتسابی عمل اور نام نہاد شفاف پروموشن سسٹم پر قوم کا ہر فرد انگشت بدنداں ہے جس سے گزر کر شکست خوردہ ذہن اور کرپٹ مافیا اعلیٰ عہدوں پر پہنچ کر پاک فوج پر مسلط ہو جاتا ہے۔ یہ لوگ ایک بار نہیں کئی بار پروموشن کے ان مراحل سے گزر کر اعلیٰ رینک پر پہنچتے ہیں۔ اب یقین ہو گیا

ہے کہ ان لوگوں کی ترقی کے پیچھے میرٹ نہیں بلکہ کنبہ پروری، اقربا پروری اور رشتہ داری کی اجارہ داری کارفرما ہے۔ اگر انہوں نے میرٹ پر فوج میں اعلیٰ رینک حاصل کیے ہوتے تو نہ تو مسلمانوں کی تاریخ کو داغ دار کرنے کے لیے ایک مسلمان جنرل کسی اروڑہ سنگھ کے آگے ہتھیار پھینکتا بلکہ موت کو ترجیح دیتا اور ابدی زندگی پاتا اور نہ کسی جنرل یحییٰ کی بوسیدہ ہڈیوں کو قوم کوستی اور نہ کوئی پرویز مشرف جیسا جنرل اس ملک میں اسلامی قانون کے نفاذ کی راہ میں رکاوٹ بننے کا شرف حاصل کرتا۔ آخر کب تک یحییٰ، کاکڑ، نیازی اور 'نیازی نما' پرویز حکمران جیسے بددیانت اور مجاہدانہ عسکری روایات سے عاری لوگ فوج کے پاک اور باعزت ادارے کے نام کا سہارا لے کر قوم پر مسلط ہوتے رہیں گے؟ [جبر اور جمہوریت ص ۱۵۰]

محسن پاکستان کا حبس بے جا

دنیا میں ہر عالمی شہرت یافتہ افراد کی چند خوبیاں ہوتی ہیں جن سے دنیا متاثر ہو کر ان کو اس قدر عالی مرتبت اور بلند عظمت کا تمغہ عطا کرتی ہے۔ ان باکمال اور باصلاحیت لوگوں میں ڈاکٹر عبدالقدیر خاں کا بھی شمار ہوتا ہے۔ جنہوں نے اپنی ساری زندگی پاکستان کی سربلندی اور وقار کے لیے داؤ پر لگا دی ہے۔ ان کو کام کے دوران بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ بہت سی پریشانیوں نے گھیرے رکھا۔ بیوروکریسی نے بدنام کرنے کی کوششیں کیں۔ وسائل کی کمی کا بھی زمانہ دیکھا۔ غیروں نے تو ان کے خلاف پروپیگنڈا کیا بدنام کرنے کی کوششیں کی گئیں مگر انہوں نے بھی اس معاملے میں کسر نہ چھوڑی جن میں مسٹر منیر احمد کا نام سرفہرست لکھا جا سکتا ہے۔ مگر ڈاکٹر عبدالقدیر خاں ہی مرد آہن اور مرد مومن تھے جنہوں نے اس قدر مشکلات اور تکالیف کے باوجود بھی اپنے مقاصد میں پاکستان کی سالمیت اور بقا کی خاطر شب و روز کام کر

کے قوم کے نام کو دنیا میں سرخرو کیا اور آج قوم ان کا نام لینا فخر کی بات سمجھتی ہے۔ یہ صرف عبدالقدیر خان ہی مرد مجاہد ثابت ہوئے جن کی اللہ تعالیٰ نے اس پاک خطے کی سلامتی اور بقا کے لیے مدد کی اور وہ ان مشکلات کا ڈٹ کر مقابلے کرتے رہے ورنہ عام آدمی ایسی جرأت نہیں رکھتا اور نہ وہ ہر ایک سے لڑنا جھگڑنا ہی پسند کرتا ہے۔

جس کی وجہ سے ایسے اہم اور قومی منصوبے پایہ تکمیل کو کسی صورت میں نہیں پہنچ سکتے۔ ایسے خاص اشخاص اللہ تعالیٰ خصوصی مقاصد کے لیے ہی پیدا کرتا ہے جن میں ضرورت سے زائد صبر وتحمل اور ضبط کا مادہ ہوتا ہے۔ وہ جوش کی نسبت ہوش سے زیادہ کام لیتے ہیں تو ایسے افراد میں ڈاکٹر عبدالقدیر خاں کا نام سرفہرست لیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر عبدالقدیر کو ملک کے اندر بھٹو کے علاوہ ضیاء الحق، نواز شریف اور بے نظیر بھٹو نے بھی ''سپورٹ'' کیا۔ فوج سمیت ڈاکٹر عبدالقدیر کی سب نے ہمیشہ پذیرائی کرتے رہنا ہی اپنا فرض اولین سمجھا کیونکہ ڈاکٹر عبدالقدیر نے سمندر کی گہرائی سے موتی لا کر محبوب وطن کو تحفۂ پیش کر دیا تھا۔ طاقتور جوشیلے محبّ وطن افراد ناقابل تسخیر قلعوں کی تعمیر کیا ہی کرتے ہیں اور ایسے ہنر مند ہاتھوں اور روشن داموں کی نقش نگاری کی حفاظت نسلوں کا فریضہ بھی بن جایا کرتی ہے۔

اسی وجہ سے ڈاکٹر عبدالقدیر خان ''محسن پاکستان ہیں'' اور قوم کی دعائیں ان کے ساتھ ہیں۔ مگر موجودہ حکومت نے ''محسن پاکستان'' ڈاکٹر عبدالقدیر کو نظر بند کر رکھا ہے اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ایک ''ہیرو'' نظر بند ہے کیونکہ قوم اگر آج محفوظ ہے تو اللہ کی رحمت کے بعد ڈاکٹر عبدالقدیر کی محنتوں اور کاوشوں کی وجہ سے محفوظ ہے۔ بھارت نے بم بنانے والے مسلمان سائنس دان کو صدر بنا لیا ہے ہم نے اپنے ہیرو کو امریکہ کے کہنے پر نظر بند کر دیا ہے۔

ڈاکٹر عبدالقدیر پر یہ الزام ہے کہ انہوں نے ایران کو کچھ چیزیں بیچ دی تھیں کہوٹہ

کے انچارج کو بھی کچھ دن تک پکڑے رکھا حالانکہ یہ کوئی ایسی چیز نہیں تھی کہ چھپ کر ''جیب'' میں ڈال کر دے دی جاتی۔ اگر ایسا ہوا بھی ہے تو سب کے علم میں ہے اور فوج کے علم میں بھی ہوگا۔

انتہا پسندی اور جنرل مشرف

تجزیہ نگار عطاء الرحمن لکھتے ہیں کہ

یوم پاکستان کے موقع پر فوجی پریڈ کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے جنرل پرویز مشرف نے کہا ہے ''پاکستان کو مذہبی انتہا پسندی سے خطرہ لاحق ہے۔'' اس خطرے کا الارم جنرل صاحب اتنی مرتبہ بجا چکے ہیں کہ شمار ممکن نہیں۔ اس کے باوجود یہ ختم نہیں ہوا بلکہ فوجی حکمران کے پے در پے بیانات سے مترشح ہوتا ہے کہ پوری قوت کے ساتھ موجود ہے تو انہیں اپنی پالیسی پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔ ٹھنڈے دل کے ساتھ جائزہ لے کر ان خامیوں کی نشاندہی کرنی چاہیے جن کی بنا پر وہ سات سالہ بلا شرکت غیرے اپنی حکمرانی میں اس ''خطرے'' کو دور نہیں کر سکے۔ اس کے ساتھ اس انتہا پسندی کے بارے میں کیا ارشاد ہے جس میں خود کو صدر پاکستان کہنے اور منوانے والی شخصیت فوجی وردی زیب تن کر کے چیف جسٹس آف پاکستان کو آرمی ہاؤس میں طلب کرتی ہے' اپنے مشیروں اور دوستوں کے تیار کردہ بلکہ پہلے سے پھیلائے گئے الزامات اس کے سامنے رکھ کر استعفی طلب کرتی ہے چیف جسٹس کے انکار کرنے اور ڈٹ جانے کی صورت میں اسے آرمی ہاؤس میں پانچ گھنٹوں تک پابند کر کے رکھ دیا جاتا ہے۔ بعد میں جب اس معطلی کی کوئی آئینی بنیاد نہ ملی تو اسے ''غیر فعال'' بنانے کا عنوان دے دیا جاتا ہے کوئی دس روز بعد مردہ خانے سے پچھلے مارشل لائی دور کا ایک قانون نکال کر اعلان کیا جاتا ہے کہ چیف جسٹس کو جبری رخصت پر بھیج دیا گیا ہے گویا

آپ جرنیلی افتادِ طبع کے تحت من مرضی کا فیصلہ پہلے ٹھونستے ہیں۔ اس کا آئینی و وفاقی جواز بعد میں تلاش کرتے ہیں نہیں ملتا تو مشیر اور وزیر ٹامک ٹوئیاں مارتے ہیں، کبھی ایک آئینی شق کا سہارا لینے کی کوشش کرتے ہیں، کبھی گڑھے مردوں کو اکھاڑتے ہیں.. اس طرح لایعنی قوانین کی آڑ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔

انتہا پسندی کے اس برانڈ نے جو پاکستان بھر میں ہیجان اور بحران کی کیفیت پیدا کر رکھی ہے' دنیا بھر میں ہمارا ملک مذاق کا موضوع بنا ہوا ہے۔ دشمن بھارت کے اخبارات اور ٹی وی چینل ہمیں تختہ مشق بنا رہے ہیں۔ اس نادر طریقے سے جنرل مشرف نے پاکستان کا جو سوفٹ امیج پھیلایا ہے' اس پر ہمارے ملک کا کون سا ایسا مخالف ہوگا جو عش عش نہیں کر رہا۔ مذہبی انتہا پسندی کے خلاف نعرے بلند کرنے سے امریکہ خوش ہوتا ہے فوجی آمریت کو تقویت ملتی ہے۔ وہ واحد سپر طاقت کی سرپرستی سے مشرف ہوری ہے۔ چنانچہ یہ نعرے جنرل صاحب کو بہت مرغوب ہیں لیکن مملکت خداداد کے اندر آئین و قانون کی حکمرانی کے اساسی تصورات اور عملی مقتضیات کی جو مٹی پلید کر کے رکھ دی گئی ہے' اس کی فکر ہمارے فوجی حکمرانوں کو دامن گیر نہیں ہوتی کیونکہ اگر آئین اور آئینی اداروں کی بالادستی قائم رہے تو نہ ان کی حکومت قائم ہو سکتی ہے' نہ پارلیمنٹ کو ربڑ سٹمپ بنایا جا سکتا ہے۔ نہ لوٹوں اور وفاداریاں تبدیل کرنے والی خوشامدیوں کی فوج ظفر موج اکٹھا کر کے آلہ کار کابینہ بنائی جا سکتی ہے نہ ایک پاکستانی نژاد بنکر امریکہ سے امپورٹ کر کے وزیراعظم کی کرسی پر بٹھایا جا سکتا ہے' نہ اپنی سرحدوں پر امریکہ کی جنگ لڑی جا سکتی ہے نہ تنازع کشمیر پر ہر دم بھارت کی خوشنودی کا طالب بنا جا سکتا ہے۔ نہ پاکستانی عوام کو ابہام کی کیفیت میں رکھ کر امریکی حکومت کو یقین دہانی کرائی جا سکتی ہے کہ ۲۰۰۴ء کے اواخر میں وردی اتار دی جائے گی۔ یہ ساری ادائیں اگر انتہا پسندی کی ذیل میں نہیں آتیں تو آکسفورڈ یونیورسٹی پریس والوں

سے درخواست کر کے ایسی ڈکشنری چھپوانی چاہیے جس میں انتہا پسندی کی وہ تعریف درج ہو جو جنرل مشرف کی حکومتی ضروریات اور تقاضوں پر پوری اترتی ہو۔

امریکی اپنے پسندیدہ پاکستانی حکمران سے توقع کر رہے ہیں کہ وہ ان کے ساتھ کئے گئے وعدے کے مطابق ۲۰۰۷ء کے اواخر میں وردی اتار دیں گے۔ معلوم نہیں جنرل صاحب اس عہد کو پورا کریں گے یا اس کا بھی وہی حشر ہوگا جو ۲۰۰۳ء میں پاکستانی قوم کو کرائی جانے والی اسی نوعیت کی یقین دہانی کا ہوا تھا۔ فرض کیجئے جنرل صاحب وائٹ ہاؤس کو مایوس نہیں کرتے اور رواں سال کے اختتام تک وردی اتار دینے کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔تو اس صورت میں یہ سوال بہت اہمیت اختیار کر جائے گا کہ وہ یہ کام ۱۵/ستمبر یا ۱۵/اکتوبر کی مدت سے پہلے کرتے ہیں یا بعد میں؟ کیونکہ ان ایام میں وہ موجودہ اسمبلیوں سے ہی دوسری مرتبہ صدر بننے کا ارادہ باندھے ہوئے ہیں اگر وہ ۱۵/ستمبر ۲۰۰۷ء سے پہلے چیف آف دی آرمی سٹاف کے منصب کو خیر باد کہہ دیتے ہیں تو آئندہ انتخابات کے غیر جانبدارانہ اور آزاد فضا میں منعقد ہونے کے امکانات روشن ہو سکتے ہیں بصورت دیگر انہوں نے یہ طے کیا کہ وردی اس وقت تک نہیں اتاریں گے جب تک سارا انتخابی عمل مکمل نہیں ہو جاتا اور ان کا اگلے پانچ سال کی مدت کے لیے صدر بننا یقینی نہیں بن جاتا۔نئی پارلیمنٹ کے اندر بھی (ق) لیگ دوبارہ اقتدار پر نہیں چھا جاتی تو جنرل صاحب کو وردی اتارنا یا نہ اتارنا بے معنی ہو جائے گا۔ آزادی اور غیر جانبدارانہ انتخابات کے انعقاد کا خواب بھی پریشان ہو جائے گا۔ بحران ختم ہونے کی بجائے طوفان کی شکل اختیار کر سکتا ہے۔فوجی حکمرانی نے قوم و ملک کو جس انتہا پسندی کی لپیٹ میں لے رکھا ہے سائے تاریک تر اور گہرے ہوتے جا رہے ہیں۔

عدالت عظمیٰ کے خلاف

جنرل مشرف کا کمانڈو ایکشن

پروفیسر خورشید احمد لکھتے ہیں کہ:

۹ مارچ ۲۰۰۷ء پاکستان کی تاریخ میں ایک سیاہ دن کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس دن ایک جرنیل نے اقتدار کے نشے میں ملک کے چیف جسٹس کو کئی گھنٹے اپنے کیمپ آفس میں قید رکھنے کے بعد بڑی رعونت سے معطل کر دیا اور دستور کے واضح احکام کے برعکس ایک قائم مقام چیف جسٹس مقرر کر دیا۔ کراچی اور لاہور سے ججوں کو ہوا کے دوش پر اسلام آباد لا کر اپنی مرضی سے ایک سپریم جوڈیشل کونسل قائم کر دی جسے ناشائستہ عجلت کے ساتھ دستوری چیف جسٹس کے خلاف ایک ریفرنس سے بھی نواز دیا گیا اور اس کونسل نے چشم زدن میں چیف جسٹس کے غیر فعال کیے جانے پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ اس طرح عملاً فوجی قیادت کے ہاتھوں عدلیہ کے خلاف ایک کو ڈِتا واقع ہو گیا۔

پاکستان ہی نہیں، مہذب دنیا کی تاریخ میں نظام عدل کے خلاف ایسے کمانڈو ایکشن کی مثال نہیں ملتی۔ پھر چیف جسٹس کو اس طرح من مانے طور پر معطل ہی نہیں کیا گیا بلکہ اس کے ساتھ سخت ہتک آمیز رویہ اختیار کیا گیا۔ اسے زبردستی سپریم کورٹ جانے سے روک دیا گیا۔ اس کی کار اور گھر پر سے قومی اور چیف جسٹس کا جھنڈا اُتار دیا گیا۔ گھر پر پولیس اور رینجرز کی ایک بڑی نفری لگا دی گئی۔ سارے راستے بند کر دیے گئے، گھر سے لفٹر کے ذریعے گاڑیاں اٹھالی گئیں۔ ٹیلی فون، ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ سے رشتے منقطع کر دیئے گئے اور ایک دہشت کی فضا قائم کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس لام بندی کے نتیجے میں فطری طور پر کچھ لمحات کے لیے پورے ملک پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہو گئی لیکن پھر جلد ہی دکھ، حیرت اور

افسوس اور غم و غصے کے بادل چھٹنے لگے۔

جیسے ہی عوام و خواص کو معلوم ہوا کہ چیف جسٹس افتخار محمد چودھری نے عدلیہ پر حملہ آور ہونے والوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا ہے اور اپنی اور عدلیہ کی عزت کی حفاظت کے عزم اور جرأت کا اظہار کیا ہے تو پوری قوم ایک نئے جذبے سے چیف جسٹس کے ساتھ یک جہتی کے اظہار اور عدلیہ کی آزادی، عزت اور وقار کی تائید' دستور اور قانون کی بالا دستی اور فسطائی قوتوں کی دراندازیوں کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی اور یک زبان ہو کر انصاف اور جمہوریت کے تحفظ کے لیے سرگرم ہوگئی ـــــ اور ۹ مارچ کے بعد کا ہر دن گواہ ہے کہ ملک کے گوشے گوشے میں وکلا' سیاسی اور دینی جماعتیں، صحافی، تاجر، طلبہ، غرض سوسائٹی کے تمام ہی طبقے جرنیلی آمریت کے اس وار کا بھرپور توڑ کرنے کی ملک گیر جدوجہد میں بڑھ چڑھ کر اپنا کردار ادا کر رہے ہیں اور ریاستی دہشت گردی اور پولیس اور رینجرز کی گولیوں اور لاٹھیوں کا پُرامن اور پرعزم انداز میں مقابلہ کر رہے ہیں۔ حکمرانوں کو توقع تھی کہ وہ چیف جسٹس کو یوں دبوچ کر عدلیہ کو اپنی گرفت میں لے آئیں گے اور الیکشن کے اس فیصلہ کن سال میں اپنی من مانی کر سکیں گے لیکن وہ اپنی تدبیریں کر رہے تھے اور اللہ تعالیٰ کی تدبیر کچھ دوسری ہی تھی ـــــ جو کام انہوں نے اپنے اقتدار کو دوام بخشنے اور عدالت کے مقدس ادارے کو اپنی خواہشات کے تابع کرنے کے لیے اٹھایا تھا' وہی ان کے زوال اور ان شاء اللہ بالآخر مکمل ناکامی کا وسیلہ بن جائے گا۔

﴿وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ﴾ [الانفال: ۳۰]

''وہ اپنی تدبیر کر رہے تھے اور اللہ اپنی تدبیر کر رہا تھا' اور اللہ سب سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔''

ایک اہم تاریخی واقعہ

جس طرح عدلیہ پر جرنیلی آمریت کے اس حملے کے جواب میں وکلا برادری اور ملک کی تمام ہی دینی' سیاسی، سماجی اور تجارتی قوتیں اٹھ کھڑی ہوئی ہیں' اس سے ایک اہم تاریخی واقعے کی یاد تازہ ہوگئی جس میں آج پاکستان اوراس میں ہونے والی اس کش مکش کے لیے جو حکمرانوں اور عوام میں برپا ہے' بڑا سبق ہے۔

یہ واقعہ ساتویں صدی ہجری کے وسط (۶۳۹ھ) کا ہے جب مصر پر مملوک (خاندان غلاماں) حکمران تھے اور محض قوت کی بنیاد پر قانونی ضابطوں اور فقہی احکام کو پامال کر رہے تھے۔ اس زمانے میں ایک صاحب عزیمت قاضی شمس العلماء شیخ عزالدین عبدالسلام نے ایک سنہری مثال قائم کرکے اسلام کے اصولِ حکمرانی اور نظامِ عدل کو نئی زندگی عطا کی۔ شیخ کا تعلق اصلا بلادِ شام سے تھا اور اپنے علم اور تقویٰ کی وجہ سے اسلامی دنیا میں شہرت رکھتے تھے۔ جب وہ مصر آئے تو الملک الصالح نجم الدین نے ان کو قضا (عدالت) کے اعلیٰ ترین منصب پر فائز کیا۔ شیخ عزالدین نے قانونی معاملات میں مملوک اربابِ اقتدار کے خلاف بڑی جرأت سے حق وانصاف کے مطابق فتوے دیئے اور احکام صادر کیے جس سے اقتدار کے ایوانوں میں ہلچل مچ گئی۔ بادشاہ نے خود شیخ کے پاس آکر فتویٰ اور عدالتی فیصلہ تبدیل کرنے کی خواہش کا اظہار کیا مگر شیخ نے صاف انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ وہ عدالتی معاملات میں دخل اندازی نہ کریں ورنہ شیخ قضا کے منصب سے دست بردار ہو جائیں گے۔ نائب سلطنت نہ مانا اور ننگی تلوار لے کر اپنے سپاہیوں کے ساتھ شیخ کو قتل کرنے کے لیے ان کے گھر پہنچا اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ شیخ کے نوعمر بچے نے دروازہ کھولا تو شمشیر بدست سپاہیوں کو دیکھ کر سخت پریشان ہوا لیکن شیخ ایمان، عزم اور ہمت کا پیکر تھے۔ بلاخوف نائب سلطنت

کے سامنے آئے اور وہ ایسا ہیبت زدہ ہوا کہ تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ شیخ نے فتویٰ تبدیل کرنے سے انکار کیا اور پوری متانت سے اپنا تمام سامان گھر سے نکال کر گدھے پر لادا اور قاہرہ چھوڑنے کا عزم کرلیا۔ سوال کیا گیا کہ کہاں جا رہے ہیں؟ تو جواب دیا گیا کہ ''کیا اللہ کی زمین فراخ نہیں ہے کہ کسی ایسی زمین پر رہا جائے جہاں قانون کی پاس داری نہ ہو' جہاں اہل شریعت بے قیمت ہو جائیں اور عدالتی نظام میں ارباب اقتدار مداخلت کریں۔''

قاضی القضاۃ کے اس اقدام کی خبر قاہرہ کے طول وعرض میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور پھر کیا تھا ـــــ مؤرخ لکھتے ہیں کہ کیا عالم اور کیا عامی' پورا قاہرہ گویا قاضی کی ہم نوائی کے لیے امنڈ آیا اور شیخ کے ساتھ ہو گیا۔ عوام الناس مصر کے قاضی کی حمایت میں گھروں سے اس طرح نکل آئے کہ بچے' بوڑھے' جوان' مرد' خواتین سب ان کے ساتھ تھیں۔ اس عوامی یک جہتی نے حکمرانوں کو ششدر کر دیا اور سلطان نے قاضی کے آگے سپر ڈال دی۔ مملوک ارباب اقتدار شیخ کے فیصلے کو ماننے پر مجبور ہوئے اور اس طرح قانون نے اپنی بالادستی منوالی اور عدالت کی عصمت اور وقار کا بول بولا ہوا۔

[ملاحظہ ہو عبدالرحمٰن الشرقاوی کی کتاب ائمہ الفقہ التسعہ ص ۳۶۰۔۳۶۱]

اس واقعہ سے اسلامی قانون، نظامِ عدل اور اصول حکمرانی کے باب میں چند بنیادی اصول بالکل کھل کر سامنے آتے ہیں:

پہلا اصول قانون کی حکمرانی اور شریعت کی بالادستی کا ہے۔ اللہ کے دین اور انبیائے کرام علیہم السلام کی دعوت کا مرکزی نکتہ اللہ کی عبادت اور بندگی کے ساتھ انسانوں کے درمیان عدل وانصاف کا قیام ہے [الحدید:۲۵]۔ مقاصد شریعت میں سرفہرست عدل وقسط کی فراہمی ہے اور اس بارے میں کوئی سمجھوتہ یا مداہنت ممکن نہیں۔

دوسرا اصول قانون کی نگاہ میں سب کی برابری ہے۔ اس سلسلے میں امیر اور غریب اور طاقتور اور کمزور میں کوئی تمیز نہیں۔ سب کے لیے ایک ہی قانون ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ماضی میں قومیں اس لیے تباہ ہوگئیں کہ وہ کمزوروں پر تو قانون لاگو کرتے تھے مگر ذی اثر قانون سے بالا رہتے تھے۔ جب کہ آپ ﷺ کے مشن کا ہدف یہی ہے کہ تمام انسانوں کو ایک ہی قانون کا پابند کیا جائے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کہ اگر (العیاذ باللہ) فاطمہ رضی اللہ عنہا بنت محمد ﷺ بھی چوری کی مرتکب ہوگی تو اس کا بھی ہاتھ کاٹا جائے گا۔

تیسرا اصول عدلیہ کی آزادی اور قضا کے نظام کا انتظامیہ کی دراندازی سے مکمل طور پر پاک ہونا ہے۔ حاکمِ وقت پر بھی قاضی کا حکم اسی طرح نافذ ہے جس طرح کسی عام شہری پر۔ اور حکمرانوں کو قضا کے معاملات میں مداخلت یا اس پر اثر انداز ہونے کا کوئی حق نہیں۔

چوتھی چیز قوم کا عدلیہ پر اعتماد ہے‘ جو قاضی کے علم اور تقویٰ اور انصاف کے باب میں اس کے بے لاگ ہی نہیں‘ ہر اثر سے بالا ہونے پر مبنی ہے۔ عدل کی میزان کے آگے قوت کی تلوار بے اثر ہے اور تلوار کو عدل کی میزان کے خادم کا کردار ادا کرنا ہوتا ہے۔ مگر یہ اسی وقت ممکن ہے جب عدالت اور عدل قائم کرنے کے ذمہ دار دیانت اور اپنے منصب کے تقاضوں کو پورا کر کے عوام کا اعتماد حاصل کریں۔

پانچواں اصول اور سبق اس واقعے سے یہ بھی نکلتا ہے کہ اگر تلوار میزانِ عدل کی چاکری کرنے سے باغی ہو‘ تو پھر عوام کی قوت وہ قوت ہے جو تلوار کو قابو کر سکتی ہے اور تلوار کو حدود کا پابند اور عدل کا آلہ کار بنا سکتی ہے۔ اس کے لیے عوام کا چوکس ہونا اور نظامِ عدل کی حفاظت کے لیے کمر بستہ ہونے کا عزم اور آمادگی ہی نہیں‘ اس کا عملی اظہار بھی ضروری ہے۔ یہی جذبہ اور جرأت اس بات کا ضامن بن جاتا ہے کہ تلوار

کمزور کے لیے خطرہ نہ بنے اور معاشرے میں انصاف اور خیر کی حفاظت اور افزائش کا ذریعہ بنے۔ نیز خود نظامِ عدل تلوار کی زد سے محفوظ رہے۔

یہ وہ اصول ہیں جن کی روشنی میں آج بھی ہمیں اپنے مقصد کا تعین اور اس کے حصول کی صحیح اور مؤثر حکمت عملی اور مناسب نقشہ کار تیار کرنا چاہیے۔

عدلیہ اور دستوری حکمرانی کو چیلنج

جنرل پرویز مشرف نے ملک کے چیف جسٹس جناب افتخار محمد چودھری کو بظاہر جبری رخصت پر بھیج کر (مگر بیک بینی و دوگوش عملاً برطرف کر کے) دراصل پورے نظامِ عدل اور دستوری حکمرانی کے عمل کو چیلنج کیا ہے۔ اگر اسے برداشت کر لیا جاتا ہے تو پھر ملک پر شخصی اور فوجی آمریت کو اپنی قبیح ترین صورت میں مسلط ہونے سے روکا نہیں جا سکتا۔ اور یہ سارا کھیل کھیلا بھی اسی لیے گیا کہ عدالت کو اپنی گرفت میں لے کر سیاسی دروبست اور حکمرانی کے پورے عمل کو اپنے تابع کر لیا جائے۔ جس طرح یہ کام کیا گیا، اس میں دستور اور قانون کی تو دھجیاں بکھیری ہی گئیں، لیکن افسوس ہے شرافت اور انسانیت کی ہر قدر کو بھی پامال کیا گیا اور مقصد یہ دکھانا تھا کہ فوجی حکمران جس طرح چاہیں اور جدھر چاہیں نظامِ حکومت کو ہنکا سکتے ہیں۔ صاف نظر آ رہا ہے کہ یہ کام پوری منصوبہ بندی کے ساتھ کیا گیا اور مستقبل کے سیاسی نقشے کی ایک خاص سمت میں صورت گری کے مقصد سے کیا گیا۔ چیف جسٹس کی ذات کو اس لیے نشانہ بنایا گیا کہ ان کو قابو کر کے عدلیہ کے پورے ادارے کو اپنا تابع مہمل بنایا جا سکے یہ اس لیے ضروری تھا کہ دستور کی جو خلاف ورزیاں ہو رہی ہیں اور جو مزید پیش نظر ہیں ان کو صرف اس صورت میں روا رکھا جا سکتا ہے کہ عدلیہ اس پر صاد کرے۔ فوجی حکمرانوں اور آمرانہ عزائم رکھنے والوں نے ۱۹۵۴ء سے یہی راستہ اختیار کیا ہے اور بدقسمتی سے

عدالتوں نے بھی نظریہ ضرورت کا سہارا لے کر فسطائی قوتوں کی کارفرمائیوں کے لیے سند جواز فراہم کرنے کی خدمت بالعموم انجام دی ہے۔ مجبوریاں اور توجیہات جو بھی ہوں، نیز جب بھی کسی صاحب عزم جج نے دستور سے انحراف کے اس راستے کو روکنے' اور قانون کی بالادستی اور عدلیہ کی آزادی کی حفاظت کی کوشش کی ہے، اسے راستے سے ہٹانے کا کھیل کھیلا گیا ہے۔ کبھی یہ کام اچھے ججوں کی ترقی کا راستہ روک کر کیا گیا ہے تو کبھی ان کو راستے سے ہٹا کر' جس کے لیے نت نئے انداز میں عبوری دستوروں کا ڈھونگ رچا کر تازہ حلف کا مطالبہ کر کے یہ مقصد حاصل کیا گیا ہے۔

بات کسی کی ذات کی نہیں' اصول کی ہے اس لیے یہ حقیقت نظرانداز نہیں کی جا سکتی کہ جون ۲۰۰۵ء میں جسٹس افتخار محمد چودھری کے چیف جسٹس بننے کے بعد حکمرانوں کو توقع تھی کہ چونکہ وہ ۲۰۱۳ء تک چیف جسٹس رہیں گے، اس لیے ان سے ایک طویل رفاقت کا سلسلہ استوار کیا جائے۔ لیکن ان کو اس ڈیڑھ پونے دو سال بعد یہ احساس ہو گیا کہ راوی کے لیے سب چین لکھنا ممکن نہیں۔ جسے عدالتی فعالیت کہا جا رہا ہے' وہ حکمرانوں کے عزائم کی تکمیل میں رکاوٹ بنتی جا رہی ہے۔ خاص طور پر انسانی حقوق کی حفاظت' دستور کے مکمل احترام' پارلیمانی جمہوریت اور فیوڈلزم کے اصولوں کی پاس داری اور سب سے بڑھ کر سیاست میں فوج کے مستقل رول کے سلسلے میں عدالت سے جس قسم کا تعاون فوجی حکمرانوں کو مطلوب تھا' وہ ملنا مشکل ہو رہا تھا' اس لیے چیف جسٹس کے خلاف دائرہ تنگ کرنے کا اور فائلیں بنانے کا کھیل شروع کر دیا گیا اور نئے انتخابی عمل کے شروع ہونے سے پہلے ہی ان سے نجات حاصل کر لینے کی منصوبہ سازی کی گئی۔

اس امر سے انکار ممکن نہیں کہ اکتوبر ۱۹۹۹ء کے فوجی اقدام اور ۲۰۰۲ء کے نام نہاد ریفرنڈم کے جواز میں جسٹس افتخار محمد چودھری کی تائیدی آواز نے ان

عناصر کو غالباً ہمت دلائی ہوگی لیکن ان کی توقعات پوری ہوتی نظر نہیں آ رہی تھیں۔ چیف جسٹس بننے کے بعد بھی جس حد تک حکومت کا لحاظ رکھا جا سکتا تھا' رکھا گیا[1] گو اس بارے میں دوسری رائے بھی موجود ہے لیکن جس طرح سپریم کورٹ بنیادی حقوق، دستور کی بالادستی اور مظلوم افراد اور طبقات کی حق رسائی کے سلسلے میں محتاط لیکن آزاد روش اختیار کر رہی تھی اس سے اقتدار کے ایوانوں میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں اور ایجنسیوں کی سکہ بند کارروائیوں کے سہارے جنرل صاحب نے بالآخر ۹ مارچ کو عدالت عظمیٰ پر بڑی عجلت اور بھونڈے انداز میں بھر پور وار کر دیا۔ پھر اس کے دفاع میں انہوں نے اور ان کے چند وزرا نے جو انداز اختیار کیا اس نے حق' انصاف' سچائی سب کو پرزے پرزے کر دیا اور ملک اور ملک کے باہر پاکستان کے امیج کو جتنا نقصان اس جارحانہ حملے اور اس کے بعد کیے جانے والے غیر دستوری' غیر اخلاقی اور غیر مہذب اقدامات نے پہنچایا ہے اتنا کبھی کسی اور نے نہیں پہنچایا۔

چیف جسٹس افتخار محمد چودھری صاحب کے خلاف جو اقدام کیا گیا ہے وہ دستور، قانون، اخلاق و آداب اور عقل عام ہر ایک کے خلاف ہے اور بدیہی طور پر بدنیتی پر مبنی نظر آتا ہے۔ ہمیں توقع ہے سپریم جوڈیشنل کونسل اس ریفرنس کا فیصلہ حق و انصاف اور دستور کے مطابق کرے گی۔ آج جسٹس افتخار محمد چودھری ہی زیر سماعت نہیں خود اس ملک کا عدالتی نظام بھی زیر سماعت ہے اور اللہ کی عدالت کے ساتھ اب عوام کی عدالت بھی ساتھ ہی ساتھ برسر عمل ہے۔

دنیاوی حد تک آخری فیصلہ عوام ہی کا قبول کیا جائے گا' اس لیے بھی کہ۔

---

❶۔ مثلاً جنرل جمشید گلزار کیانی کے بحیثیت چیئر مین پبلک سروس کمیشن عہدے کے میعاد میں تخفیف جنرل حمید گل کی رٹ بسلسلہ پاک حدود میں امریکی فوج کی دراندازیاں، یا صوبہ سرحد کی ایم ایم اے حکومت کا حسبہ بل۔

زبان خلق کو نقارہ خدا سمجھو
برا کہے جسے دنیا، اسے برا سمجھو

جنرل پرویز مشرف اوران کے حواری بار بار یہ کہہ رہے ہیں کہ معاملہ عدالت کے زیر سماعت ہے اوراس پر صحافتی اورعوامی سطح پرکوئی بحث نہیں ہونی چاہیے اور یہ بھی کہ ایک دستوری مسئلے پر حزب اختلاف اوروکلاء حضرات سیاست کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جو قابل مذمت اور ناقابل قبول ہے۔ یہ اعلانات سنتے سنتے کان پک گئے ہیں' اس لیے سب سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان دعووں کے بارے میں کچھ عرض کردیا جائے۔

بلاشبہ عدالت میں زیر سماعت معاملات کا فیصلہ عدالت پر چھوڑنا چاہیے اورکسی طرح بھی عدالت کو متاثر کرنا غلط ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ جو دستوری' قانونی' سیاسی اور اخلاقی معاملات کسی بھی تنازع سے متعلق ہوں ان پر کلام نہ کیا جائے۔ عدالت کی کاروائی یااس کومتاثر کرنے والی چیزوں پر تبصرہ معیوب نہیں' اصل مسائل پر بات چیت نہ صرف عدالت کے وقار کے منافی نہیں بلکہ عدالت کو حالات سمجھنے اور صحیح رائے پر پہنچنے میں مدد گار ہوتی ہے

ابھی اس متنازع امر کو طے کرنا باقی ہے جو کام عدالت کررہی ہے۔کوئی اقدام جو عدالت کے اس کام میں مخل ہو یا اسے انصاف کرنے سے منع کرنے والا ہو' وہ غلط ہے۔لیکن ہروہ کام' بحث' مدد جو انصاف کے قیام کو آسان بنانے اور مسئلے کی تنقیح میں مدد گار ہو' وہ ممنوع نہیں۔یہی وجہ ہے کہ توہین عدالت کی تعریف یہ کی گئی ہے:

ایسا عمل جو عدالت کو انصاف فراہم کرنے سے روکے، رکاوٹ بنے یا پریشانی کا باعث ہو، یا جو اس کے وقار کو نقصان پہنچائے۔

[بلیک لاء ڈکشنری ص ۲۸۸]

عدالت کے زیر سماعت کے نام پر دستوری اور سیاسی موضوعات پر بحث وگفتگو کا دروازہ بند کرنا یا ان تمام امور کا زیر بحث لانا جن سے خود عدالت کو مسئلے سمجھنے اور تنازع کے منصفانہ حل میں مدد ملے' نہ توہین عدالت کی تعریف میں آتا ہے اور نہ زیر سماعت کی قدغن ان پر لاگو ہوتی ہے۔ اگر ایسا ہو تو زندگی کے ہزاروں لاکھوں امور پر اظہار رائے اور بحث ومباحثے کا دروازہ بند ہو جائے۔

یہ تو تھی اصولی بات' لیکن جب یہ بات ان کی طرف سے کی جاتی ہے جنہوں نے چیف جسٹس کا میڈیا ٹرائل آج نہیں' اسٹیل مل کے فیصلے کے فوراً بعد ۲۰۰۶ء کے وسط سے شروع کر دیا تھا اور جو تسلسل کے ساتھ پریس کو ایک خاص نوعیت کی معلومات خفیہ طور پر فراہم کر کے پریشر بڑھانے کی کوشش کر رہے ہیں تو۔

ناطقہ سر بہ گریباں ہے اسے کیا کہیے

جرنیل صاحب خود ٹی وی پر دو گھنٹے لَنْ تَرَانِی فرماتے ہیں اور ہر جلسے میں گوہر افشانیاں کر رہے ہیں۔ ان کے وزیر اور دو صوبائی وزرائے اعلیٰ دن رات اسی مشق میں مبتلا ہیں اور جو وزیر خاموش ہیں جرنیل صاحب ان کو للکار رہے ہیں کہ میدان میں اترو، میرا دفاع کرو اور چیف جسٹس کے خلاف مہم چلاؤ۔ یہ سب سیاست نہیں تو کیا ہے؟ اس کے مقابلے میں ہماری سیاست' شرافت' متانت اور دلیل کی سیاست ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ فوج کا سربراہ فوجی وردی میں سیاسی تقاریر کر رہا ہے' ووٹ مانگ رہا ہے۔ مخالفین کو تہس نہس کرنے کی دھمکیاں دے رہا ہے' قومی خزانے کو ہر جلسے میں بے دریغ لٹا رہا ہے۔ اگر یہ سیاست گندی سیاست نہیں تو کیا اسے فوجی پریڈ اور جنگی مشق کہا جائے گا؟ حکومت کا پورا اقدام اور اس پس منظر اور پیش منظر کی ہر ہر حرکت سیاسی ہی نہیں' اوچھی سیاست بازی کی غماز ہے۔ اگر اہل سیاست اور قانون دان اس پر بھی ردعمل ظاہر نہ کریں تو وہ اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی میں مجرمانہ کوتاہی کے مرتکب

ہوں گے۔ سیاست خود کوئی برائی نہیں، جمہوری عمل تو عبارت ہی سیاست سے ہے۔ البتہ اوچھی سیاست نہیں ہونی چاہیے لیکن اس کا ارتکاب وکلا اور سیاست دانوں نے نہیں، جنرل صاحب اور ان کی حکومت نے کیا ہے۔ اس کے لیے ہماری بات نہیں، ان کے ان مداحوں کی سند بھی حاضر ہے جن کے بل بوتے پر فوج کے سربراہ سیاست فرما رہے ہیں۔

مغرب کی تنقید

لندن کا روزنامہ دی ٹائمز اپنی ۱۴ مارچ ۲۰۰۷ء کی اشاعت میں (جوڈیشل ایرر) کے عنوان سے ادارتی کالم میں پاکستان کے حالات پر یوں تبصرہ کرتا ہے:

> ۱۹۹۹ء میں اقتدار سنبھالنے کے بعد سے صدر مشرف کا اصرار رہا ہے کہ ان کا مقصد پاکستان کے لیے حقیقی جمہوریت ہے .... لیکن انہوں نے حسب وعدہ ملک میں ایک منتخب جمہوری حکومت کی واپسی کے لیے کوئی خاص سرگرمی نہیں دکھائی ہے۔

اور چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کی برطرفی اور اس کے خلاف عوامی ردعمل کا ذکر کرنے کے بعد دی ٹائمز فیصلہ دیتا ہے کہ

> ''پاکستان لاشعوری طور پر قانون کی بالادستی سے محروم ہے۔''

اور پھر چیف جسٹس چودھری کے عدالتی تحریک پہلے سے جمع شدہ مقدمات کو نمٹائے اور خصوصیت سے لاپتہ ہو جانے والے افراد کے حقوق کی حفاظت کے باب میں مساعی کا ذکر کرنے کے بعد جنرل صاحب کے دوسروں پر سیاست چمکانے کے دعوے کے جواب میں بڑی مسکت انداز میں اداریئے میں کہا گیا ہے کہ:

> حکومت کے لیے کسی سیاسی محرک کا انکار لاحاصل ہے۔ اس کے اقدام کو

تقریباً پوری دنیا میں اس سال کے انتخابات کے' ان ضوابط کے تحت انعقاد سے پہلے جن کو قانونی طور پر چیلنج کرنے کی توقع ہے' عدلیہ کو سدھانے کی کوشش سمجھا جا رہا ہے۔

اگر سیاست کا جواب سیاست سے نہ دیا جائے تو کیا کیا جائے؟ جنرل صاحب کے مقدمے کے بودے پن کا پول بھی ٹائمز نے یہ کہہ کر کھول دیا ہے کہ:

اب تک حکومت نے مسٹر چودھری کے خلاف جو کچھ کہا ہے اگر ان کا مقدمہ اس سے بہت زیادہ خراب نہیں ہے تو ان کو بحال کر دیا جانا چاہیے۔ اچھے جنرل جانتے ہیں کہ کب قدم پیچھے ہٹانے چاہیں۔

[ٹائمز ، اداریہ،۱۴ مارچ ۲۰۰۷ء]

نیو یارک ٹائمز، واشنگٹن پوسٹ، لاس اینجلز ٹائمز اور دوسرے مغربی اخبارات اور رسائل نے اپنے اپنے انداز میں یہی بات لکھی ہے کہ اصل کھیل سیاسی ہے اور جرنیل صاحب عدلیہ عالیہ کے دستوری اور قانونی امور اور حقوق انسانی کے معاملات میں حکومت پر گرفت سے پریشان ہیں، اور اس انتخاب کے سال میں اپنی وردی بچانے اور انتخاب کو من پسند انداز میں منعقد کرانے میں عدالت کی ممکنہ رکاوٹ کو دور کرنا چاہتے ہیں۔ یہ سیاست نہیں بلکہ گندی اور پست سطح کی سیاست نہیں تو اور کیا ہے اور اس کا مقابلہ سیاسی تحریک سے نہیں تو پھر کس طریقے سے ہو سکتا ہے؟ ہم صرف اہم ذرائع یعنی لندن کے اخبار دی گارڈین اور ہفت روزہ اکانومسٹ سے ضروری اقتباس دینے پر کفایت کرتے ہیں تاکہ جنرل صاحب اور ان کے میڈیا منتظمین کو اندازہ ہو جائے کہ۔

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

دی گارڈین لندن اپنے ۱۷ر مارچ ۲۰۰۷ء کے اداریئے Justice Denied میں جنرل مشرف اور چیف جسٹس کی ملاقات کا حال بیان کرنے کے بعد لکھتا ہے:

> پاکستان ایک جوش کی کیفیت میں ہے۔ جب جنرل مشرف نے آٹھ سال قبل فوجی انقلاب کے ذریعے قبضہ کیا تھا، اس کے بعد مسٹر چودھری پہلے شہری ہیں جو اس کے سامنے کھڑے ہوئے ہیں۔ کم قیمت پر اسٹیل مل کی نج کاری کے فیصلے کو الٹ دینے اور ان سینکڑوں لوگوں کے مسئلے کو جنہیں انٹیلی جنس ایجنسیوں نے غائب کر رکھا ہے لے کر اٹھنے کی وجہ سے وہ حکومت کی نظروں میں کانٹے کی طرح کھٹک رہے تھے۔ لیکن مشرف کا وار حفظ ماتقدم کے طور پر بھی تھا۔
>
> صدر کا انتخاب ایک پارلیمنٹ نے کیا ہے جس کی مدت اگلے سال ختم ہو رہی ہے۔ مشرف کی اتنی مخالفت ہے کہ آنے والی پارلیمنٹ کا صاد کرنے کا امکان نہیں، خاص طور پر اس لیے کہ اس نے فوج کے سربراہ کا عہدہ چھوڑنے سے انکار کیا ہے۔ موجودہ پارلیمنٹ ہی سے اپنا انتخاب کروانے کی کوشش پر بہت سے قانونی اقدام ہوں گے۔ اس لیے ضرورت ہے ایک تابع دار چیف جسٹس کو مسند پر بٹھانے کی۔

لندن اکانومسٹ پاکستان کی صورت حال کا اپنے کالم میں جائزہ لیتے ہوئے لکھتا ہے:

> پاکستان کے شمالی قبائلی علاقوں کو زیر کرنے کی فوج کی کوششیں جنرل کی گرتی ہوئی مقبولیت کی ایک وجہ ہیں۔ اس وجہ سے وہ لوگوں کو ایک امریکی کٹھ پتلی لگتا ہے۔ اس بات نے حال ہی میں پاکستان کے بڑے

شہروں میں چھے خودکش حملوں سمیت دہشت گردی کی ایک لہر کو اٹھا دیا۔
صدر کی کوشش یہ ہے کہ اقتدار پر قبضہ برقرار رکھنے کے لیے عدلیہ کا بازو مروڑ دیا جائے۔

اپنے اب تک کے دو سالہ دور میں مسٹر چودھری نے کم وبیش ہر وہ چیز کی ہے جس کی توقع ایک پاکستانی جج سے نہیں کی جاتی۔ انہوں نے بلوچستان میں مشتبہ باغیوں کے غائب کیے جانے پر انکوائری شروع کروا دی۔ انہوں نے حکمران سیاست دانوں اور پولیس کے سربراہوں کو' غریبوں کو ان کے حال پر چھوڑ دینے پر سخت سرزنش کی۔ انہوں نے شادیوں کی شان وشوکت سے بھر پور تقریبات پر پابندی لگائی کہ اس سے طبقاتی امتیاز پیدا ہوتا ہے۔ انہوں نے افراط زر کے خلاف مقدمات سنے' پبلک پارکوں کو امیروں کے لیے گاف کلب بنانے کی ممانعت کی اور بچوں کی شادیوں کو غیر قانونی قرار دیا۔ گذشتہ برس انہوں نے ایک بڑی اسٹیل مل کی نج کاری کو بولیوں کے عمل میں بے قاعدگی کی وجہ سے روک کر صدر کو خاص طور پر ناراض کیا۔
اگر جنرل مشرف واقعتاً مزید پانچ سال کے لیے صدر اور فوجی سربراہ رہنا چاہتے ہیں تو قانونی چیلنجوں کے ایک سیلاب کی توقع کر سکتے ہیں۔
اس کو مدنظر رکھتے ہوئے واضح بات ہے کہ ایک آزاد ذہن کا اعلیٰ جج ان کی پسند کا نہیں ہو سکتا تھا لیکن مسٹر چودھری کے معطل کرنے سے صورت حال زیادہ خراب ہوگئی ہے۔
اگر مسٹر چودھری کو برطرف کیا جاتا ہے تو جنرل مشرف کے لیے یہ دعویٰ

کرنا مشکل ہوگا کہ ان کی حکومت دستوری ہے اور اگر انہیں بحال کیا جاتا ہے تو وہ ان کے لیے بہت سے پریشانیوں اور دردسر کا باعث بن سکتے ہیں۔ ایسے میں لوگ سوچتے ہیں: الیکشن ہوں گے بھی؟

سیاست چمکانے اور عدالت کے زیر سماعت ہونے کے بارے میں اتنی وضاحت کافی ہے نیز مندرجہ بالا معروضات سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اصل مسئلہ اس ریفرنس کا نہیں جو ساری بے قاعدگیوں کے بعد بظاہر اب داخل کر دیا گیا ہے بلکہ اپنے سیاسی کھیل کے رنگ میں بھنگ پڑنے' کے خطرے سے بچنے کے لیے کھیلا جا رہا ہے اور اس کھیل نے ملک کے اندر بھی جرنیل صاحب کی ساکھ کو (جو پہلے ہی کون سی اچھی تھی) بالکل خاک میں ملا دیا ہے اور پوری دنیا میں پاکستان اور خصوصیت سے جرنیل صاحب نے جو سیاسی کھڑاک کیا تھا اس کا پول بھی کھول دیا ہے۔

حکومت کے غیر آئینی اقدامات

اس حقیقی پس منظر کی تفہیم کے ساتھ ساتھ اس بات کی ضرورت بھی ہے کہ دستوری اور قانونی اعتبار سے بھی ان اقدامات کا جائزہ لیا جائے جو ۹ مارچ اور اس کے بعد کیے گئے ہیں۔

سب سے پہلی بات سمجھنے کی یہ ہے کہ ملک کا دستور' تمام کچھ تبدیلیوں اور ترامیم کے باوجود اختیارات کی تقسیم کا ایک واضح نقشہ پیش کرتا ہے اور اقتدار کو تین متعین اداروں میں تقسیم کرتا ہے یعنی انتظامیہ، مقنّنہ، اور عدلیہ۔ انتظامیہ کا سربراہ وزیراعظم ہے' جب کہ صدر مملکت وفاق کی علامت۔ صدر ان امور کو چھوڑ کر جن میں اسے صوابدیدی اختیارات حاصل ہیں' وزیراعظم اور کابینہ کی ہدایات کا پابند ہے۔ مقنّنہ کا کام قانون سازی' پالیسی ہدایات دینا اور انتظامیہ پر نظر رکھنا اور اس کا احتساب ہے' جب

کہ عدلیہ دستور اور قانون کی محافظ اور دونوں سے آزاد اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے کا اختیار رکھتی ہے۔ ہم اس وقت اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ موجودہ صدر نے اپنی فوجی وردی کی بنیاد پر پوری انتظامیہ کو اپنی گرفت میں لیا ہوا ہے اور کابینہ بشمول وزیر اعظم ان کے تابع مہمل بنے ہوئے ہیں جو دستور کی کھلی کھلی خلاف ورزی اور جمہوری عمل کو مسخ کرنے کا سبب بنا ہوا ہے لیکن اس سے بڑھ کر اب وہ عدالت پر بھی مکمل کنٹرول چاہتے ہیں اور اس کے لیے ۹ مارچ کا اقدام کیا گیا ہے۔ اس سے اختیارات کی تقسیم کا پورا نقشہ درہم برہم ہو گیا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو آمریت اور فسطائیت کی طرف لے جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ووڈرو ولسن نے جو امریکی صدر ہونے کے ساتھ ایک قانونی ماہر بھی تھا یہ اصول بیان کیا ہے کہ:

> اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کہ طاقت کا غلط استعمال نہیں ہوگا، واحد راستہ یہ ہے کہ اس کو محدود کیا جائے یعنی طاقت کو طاقت سے روکا جائے۔ آزادی کی تاریخ حکومت کی طاقت پر تحدیدات کی تاریخ ہے۔

اور امریکی جج جسٹس برانڈل نے ایک مشہور مقدمہ کے فیصلے میں اپنے اختلافی نوٹ میں لکھا تھا' جسے دستور کا ایک مسلمہ اصول شمار کیا جاتا ہے کہ:

> ۱۷۸۷ء کے کنونشن میں' اختیارات کی علیحدگی کا ڈاکٹرائن منظور کیا گیا' اس لیے نہیں کہ کارکردگی کو بڑھایا جائے بلکہ من مانی طاقت کے استعمال کو محدود کرنے کے لیے۔ مقصد ٹکراؤ سے بچنا نہیں تھا بلکہ تین شعبوں (مقننہ، انتظامیہ اور عدلیہ) میں حکومت کے اختیارات کی تقسیم کی بنا پر ناگزیر عوام کو آمریت سے بچانے کا سبب بن جاتا ہے۔

[ملاحظہ کیجیے Fundamental law of pakistan اے کے بروہی ص ۷۰، ۱۷]

ہمارے دستور کی بھی یہی بنیاد ہے لیکن یونٹی آف کمانڈ کے نام پر جرنیل صاحب

نے اس کا حلیہ بگاڑ دیا ہے اور ملک پر من مانے اور آمرانہ حکمرانی کی سیاہ رات طاری کر دی ہے۔

دستور کی رو سے عدلیہ' انتظامیہ سے مکمل طور پر آزاد ہے۔ صدر کو دستور کے مطابق اور دستوری روایات کا احترام کرتے ہوئے، جنہیں جج کیس میں قانون کا درجہ دے دیا گیا ہے' اعلیٰ عدالتوں کے ججوں کے تقرر کا اختیار دیا گیا ہے لیکن ایک بار کسی جج کے تقرر کے بعد دستور نے صدر اور انتظامیہ سے یہ اختیار سلب کر لیا ہے کہ وہ جس طرح چاہے اور جب چاہے ایک جج کو فارغ کر دے' رخصت پر بھیج دے' غیر فعال بنا دے' معطل کر دے یا کسی اور شکل میں اس کے اختیارات میں تخفیف کر سکے۔ دستور کی دفعہ ۲۰۹ میں واضح طور پر لکھ دیا گیا ہے کہ صرف اس دفعہ کے تحت اعلیٰ عدالت کے کسی جج کے سلسلے میں کوئی کاروائی ہو سکتی ہے۔ وزیر قانون کی یہ ہرزہ سرائی کہ جسے ججوں کے تقرر کا اختیار ہے' اسے ان کو رخصت کرنے یا معطل کرنے کا اختیار بھی حاصل ہے اس لائق ہی نہیں کہ اس پر سنجیدہ گفتگو کی جائے۔ یہ ایک مسلمہ اصول ہے۔

بلاشبہ قانون کی نگاہ میں سب برابر ہیں اور کوئی قانون سے بالا نہیں اور اگر کسی جج نے اپنے منصب کے منافی کوئی کام کیا ہے تو اس کا بھی اسی طرح محاسبہ ہونا چاہیے جس طرح کسی اور کا۔ لیکن بنیادی اصول یہ ہیں کہ

اول' ہر اقدام اور احتساب قانون کے تحت اور اس کے دائرے کے اندر ہو۔

دوم' نیز صرف اسے اقدام کرنے کا حق ہے جسے قانون یہ حق دیتا ہے۔

سوم' اس حق کا استعمال بھی قرار واقعی قانونی عمل ہی کے تحت ہو سکتا ہے۔

چہارم' قانون کا استعمال من پسند نہیں بلکہ سب کے لیے یکساں ہونا چاہیے۔ یہ نہیں کہ جس سے آپ خوش ہیں اس کے لیے قانون کا کوئی وجود نہ ہو اور جس سے

آپ ناراض ہو جائیں اس کے لیے' قانون سب کے لیے' کا فرمان جاری ہو جائے۔

اور پنجم' قانون کا استعمال بدنیتی پر مبنی نہ ہو یعنی اسے نیک نیتی (bonafide) سے استعمال کیا جائے بدنیتی (Malafide) سے نہیں۔

چیف جسٹس افتخار چوہدری کے معاملے میں صاف نظر آ رہا ہے کہ قانون کے ان پانچوں مسلمہ اصولوں کی خلاف ورزی کی گئی ہے اور یہی وجہ ہے کہ پوری وکلا برادری اور ملک کے تمام ہی دینی' سیاسی اور پروفیشنل اداروں اور دانش وروں نے اسے قانون اور انصاف کا قتل قرار دیا ہے۔

سپریم جوڈیشنل کونسل ایک دستوری ادارہ ہے جس کی تشکیل بھی دستور میں کر دی گئی ہے جسے کوئی بدل نہیں سکتا۔ صدر کو دستور یہ اختیار دیتا ہے کہ کسی بھی جج کے خلاف ریفرنس اسے بھیج دے۔ الزامات کی تحقیق اور جرم کے تعین کا اختیار صدر' وزیراعظم یا کسی اور کو حاصل نہیں اور نہ صدر کا یہ کام ہے کہ چیف جسٹس سے سوال جواب کرے اور کہے کہ چونکہ وہ مجھے مطمئن نہیں کر سکے اس لیے میں ریفرنس بھیج رہا ہوں۔ یہ دستور کی کھلی خلاف ورزی ہے۔ ہمیں ان دستوری ماہرین کی رائے تسلیم کرنے میں تامل ہے جو یہ کہتے ہیں کہ چیف جسٹس کے خلاف ریفرنس ہو ہی نہیں سکتا۔ دفعہ ۲۰۹ میں اس کے لیے اگر لفظی گنجائش ہے بھی' تو یہ عدل کے اساسی اصول کے خلاف ہے۔ ہماری نگاہ میں ریفرنس تو چیف جسٹس کے خلاف بھی دیا جا سکتا ہے لیکن دستوری طور پر متعین کردہ سپریم جوڈیشنل کونسل ہی کو بھیجا جا سکتا ہے۔ قانون کے ایک دوسرے اساسی اصول کہ ایک شخص اپنے معاملے میں خود جج نہیں ہو سکتا اس کی رو سے ایسی صورت میں متعلقہ جج اس ریفرنس کی حد تک کونسل میں شریک نہیں ہوگا اور دستور کے مطابق دوسرا سینئر جج اس کا رکن ہو جائے گا۔ صدر کا چیف جسٹس کو کیمپ آفس میں طلب کرنا، خود

استفسار کرنا' جواب طلب کرنا اور وہ بھی فوجی وردی میں دستور اور شائستگی ہر ایک کے خلاف تھا۔ اس طرح صدر نے دستور کی کھلی خلاف ورزی کا ارتکاب کیا ہے اور دستور کے ایک ستون یعنی عدلیہ کی آزادی پر ضرب لگائی ہے۔

دوسری چیز چیف جسٹس سے استعفا طلب کرنے سے متعلق ہے۔ یہ اختیار دستور نے صدر کو نہیں دیا اور انہوں نے یہ مطالبہ کر کے دستور کی خلاف ورزی اور عدلیہ کی آزادی پر ایک اور حملہ کیا ہے۔

تیسرا غیر قانونی عمل چیف جسٹس کے استعفا نہ دینے کے عندیے کے اظہار پر انہیں معطل کرنے کا ہے جس کا کوئی اختیار صدر یا سپریم جوڈیشنل کونسل کسی کو بھی حاصل نہیں۔ چیف جسٹس اس وقت تک چیف جسٹس رہتا ہے جب تک اس کے خلاف کونسل فیصلہ نہ دے دے۔ آداب عدالت کا تقاضا ہے کہ وہ خود چھٹی پر چلا جائے یا خود کو ان امور سے غیر متعلق کر لے جو فیصلے پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ لیکن اسے غیر فعال کرنا یا جبری رخصت پر بھیجنا دستور اور قانون کے خلاف ہے۔ اب ۱۹۷۰ء کے جس قانون کی بات کی جا رہی ہے وہ ۱۹۷۳ء کے دستور کے بعد غیر مؤثر ہو چکا ہے اور ۱۹۷۵ء کے جواز کا تعلق صرف ان امور سے ہے جو اس قانون کے تحت ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۵ء کے درمیان ہوئے۔ آئندہ کے لیے ۱۹۷۳ء کا دستور اصل حَکَم ہے۔

چوتھی دستوری خلاف ورزی چیف جسٹس کی موجودگی میں قائم مقام چیف جسٹس کا تقرر اور دستور کے واضح احکام میں کا غیر قانونی اضافہ کر کے سینئر ترین جج کی جگہ اس کے جونیئر جج کا اس عہدے پر تقرر ہے۔ یہ روایت خود بڑی غلط ہے اور عدلیہ کی آزادی کے لیے بڑا خطرہ اور انتظامیہ کے لیے دراندازیوں کا دروازہ کھولنے والی ہے۔

پھر یہ ایک معمہ ہے کہ چیف جسٹس افتخار محمد چودھری ۱۱ بجے صبح سے ۴ بجے شام تک خاکی صدر کے کیمپ میں محصور تھے۔ جرنیل صاحب کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے

جمعہ کی نماز سے قبل یعنی ایک اور دو بجے کے درمیان چیف جسٹس کو ریفرنس کی چارج شیٹ دی۔ قائم مقام چیف جسٹس کی تقریب حلف برداری ۴ بجے ہو جاتی ہے اور اس میں سندھ اور پنجاب کے چیف جسٹس حضرات نے بھی شرکت کی جو جوڈیشنل کونسل کے رکن تھے اور جن کو خاص طور پر خصوصی جہاز کے ذریعے لایا گیا جس میں لازماً ۴ گھنٹے لگے ہوں گے۔ پھر طرفہ تماشا ہے کہ وزارتِ قانون کا نوٹیفکیشن ۳ بجے جاری ہوا ہے جس میں قائم مقام چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کو غیر فعال کرنے کا فیصلہ کیا۔

اوّل تو یہی محل نظر ہے کہ کیا دستور، جوڈیشنل کونسل کو یہ اختیار دیتا ہے؟ لیکن بفرض محال اگر یہ اختیار تھا بھی' تو صدر کے چیف جسٹس کو غیر فعال کرنے کے بعد اسے غیر فعال کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا اس کے یہ معنی نہیں کہ صدر نے غیر فعال کرنے کا جو اقدام کیا وہ صحیح نہیں تھا اور اسی وجہ سے کونسل نے دوبارہ یہ اقدام کیا۔ لیکن اگر صدر کا وہ اقدام درست نہیں تھا تو قائم مقام چیف جسٹس کا تقرر اور اس کے حلف کا اقدام قانونی اور دستور کے مطابق کیسے ہو سکتے ہیں؟ خاص طور پر، جب کہ دستور میں سینئر ترین جج کا قائم مقام مقرر کیا جانا دفعہ ۱۸۰ کے تحت ایک لازمی فرض ہے اور دستور میں غیر قانونی اضافہ کرنے کا کسی کو اختیار نہیں۔

یہ سب بڑے سنگین دستوری اور قانونی سوال ہیں اور ان کا سامنا کیے بغیر ملک قانون کی حکمرانی کی طرف پیش قدمی نہیں کر سکتا۔ جرنیل صاحب نے یہ سب کچھ کر کے خود کو دستوری اور قومی مواخذے کا مستحق بنا لیا ہے ـــ دیکھیے' قانون سب کے لیے' کا اصول کب حرکت میں آتا ہے۔

جس طرح یہ سارا اقدام کیا گیا ہے، اس کے دستوری پہلوؤں کے ساتھ اہم سیاسی اور اخلاقی پہلو بھی ہیں چیف جسٹس کو کیمپ آفس میں بلانا، ان سے سوال وجواب کا وہ عمل کرنا جو صرف جوڈیشنل کونسل ہی کسی جج سے کر سکتی ہے، اور پھر فوج

کے چیف آف اسٹاف کی وردی میں یہ عمل کرنا اور ٹی وی اور میڈیا میں اس کی تصاویر جاری اور نشر کرنا، پھر جب تک چیف قائم مقام چیف جسٹس کی حلف برداری مکمل نہ ہو گئی۔ چیف جسٹس کو کیمپ آفس میں محبوس رکھنا' جبکہ جرنیل صاحب بقول خود اس عرصے میں یعنی ۳ بجے کی فلائٹ سے کراچی روانہ ہو گئے۔ (یہ بات انہوں نے جیو کے انٹرویو میں خود کہی ہے) پھر چیف جسٹس کی کار سے جھنڈا اتارنا' ان کے گھر سے جھنڈا اتارنا' ان کو سپریم کورٹ نہ جانے دینا اور زبردستی ان کو گھر میں محبوس کرنا' ان کے گھر کی پولیس اور رینجرز کی ناکہ بندی، ٹیلی فون، ٹیلی ویژن، اخبارات، ذاتی عملہ ہر چیز سے محروم کر دینا' گھر کے اندر سیکورٹی ایجنسیوں کا ہر چیز پر قبضہ کر لینا اور پورے خاندان کو ایک وقت تک صرف ایک کمرے میں بند کر دینا، ملنے جلنے پر پابندی —— یہ کس اخلاق کا مظاہرہ ہے؟ چیف جسٹس قومی پروٹوکول میں صدر، وزیر اعظم اور سینیٹ کے صدر کے بعد چوتھے یا پانچویں نمبر آتا ہے۔ آرمی کے چیف آف اسٹاف کا نمبر پھر اس کے دس نمبروں کے بعد آتا ہے۔ پھر ابھی آپ نے ریفرنس بھیجا ہے' اس کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں ہوا لیکن جرم کے اثبات سے پہلے ایسی گھناؤنی سزا قانون' انصاف اور اخلاق ہر ایک کے خلاف ہے اور اس جرم کا ارتکاب کرنے والوں کو (خواہ وہ کیسے ہی اونچے مراتب پر فائز ہوں) سزا نہ دینا قومی جرم ہو گا۔

یہ تو ۹ مارچ کی بات ہے۔ پھر چیف جسٹس کے ساتھ ۱۳ مارچ کو جو کچھ ہوا وہ اس سے بھی زیادہ شرمناک اور مجرمانہ فعل ہے۔ اس پورے عرصے میں وکلا برادری کے احتجاج اور سیاسی جماعتوں اور عوام کی احتجاجی سرگرمیوں کو جس طرح اندھی قوت کے ذریعے دبانے کی کوشش کی گئی ہے اور میڈیا کے ذریعے صریح جھوٹ اور دھوکے کی جو مہم چلائی گئی ہے اس نے قانون اور اخلاق دونوں کی دھجیاں بکھیر دی ہیں۔ جو حکمران اس سطح پر اتر سکتے ہیں وہ ہر قسم کے جواز سے محروم ہو جاتے ہیں اور ان کا شمار مجرموں کی

صف میں ہوتا ہے کیا جرنیل صاحب اور ان کے حواریوں کو ان حقائق کا کچھ بھی شعور ہے؟ اور کیا وہ قوم اور پوری دنیا کو بالکل بے عقل سمجھتے ہیں کہ گوئبلز کو مات کرنے والے ان کرتبوں سے وہ انہیں بے وقوف بنا سکتے ہیں؟ ملک اور بین الاقوامی میڈیا پر جس کی نظر ہے وہ جانتا ہے کہ حکومت کی ان تمام کارستانیوں کا انجام اس سے مختلف نہیں کہ آسمان پر تھوکا منہ پر ـــــــ

عدلیہ کا امتحان

چیف جسٹس کے خلاف ریفرنس کی جو جھلکیاں سرکاری خفیہ خبر رسانی کے ذریعے سامنے آئی ہیں، ان کے بارے میں سب حیران ہیں کہ کیا یہی وہ چارج شیٹ ہے جس کے سہارے جرنیل صاحب نے یہ اقدام کیا ہے؟ جسٹس افتخار محمد چودھری نے اپنے کھلے دفاع کا اعلان کیا ہے اور یہ ان کا حق ہے اور فرض بھی۔ اگر ان سے کوئی غلطی ہوئی ہے تو اس کا احتساب ضرور ہونا چاہیے۔ لیکن جو کچھ اخبارات میں آیا ہے یا جو ریفرنس سے پہلے ان کے میڈیا ٹرائل کے ذریعے قوم کے سامنے لایا گیا ہے اس میں بظاہر کوئی ایسی چیز نہیں جسے دستور' قانون یا عدالتی آداب کی صریح اور قابل گرفت خلاف ورزی کہا جا سکے۔ لیکن اس سلسلے میں اصل فیصلہ انصاف اور حق کے مطابق سپریم جوڈیشل کونسل ہی کر سکتی ہے اور اسے ہی کرنا چاہیے۔ البتہ قانون سب کے لیے کے علم برداروں سے اتنی گزارش کرنے کی جسارت ہم بھی کر سکتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مشہور واقعہ آپ کے لیے بھی بہت کچھ پیغام رکھتا ہے کہ:

تم میں سے جس نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے وہ پہلا پتھر پھینکے۔

اور تاریخ گواہ ہے اس مجمع میں پہلا پتھر پھینکنے والا کوئی سامنے نہ آیا۔

جیسا کہ ہم نے پہلے کہا کہ آج صرف جسٹس افتخار محمد چودھری ہی کا مقدمہ ہی زیر

سماعت نہیں، ہماری عدلیہ کا بحیثیت ادارہ بھی امتحان ہے اور پوری قوم ہی سخت امتحان کی گھڑی میں ہے۔ عدلیہ کی تاریخ میں روشن اور تاریک دونوں پہلو نظر آتے ہیں۔ جس طرح مختلف ادوار میں نظریہ ضرورت کے نام پر اصول اور اداروں کے صحیح خطوط پر ارتقا کے عمل کو نقصان پہنچا ہے اب اس کی تلافی کا وقت آ گیا ہے نیز ارباب اختیار کے پروٹوکول' مالی فوائد اور مراعات کا مسئلہ بھی اب ڈھکا چھپا نہیں بلکہ اس کا کھل کر سامنا کرنا ہوگا۔

مسئلہ ایک فرد کے کاروں اور جہازوں کے استعمال کا نہیں' حکمرانی کے اس پورے کلچر کا ہے جس کو ایک مخصوص طبقے نے ملک پر مسلط کر دیا ہے اور ہر کوئی اس دوڑ میں شریک ہو چکا ہے۔ ہر فوجی طالع آزما کے لیے جواز فراہم کرنے والوں اور ہر عبوری دستور پر حلف لینے والوں کی روش پر اب نہ صرف کھلا احتساب ہونا چاہیے بلکہ اس بری روایت کو ختم ہونا چاہیے تاکہ ملک میں حقیقی جمہوریت' دستور اور قانون کے احترام' اداروں کے استحکام' اداروں کی بنیاد پر پالیسی سازی اور فیصلہ کرنے کا نظام قائم ہو سکے اور یہ قوم اور ملک جن مقاصد کے لیے جمہوری جدوجہد اور امت مسلمہ پاک و ہند کی بے شمار قربانیوں کے بعد حاصل کیا گیا تھا۔ آج عدلیہ اور سیاسی قیادت ہی نہیں پوری قوم کے لیے فیصلے کی گھڑی ہے اور سابق جج اور نامور وکیل فخرالدین جی ابراہیم نے ایک مجلے میں جس چیلنج کی نشاندہی کر دی ہے اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کا وقت ہے:

> اگر لوگ اس وقت احتجاج کرنا چھوڑ دیں تو وہ بھلے آزاد عدلیہ کو بھول جائیں۔

ان کی بات سے مکمل اتفاق کے ساتھ ہم اس پر یہ اضافہ ضروری سمجھتے ہیں کہ بلا شبہ اولین چیلنج عدلیہ کی آزادی اور اس پر فوجی حکمرانی کے شب خون سے پیدا شدہ حالات کے مقابلے کا ہے لیکن بات اس سے زیادہ ہے۔ یہ حملہ جس وجہ سے ہوا ہے وہ

سیاست میں فوج کی مداخلت اور انتظامیہ پر چیف آف اسٹاف کا قبضہ ہے۔ اب عدلیہ کی آزادی بھی اسی وقت حاصل ہو سکے گی جب جرنیلی آمریت سے نجات حاصل کی جائے' دستور کو اس کی اصل شکل میں نافذ کیا جائے' پارلیمنٹ کی بالادستی بحال ہو، دستور کی تینوں بنیادوں پر خلوص اور دیانت سے عمل ہو یعنی اسلام پارلیمانی جمہوریت اور حقیقی فیڈرل نظام کا قیام۔ یہ سب اسی وقت ممکن ہے جب قومی جدوجہد عدلیہ کی آزادی کے ہدف کے ساتھ عدلیہ پر حملے کے اسباب اور ان قوتوں کو بھی غیر مؤثر بنانے پر توجہ مرکوز کرے جو دستور' جمہوریت اور عدلیہ کی آزادی کی بساط لپیٹ دینے پر تلے ہوئے ہیں۔

یہ اسی وقت ممکن ہے جب اقتدار دستور کے مطابق عوام کو منتقل کیا جائے' جرنیلی آمریت سے نجات پائی جائے اور حقیقی طور پر آزادی عبوری حکومت کے تحت آزاد الیکشن کمیشن کے تحت صاف اور شفاف انتخابات منعقد کئے جائیں تاکہ عوام اپنی آزاد مرضی سے اپنے نمائندے منتخب کریں جو دستور کے مطابق اور قومی احتساب کے بے لاگ نظام کے تحت اپنی ذمہ داری ادا کریں۔ فوج اپنے پروفیشنل دفاعی ذمہ داریوں تک محدود ہو اور سیاست کو سرکاری ایجنسیوں کی دست برد سے پاک کیا جائے۔ جزوی اہداف سے اصل مقاصد حاصل نہیں ہو سکتے۔ اب اس جدوجہد کو مکمل جمہوریت اور دستور کے الفاظ اور روح دونوں کے مکمل نفاذ تک جاری رہنا چاہیے۔

[ترجمان القرآن جلد ۱۳۴/ اپریل ۲۰۰۷ء]

چیف جسٹس بحران....اصل کردار کون ہے؟

قاضی حسین احمد لکھتے ہیں:

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد ایک بار پھر باقی ماندہ پاکستان خطرناک سیاسی

عدم استحکام سے دوچار ہے۔ حکمرانوں نے آئین وجمہوریت کے بعد عدلیہ پر شب خون مارنے کی کوشش کی ہے مگر سپریم کورٹ کے چیف جسٹس افتخار محمد چودھری نے غیر آئینی غیر قانونی اور غیر اخلاقی دباؤ کے سامنے جھکنے سے انکار کر کے آئین وجمہوریت کی بحالی اور فوجی وردی میں ملبوس فرد واحد کی آمریت کے خاتمے کا راستہ کھولا ہے۔ سیاسی جماعتوں، وکلاء برادری اور میڈیا نے اس انکار میں ان کا بھرپور ساتھ دیا ہے۔ اگر پوری قوم گوشہ عافیت سے نکل کر ان کے دکھائے رستے پر چل پڑے اور ہر طرف سے آئین کی بالادستی کی صدا بلند ہو تو ہمارا ملک اور ہماری قوم اس شدید بحران سے نکل کر ایک شاندار مستقبل کی طرف گامزن ہو سکتی ہے۔ جسٹس افتخار محمد چودھری کو چیف جسٹس کجا ایک آزاد شہری کی طرح بھی نقل وحرکت کی اجازت نہیں ہے۔ پرویز مشرف عوامی جلسوں میں اپنے دائر کردہ ریفرنس پر اظہار خیال کر رہے ہیں اور ٹی وی پر آ کر اپنی صفائیاں پیش کر رہے ہیں۔ ان کے وزرا چیف جسٹس کے خلاف ٹرائل میں دروغ گوئی کے ذریعے ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی کوشش میں ہیں، سرکاری میڈیا ان کی کردار کشی کے لیے استعمال ہو رہا ہے، ان کے خلاف نہایت بے ہودہ الزامات کا طومار باندھا جا رہا ہے۔ مگر روشن خیالی اور اعتدال پسندی۔ کے اس ''زریں عہد'' میں ایک چیف جسٹس کو حق کہنے اور اپنی صفائی پیش کرنے کی اجازت نہیں ہے اور حیرت ہے کہ ان کی اس خاموشی کو ''سیاسی ڈرامہ بازی'' قرار دیا جا رہا ہے۔ جب حکومت کے تمام کل پرزے اپنے ''چیف'' کی حمایت میں میدان عمل میں نکل کھڑے ہوئے ہیں تو چیف جسٹس کو بھی اپنی صفائی میں کچھ کہنے اور حقائق کو منظر عام پر لانے کا موقع دیا جانا چاہیے۔ جب چیف آف آرمی سٹاف عوامی جلسوں اور اپنے انٹرویوز میں ریفرنس کے پس منظر سے لوگوں کو آگاہ کر رہا ہے تو چیف جسٹس آف پاکستان کو بھی ایسے انٹرویوز کا موقع دیا جانا چاہیے جس میں وہ پاکستانی قوم کو صحیح صورتحال سے آگاہ

کرسکیں۔

اس سارے قضیہ کا ایک خاص پہلو تمام لوگوں کے سامنے رہنا چاہیے۔ اب جب چیف جسٹس نے استعفیٰ دینے اور فرد واحد کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا ہے اور وکلا اور جج صاحبان سمیت پوری قوم عدل وانصاف کی بالادستی کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی ہے تو اس قضیہ کے اصل کردار اور چیف جسٹس کو منظر سے ہٹانے کے پس پردہ مقصد سے توجہ ہٹانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ ریفرنس حکومت اور وزیر اعظم نے پیش کیا جس پر صدر کو آئینی طور پر کارروائی کرنی پڑی۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ پشاور ہائی کورٹ کے ایک جج نے خط لکھا اور مستعفی ہونے کی دھمکی دی، کبھی کہا جاتا ہے کہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس صاحبان اور چیف سیکرٹریز اور آئی جی صاحبان نے شکایت کی۔ معاملے کے ہاتھ سے نکلتے نظر آنے پر یہ سب وضاحتیں اس کردار سے توجہ ہٹانے کی کوشش ہیں جس نے اپنے اقتدار کو طول دینے کے پیش نظر یہ سارا منظرنامہ تخلیق کیا۔ تعجب ہے کہ ''سازش'' کا تانابانا بننے والے اب خود اپنے خلاف سازش کی دہائی دے رہے ہیں اور عوام کو باور کرانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ کچھ درپردہ حقائق وقت آنے پر عوام کے سامنے کھولیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت ملک میں دستور اور قانون کی حکمرانی نہیں ہے، فرد واحد کا کہا ہوا لفظ اس کے کارندوں کے لیے قانون اور اس کی ہر خواہش حکم کا درجہ رکھتی ہے۔ ایک ایک کر کے ادارے ختم کیے جا رہے ہیں، عدل وانصاف کا خون ہو رہا ہے، ہر طرف غنڈہ گردی اور بدمعاشی کا راج ہے، شخصی آزادیاں خطرے میں ہیں، وکلا کو ریاستی غنڈہ گردی کا سامنا ہے، میڈیا کو نشانے پر دھر لیا گیا ہے ملک کو امریکہ کا غلام بنا دیا گیا ہے اپنے لوگوں کو پکڑ پکڑ کر اس کے حوالے کیا جا رہا ہے اور قوم کے دفاع پر مامور فوج کو قوم ہی کے مدمقابل لاکھڑا کیا گیا ہے۔ فرد واحد کے اقتدار کو دوام بخشنے

کے لیے آئین، جمہوریت، پارلیمنٹ اور عدلیہ کو بازیچہ اطفال بنا دیا گیا ہے۔ اس سارے منظر نامے میں خود فوج کی ساکھ داؤ پر لگی ہے اور چند جرنیلوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے اسے لوگوں کی نظروں سے گرایا جا رہا ہے۔ جب فوج اور عوام میں خلیج حائل ہو گئی تو ملک کا دفاع کیسے ممکن ہو سکے گا؟

ہم سمجھتے ہیں کہ ۱۹۷۳ء کا دستور اپنی بعض خامیوں کے باوجود مختلف سیاسی جماعتوں، عوام کے مختلف طبقوں، وفاق کے تمام یونٹوں اور تمام قومی اداروں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے والے ایک عمرانی معاہدے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر یہ دستور اپنی بنیادی روح کے ساتھ بحال ہو جائے اور اس پر اخلاص کے ساتھ عمل کیا جائے تو ہم ایک اسلامی اور جمہوری و عادلانہ معاشرے کی بنیاد رکھ سکتے ہیں۔ استعماری قوتوں کی یہ کوشش ہے کہ مسلمانوں کو یہ موقع نہ مل سکے کہ وہ متحد ہو کر دنیا کے سامنے اسلام کے نظام عدل وانصاف پر مبنی ایک پرامن معاشرے کی بنیاد ڈال سکیں اس لیے وہ ہمارے ملک کے پیچھے پڑ گئے ہیں اور ہمیں اعتدال پسند اور انتہا پسند کے جھوٹے لیبلوں کی بنیاد پر آپس میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں۔ سپریم جوڈیشنل کونسل میں جسٹس افتخار کے کیس کی سماعت کے دوران عدل وانصاف کی فضا قائم رہنی چاہیے امریکی اشارے پر کسی کو بھی ڈفلی بجانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے چیف جسٹس کی غیر آئینی وغیر قانونی معطلی پر قوم نے جس بیداری، وکلا برادری نے جس اتحاد و یگانگت اور صبر واستقامت، میڈیا نے جس ہمت وحوصلے اور مستعفی ہونے والے جج حضرات نے جس زندہ دلی کا ثبوت دیا ہے وہ قابل تحسین ہے۔

وکلا، سیاسی کارکنوں، صحافیوں اور مستعفی ہونے والے جج حضرات نے آئین وجمہوریت اور عدل وانصاف کی بالادستی کے لیے قربانی دی ہے اللہ انہیں اس کا صلہ دے گا اور ان کی یہ قربانی پاکستان میں جمہوریت کی بحالی، فرد واحد کی

آمریت کے خاتمے اور عدل وانصاف پر مبنی ایک اسلامی معاشرے کے قیام کا باعث بنے گی۔ (ان شاء اللہ)

حقائق کی اندرونی حقیقت

فیروز الدین احمد فریدی لکھتے ہیں کہ

قوم آج سخت درد کے عالم میں ہے درد کی اقسام ہوتی ہیں مثلاً ایک درد دل وہ ہوتا ہے جو عدم کی راہ دکھاتا ہے۔ ایک درد دل وہ ہوتا ہے جو آدمی کو انسان بنا دیتا ہے اور جس میں تکلیف کی بجائے لذت محسوس ہوتی ہے' بعض درد کلفت کی بنا پر ہی راحت کا سامان بنتے ہیں۔ تکلیف نہ ملے تو راحت بھی نہیں ملتی۔ دردِ زِہ میں ماں جس تکلیف سے دوچار ہوتی ہے وہ ایک ماں ہی جانتی ہے۔ اس درد کے نتیجے میں کائنات میں جو تخلیق ہوتی ہے اس کی مسرت ماں سے بڑھ کر کون جان سکتا ہے؟

مادر وطن آج دردزہ میں کراہ رہی ہے اور اس کا ہر صاحب دل فرزند اور دختر درددل کا شکار ہے۔ صاحبان دل کی سیاہ پوش فوج ملک کی وکلاء برادری ہے جس میں چھوٹے بڑے جج صاحبان بھی شامل ہوتے جا رہے ہیں۔ ہر وکیل ڈبل گریجویٹ ہوتا ہے یعنی موجودہ گریجویٹ اسمبلیوں کے ارکان سے دگنا تعلیم یافتہ۔ اس کی ساری زندگی قانون پڑھنے، سمجھنے، سمجھانے، قانون شکنی کی مخالفت کرنے اور قانون کی پاسداری کو فروغ دینے میں گزرتی ہے۔ اگر پورے ملک میں ہر چھوٹے بڑے شہر میں وکلاء ہر روز عدالتوں کا بائیکاٹ کر رہے ہیں جن سے ان کو دال روٹی ملتی ہے چلچلاتی دھوپ میں کالے کوٹ چڑھائے سڑکوں پر مارچ کر رہے ہیں اور اس معصوم جرم کی پاداش میں ڈنڈے کھا رہے ہیں اور خون بہا رہے ہیں تو ہمارے ہمہ دان حکمرانوں کو یہ سمجھ جانا چاہیے تھا کہ کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور ہے جس کی وجہ سے یہ طوفان تھمنے کا

نام نہیں لے رہا۔ لگتا ایسا ہے کہ بات ابھی تک پوری طرح سمجھ میں نہیں آئی اب اس کا کیا علاج ہے؟

وکالت کے پیشے کا یہ صدیوں پرانا اصول رہا ہے کہ وکیل کو موکل چننے کی مکمل آزادی ہوتی ہے۔ قتل اور غداری سے بڑے جرائم نہیں ہو سکتے۔ وکلاء قاتلوں اور غداروں کے مقدمات بے جگری سے لڑتے ہیں۔ کبھی کسی وکیل نے اس پر اعتراض نہیں کیا۔ اجتماعی احتجاج یا سماجی مقاطعہ کا تو کبھی سوال ہی پیدا نہیں ہوا پھر کیا وجہ ہے کہ باوردی جمہوریہ پاکستان کے ہر ضلعے، صوبے اور مرکز میں سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن کی حد تک پوری وکلاء برادری ہر اس وکیل پر تھوتھو کر رہی ہے جو سرکار کی طرف سے پیش ہو رہا ہے۔ اس میں وکلاء برادری کا کیا ذاتی مفاد ہے؟ ذاتی مفاد تو عدالتوں کا بائیکاٹ کرنے میں ہے نہ کہ اپنے رفقا کا سماجی بائیکاٹ کرنے میں۔ احتجاج صرف بار ایسوسی ایشن ہی نہیں بلکہ بار کونسلیں بھی کر رہی ہیں جو وکلا کے لیے ضابطہ اخلاق طے بھی کرتی ہیں اور نافذ بھی کرتی ہیں اور جن کے سرٹیفکیٹ کے بغیر کوئی وکیل عدالت میں مقدمے کی پیروی نہیں کرسکتا، کیا اب بھی بات سمجھ سے بالاتر ہے؟

ایس ایم ظفر صاحب درباری لیگ کے ٹکٹ پر دو بار سینیٹر بن چکے ہیں۔ پیر مغاں ایوب خان کے پیرزادے تو نہیں بنے لیکن وزیر قانون ضرور بنے۔ چوٹی کے وکیل ہیں لیکن اس ریفرنس میں ہماری اور ان کی قانونی پوزیشن ایک جیسی ہے۔ یہ محض حسن اتفاق ہے اور اس قدر مشترک میں کسی کی مدح کا پہلو نکل آئے تو وہ مجبور ہے۔ حالات کا جبر اسی کو کہتے ہیں خالد رانجھا صاحب کبھی ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کے صدر تھے آج یہ بار ایسوسی ایشن اپنے رانجھا کے ساتھ جس شگفتگی کا اظہار کر رہی ہے اسے کوئی وارث شاہ ہی قلم بند کرے گا اور گیارہ اپریل ۲۰۰۷ء کو سندھ ہائی کورٹ کے بار روم میں وسیم سجاد صاحب پر جو بیتی اسے پڑھ کر ہر کٹھور دل پسیج گیا ہوگا۔ وہ سرکار سے

بھاری فیس لے کر PSO کے مقدمے میں تاریخ کا التوا لینے کے لیے اسلام آباد سے کراچی آئے۔ ان کی مہربانی تھی کہ وہ اس چھوٹے سے کام کے لیے اتنی دور سے اتنا خرچ کروا کے آئے التوا مل گیا تو تھپکی لگانے ہائی کورٹ بار روم گئے۔ ان کے پیچھے پیچھے پوری وکلا برادری پہنچ گئی اور کمرے سے باہر نکل جانے کو کہا۔ نستعلیق وسیم سجاد لاکھ کہتے رہے کہ مجھے چائے تو ختم کر لینے دو لیکن وکلاء کا اصرار اتنا بڑھا کہ وسیم سجاد آدھی چائے چھوڑ کر بار روم سے چلے گئے کیا حقیقت اب بھی منکشف نہیں ہو رہی؟

رسول اللہ ﷺ کی مسنون دعا ہے۔ ''اے میرے اللہ! مجھ پر حقائق کی اندرونی حقیقت منکشف کر دے''

ہم اپنے حاکموں کے حق میں بھی یہی دعا مانگتے ہیں اندرونی حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کی پوری سول سوسائٹی آج ستارے والوں سے اتنی عاجز آ چکی ہے جتنا کوئی عاجز آ سکتا ہے۔ ایک محدود اقلیت اس کا ڈٹ کر اظہار کر رہی ہے لیکن غالب اکثریت ابھی تک خاموش ہے جس کی ٹھوس وجوہات ہیں جو سب جانتے ہیں سرکار کے پیدا کردہ مسائل عوام کے انفرادی مسائل بن گئے ہیں۔ انہیں مہنگائی، غربت، بے روزگاری، ناانصافی، رشوت، لاقانونیت، بجلی کے بل، بجلی کا گھنٹوں اور بعض دفعہ دنوں غائب ہونا اور اس طرح کے دوسرے مسائل سے فرصت ہو تو وہ قومی مسائل کے لیے سڑکوں پر نکلیں۔ ثانیاً ان کا اعتماد پاکستان کے تمام اداروں، جن میں سیاسی جماعتیں بھی شامل ہیں پر سے اٹھ چکا ہے۔ اگر عوام تارے والوں سے عاجز ہیں تو سیاست دانوں سے مایوس ہیں۔ تیسری بڑی وجہ ہے کہ حالات کے جبر نے عوام کو بے بس کرنے کے بعد بے حس بھی کر دیا ہے اور اس کی موجودہ حالت پانچ ہزار سال پہلے ہڑپہ (ضلع ساہیوال) کے باشندوں کی طرف رجوع کر چکی ہے۔ پانچ ہزار سال پہلے جب آریہ قبائل نے سندھ کی زرخیز وادی جو آج کا پاکستان ہے پر قبضہ کیا تو اپنے تسلط

کو دوام بخشنے کے لیے معاشرے کو چار درجوں میں تقسیم کر دیا اوپر برہمن تھے جن کا کام باقی سب سے کام لینا تھا اور خود حکومت کرنا تھا۔ پھر کھتری تھے جن کا کام حکومت کو قائم رکھنے کے لیے تلوار چلانا تھا پھر ویش تھے جن کے لیے تجارت اور حرفت کے پیشے مخصوص کر دیئے گئے۔ باقی سارا معاشرہ شودر کہلایا جن کا واحد کام خدمت گزاری تھا اور جن کی محنت کے استحصال پر اس معاشرے کی معاشی بنیادیں کھڑیں تھیں۔ مورخوں نے ہڑپہ میں اس تقسیم کا کھوج لگایا ہے جہاں یہ نظام سب سے پہلے قائم کیا گیا تھا اور ہڑپہ کے سب اصل باشندے شودر قرار پائے تھے۔

آج باوردی جمہوریہ پاکستان کا معاشرہ بھی کسی باضابطہ تقسیم کے بغیر چار حصوں میں بٹا ہوا ہے پاکستان کے برہمن ستاروں والے ہیں جن کی قسمت میں ہمیشہ حکومت کرتے رہنا لکھا ہے باقی تمام وردی پوش پاکستان کے کھتری ہیں جن کا فرض منصبی اس بندوبست کی حفاظت کرنا ہے۔ سٹاک، بروکر، صنعت کار، ساہوکار، سیٹھ اور جاگیردار ویش ہیں جن کا کام پیشہ بنانا اور معیشت کے پہیے چلانا ہے۔ اس کے بعد جو صرف پندرہ سولہ کروڑ لوگ باقی بچتے ہیں' وہ شودر ہیں جن کی محنت اور جن کے استحصال پر اس بندوبست کی آثار قدیمہ سے تعلق رکھنے والی یہ عمارت تا حال کھڑی ہے۔

دوسری حقیقت یہ ہے کہ یہ فانی انسان جن فانی چیزوں کو اپنی طاقت کا منبع اور مظہر سمجھتا ہے وہ بسا اوقات اس کی کمزوری کی جڑ ہوتی ہے جڑ چونکہ زیر زمین ہوتی ہے اس لیے نظر نہیں آتی اور اس کی اندرونی حقیقت صرف صاحب نظر پر منکشف ہوتی ہے۔ وردی کبھی رعب اور احترام کا نشان ہوا کرتی تھی یہ خاکی وردی جب ایک خاص جونیئر افسر میجر عزیز بھٹی کے زیب تن ہو تو احترام سے بڑھ کر عقیدت اور عقیدت سے بڑھ کر محبت کا مرکز بن جاتی ہے لیکن یہی لباس جب چار ستاروں والے اور فوج کے سب سے سینئر جنرل یحییٰ خان کے جسم پر ہو تو عبرت کا نشان بن جاتی ہے۔ دنیا میں

آج تک انسان کی عزت کسی مخصوص لباس کی وجہ سے نہیں ہوئی اس کی وجوہات مختلف ہوتی ہیں جو اندرونی حقیقتوں کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔

۹ مارچ ۲۰۰۷ء کو جنرل صاحب نے خاکی وردی پہن کر کالے کوٹ والے جج کو اپنے سامنے بٹھایا گو اس تاریخی ملاقات میں کم از کم پانچ دیگر وردی پوش بھی شامل تھے لیکن ذرائع ابلاغ کو جو سرکاری تصویر جاری ہوئی اس میں یہ اہتمام رکھا گیا کہ نمایاں افراد جنرل صاحب اور جج صاحب ہوں۔ اس تصویر میں جنرل صاحب حسب معمول اپنی مضبوط کرسی کے دائیں طرف ٹیک لگائے بیٹھے ہیں اور سامنے مہمان جج صاحب ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں (جنرل پرویز مشرف نے آرمی ہاؤس میں چیف جسٹس کو اپنے سامنے جس صوفے پر بٹھایا تھا مداحوں اور عقیدت مندوں نے اس کی قیمت بھی پانچ لاکھ روپے لگا کر آرمی ہاؤس سے اس صوفے کو خریدنے کی خواہش ظاہر کی ہے یہ چیف جسٹس سے عقیدت ومحبت کی انتہا ہے اور جنرل مشرف سے انتہائی نفرت کی علامت ہے) اس موقع عبرت کی دل کھول کر تشہیر کی گئی کہ اس سے انا کی تسکین ہوئی تھی اور سول سوسائٹی کو صحیح پیغام دینا مقصود تھا۔

سوال یہ ہے کہ کیا یہ مقصد حاصل ہوا؟ جنرل صاحب کے اپنے الفاظ میں یہ واقعہ ان کی بدنامی کا باعث بنا راقم الحروف کی جس سے بھی بات ہوئی ہر ایک نے یہی کہا کہ جنرل صاحب کو وردی پہن کر اپنے سامنے چیف جسٹس آف پاکستان کو نہیں بٹھانا چاہیے تھا۔ اس طرح وردی رعب کا نشان رہی نہ احترام کا وہ عقیدت کا مظہر رہی نہ محبت کا، وہ صرف بے جا اقتدار کے بے جا اظہار کا متکبرانہ مظہر بن کر ابھری اور دلوں پر نقش ہوگئی۔ اس کے برعکس اللہ کی شان دیکھیں کہ جس شخص نے ایک لفظ یعنی ''نہیں'' کے سوا ایک لفظ نہیں کہا وہ آج احترام اور عقیدت کا مرکز بن چکا ہے۔

بے شک وہ جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلت دیتا ہے۔'' وہ

کب دیتا ہے اور کیسے دیتا ہے یہ اسی کے راز ہیں جو سب تدبیروں سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔ حقائق کی یہ وہ اندرونی حقیقت ہے جو بہت اہتمام سے لی گئی تصویروں میں عیاں نہیں ہو پاتی اور تصویر بنانے والوں کو تصویر حیرت بنا دیتی ہے۔

علی جاوید نقوی لکھتے ہیں:

چیف جسٹس آف پاکستان جسٹس افتخار محمد چودھری اور صدر جنرل مشرف کے درمیان اختلافات اچانک پیدا نہیں ہوئے۔ ان اختلافات کا آغاز اس وقت ہوا جب ایٹمی فضلات کو ٹھکانے لگانے اور اس کے باعث سویلین آبادی کے متاثر ہونے کا ایک کیس سپریم کورٹ میں پیش ہوا۔ اس کیس میں جنرل پرویز مشرف کی سوچ اور چیف جسٹس کی سوچ میں واضح فرق تھا۔ جی۔ ایچ۔ کیو اور اعلیٰ فوجی افسران کو زمینوں کی الاٹمنٹ کے کیس نے ان اختلافات کو مزید بڑھایا۔ جبکہ گمشدہ افراد کے کیس اور اس کیس کو لے کر آئی ایس آئی کے فوجی افسران کی کھچائی نے ان اختلافات میں شدت پیدا کر دی۔ پچھلے سال کی بات ہے میں چند صحافی دوستوں کے ہمراہ لاہور پریس کلب میں بیٹھا تھا۔ بات شروع ہوئی کہ صدر جنرل پرویز مشرف انتہائی طاقتور اور بااختیار صدر ہیں۔ اپوزیشن سمیت کوئی ان سے پنگا لینے کی جرأت نہیں کر رہا۔ میں نے اپنی رائے دیتے ہوئے کہا کہ چیف جسٹس افتخار محمد چودھری' صدر جنرل پرویز مشرف کے لیے ایک بڑا خطرہ بن سکتے ہیں اس وقت میرے پاس کوئی انفارمیشن نہیں تھی۔ ان کیسز میں چیف جسٹس کے ریمارکس کے باعث یہ میرا ذاتی تجزیہ تھا۔ صرف ایک سال میں صورتحال سب کے سامنے ہے۔ اس لڑائی میں ریاست کے دوستون چیف جسٹس آف پاکستان اور میڈیا ایک طرف تھا۔ اپوزیشن جماعتوں کے رہنما، ملک بھر کے وکلاء اور خاص کر عوام کی اکثریت بھی چیف جسٹس کے ساتھ تھی جبکہ دوسری طرف صدر مشرف کو اپنی حکومت' وزراء' انتظامیہ اور فوج کی حمایت حاصل تھی۔ (یہ

الگ بات ہے کہ اس معاملے میں بعض اعلیٰ فوجی افسران کی سوچ صدر مشرف کی سوچ سے مختلف ہے) دو ماہ قبل جنوری ۲۰۰۷ء میں مجھے اسلام آباد سے بعض دوستوں نے بتایا کہ چیف جسٹس کو برطرف کرنے کا اختیار نہیں، لیکن ۹ مارچ کی شام بہت سے ٹی وی چینلز پر یہی خبر چل رہی تھی کہ صدر مشرف نے چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کو فارغ کر دیا ہے اور ان کی جگہ قائم مقام چیف جسٹس جاوید اقبال نے حلف اٹھا لیا ہے۔ پھر چشم فلک نے یہ بھی دیکھا کہ چیف جسٹس آف پاکستان کے ساتھ اسلام آباد پولیس نے کیا سلوک کیا۔ وہ جو پاکستان کے ۱۶ کروڑ عوام کی امید اور انہیں انصاف فراہم کرنے والا ہے خود انصاف کا طالب بن گیا۔

اختلافات کے باعث حکومت کی خواہش تھی کہ چیف جسٹس اپنے منصب سے استعفیٰ دے دیں۔ لیکن چیف جسٹس نے استعفیٰ دینے سے انکار کر دیا۔ صدر مشرف کو رپورٹیں دی جا رہی تھیں کہ چیف جسٹس حکومت کے لیے مشکلات پیدا کر رہے ہیں اور ایسا لگ رہا ہے کہ اصل حکمران صدر مشرف نہیں بلکہ چیف جسٹس آف پاکستان ہیں۔ جو کسی کو بھی طلب کر کے باز پرس کر سکتے ہیں۔ خفیہ ایجنسیوں خصوصاً آئی ایس آئی کے افسران' لاپتہ افراد کے کیس میں خوب تنقید کا نشانہ بنے۔ آئی ایس آئی کی طرف سے کہا گیا کہ بعض معاملات سپریم کورٹ کے روبرو نہیں لائے جا سکتے۔ جبکہ چیف جسٹس چاہتے تھے کہ سب کچھ سامنے آئے خفیہ ایجنسیوں کا خیال تھا کہ یہ باتیں قومی مفاد میں نہیں۔ پھر یہ افواہیں پھیلیں کہ صدر کی وردی کے حوالے سے چیف جسٹس نے ایک نجی محفل میں کہا ہے کہ صدر مشرف دو عہدے اپنے پاس نہیں رکھ سکتے۔ انہیں آرمی چیف اور صدر کے منصب میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا چاہیے۔ متحدہ مجلس عمل کے بعض ارکان کی مدارس ڈگریوں کا معاملہ بھی سپریم کورٹ میں تھا۔ اور اس پر بھی خدشہ ظاہر کیا جا رہا تھا کہ فیصلہ حکومت کے مفادات کے خلاف ہوگا، عام انتخابات

اور صدر مشرف کی جانب سے اسمبلیوں سے دوبارہ ووٹ لینے کے آئینی وقانونی معاملے پر بھی حکومت کے تحفظات تھے اور حکومت کو خدشہ پیدا ہوگیا تھا کہ چیف جسٹس آف پاکستان جسٹس افتخار محمد چودھری ان کے خلاف فیصلہ سنا سکتے ہیں۔ یہی وہ وجوہات تھیں جن کے باعث صدر مشرف نے چیف جسٹس کے خلاف صدارتی ریفرنس دائر کیا۔ ایسا لگتا ہے کہ صدر جنرل مشرف کے ''شاہ سے زیادہ شاہ کے وفاداروں'' نے انہیں یقین دلایا ہوگا کہ صدارتی ریفرنس آنے کے بعد چیف جسٹس دباؤ کا شکار ہوکر مستعفی ہونے پر مجبور ہو جائیں گے لیکن چیف جسٹس افتخار محمد چودھری نے استعفیٰ نہ دینے اور جھکنے سے انکار کر کے حکومت کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

اس وقت صورتحال یہ ہے کہ پاکستان ۱۶ کروڑ عوام، میڈیا، وکلاء اور سیاسی کارکن چیف جسٹس کے ساتھ ہیں۔ صدر مشرف کو کبھی عوام کی اتنی نفرت اور مخالفت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ جتنا اب کرنا پڑا ہے۔ وکلاء اور دانشوران کے پتلے جلا رہے ہیں اور ان کے لیے وہ نعرے لگا رہے ہیں۔ جو ایوب خان کے لیے لگائے جاتے تھے۔ صدر مشرف نے ۱۲، اکتوبر ۱۹۹۹ء سے لے کر ۹ مارچ ۲۰۰۷ء تک جو اقدامات کئے۔ قوم اس پر تقسیم تھی ان کی حمایت اور مخالفت دونوں موجود تھیں لیکن ۹ مارچ ۲۰۰۷ء کے اقدام نے انہیں بالکل تنہا کر دیا ہے اور جیسا کہ وہ خود اپنی کتاب ''ان دی لائن آف فائر'' میں لکھتے ہیں کہ اس مقام پر انسان خود کو تنہا محسوس کرتا ہے۔ حقیقت میں انہوں نے خود کو تنہا کر لیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے لاہور میں ایک اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے صدر مشرف نے کہا تھا کہ وہ ایک مصیبت سے نکلتے ہیں تو دوسری مصیبت میں پھنس جاتے ہیں۔ وہ کبھی خود بھی سوچتے ہیں کہ یہ مصیبتیں اکٹھی کیوں نہیں آجاتیں۔'' لیکن اب وہ جس مصیبت میں پھنسے ہیں وہ آئی نہیں بلکہ انہوں نے خود کو اس مصیبت میں پھنسایا ہے آپ اسے کہہ سکتے ہیں۔ ''آ بیل مجھے مار''۔

میں اس ساری صورتحال کو ایک اور نظر سے بھی دیکھتا ہوں اور وہ امریکی سازشیں اور پاکستان میں امریکی مفادات ہیں۔ پاک فوج اور ہماری خفیہ ایجنسیوں کے بارے میں آپ کی کچھ بھی رائے ہو۔ لیکن میری رائے یہ ہے کہ فوج اور ہماری خفیہ ایجنسیاں ہماری ہی ہیں۔ اگر ہمارے یہ مضبوط بازو نہ ہوتے تو امریکہ کب کا پاکستان پر حملہ کر چکا ہوتا۔ سی آئی اے ڈاکٹر قدیر خان کو تفتیش کے لیے لے جا چکی ہوتی اور پاکستان کا ایٹمی پروگرام ختم ہو چکا ہوتا۔ موجودہ صورتحال سے ہماری خفیہ ایجنسیوں اور فوج کی بھی بدنامی ہوئی ہے بعض لوگوں نے جذبات میں آ کر فوج اور خفیہ ایجنسیوں پر بھی تنقید کی۔ جس سے فوج اور عوام میں فاصلے پیدا ہو گئے اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت پاکستان نے امریکہ کو ایران پر حملہ کرنے اور مداخلت کرنے کے لیے بلوچستان کی سرزمین دینے سے انکار کر دیا ہے لیکن امریکی دباؤ بدستور موجود ہے۔ امریکہ چاہتا ہے کہ پاکستان ایران پر حملے کے لیے اسی طرح تعاون کرے جس طرح افغانستان کے خلاف کیا تھا۔ اگر اس سارے معاملے میں امریکی ہاتھ ملوث ہوا تو آنے والے دنوں میں حالات بہتری کی جانب جانے کی بجائے مزید ابتری کا شکار ہوں گے۔

کسی بھی لڑائی محاذ آرائی اور بحران میں بالآخر کمزور کو ہی شکست ہوتی ہے اور طاقتور کامیاب ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ کامیابی ظاہری ہے۔ اگر یہ کامیابی پاکستان کے عوام کے دل توڑ کر ان کے جذبات مجروح کر کے اور طاقت اور اختیارات کا غلط استعمال کر کے حاصل کی جائے تو یہ کامیابی دراصل ناکامی ہے۔ کامیاب وہ ہوتا ہے جو دوسروں کے دل جیت لے۔ اس کے لیے دوسروں کے دلوں میں محبت اور احترام ہو۔ اور سب جانتے ہیں کہ اس وقت عوام کے دل چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کے لیے دھڑک رہے ہیں۔ اس بحران کا ایک حل تو یہ ہے کہ حکومت اس ساری صورتحال پر

معذرت کرے چیف جسٹس کو غیر فعال کرنے کی بجائے مکمل طور پر بحال کر دیا جائے اور سارا معاملہ سپریم جوڈیشل کونسل کے سپرد کیا جائے وہ جو فیصلہ دے اسے پوری قوم دل جان سے تسلیم کرے گی۔ لیکن مجھے نہیں لگتا حکومت اسی راستے کا انتخاب کرے گی۔ شاہ سے زیادہ شاہ کے وفادار ایسا نہیں ہونے دیں گے اور وہ طاقت اور اختیارات کا استعمال کر کے چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کو پسپائی پر مجبور کرنے کی کوشش کریں گے۔ چیف جسٹس کی معطلی کے بعد انہیں جبراً رخصت پر بھیجنا اس بات کا ثبوت ہے کہ بعض لوگ مفاہمت نہیں چاہتے اور وہ جان بوجھ کر حالات خراب کر رہے ہیں حکومت اس بات کو ذہن میں رکھے کہ ملک کے دانشور، وکلاء، صحافی اور سیاسی کارکن چیف جسٹس کے ساتھ ہیں اگر وہ سڑکوں پر نکل آئے تو تاریخ وہ فیصلہ دے گی جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ بعض نادیدہ طاقتیں فوج اور عوام کو لڑانا چاہتی ہیں۔ صدر جنرل پرویز مشرف اور بعض وزراء نے ٹی وی چینل جیو نیوز پر پولیس کے حملے کے بعد جیو سے معافی مانگ لی۔ انہیں چاہیے کہ وہ چیف جسٹس آف پاکستان سے بھی معذرت کر کے بڑے پن کا ثبوت دیں۔

اب صدر مشرف کہہ رہے ہیں کہ کوئی ان کے خلاف سازشیں کر رہا ہے وہ اس بات کی بھی وضاحتیں کر رہے ہیں کہ انہوں نے چیف جسٹس کو آرمی ہاؤس میں طلب نہیں کیا تھا وہ یہ بھی وضاحت کر رہے ہیں کہ انہوں نے چیف جسٹس سے ملاقات کے وقت آرمی چیف کی وردی اس لیے پہنی تھی کہ انہیں کراچی جانا تھا۔ وہ یہ ساری وضاحتیں کر کے اپنی کمزوری کا اظہار کر رہے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو وہ ایک لفظ ''سوری'' کہہ کر چیف جسٹس آف پاکستان کے خلاف انتقامی کارروائی بند کر دیں اور ان لوگوں کے خلاف کارروائی کریں جنہوں نے صدر کو یہ کمانڈو ایکشن کرنے کا مشورہ دیا تھا۔

[روزنامہ نوائے وقت لاہور ۱۹ مارچ ۲۰۰۷ء]

اسلام میں عدلیہ کا مقام

اسماعیل قریشی لکھتے ہیں:

عدل وانصاف کا تصور شروع ہی سے موجود ہے لیکن اس کی صورت مختلف رہی ہے اسلام کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے دنیا میں نظام عدل وقضا کو ٹھیک طور پر قائم کر دیا۔ خود سرور عالم ﷺ جن کی ذات مقدس واقدس منزہ عن الخطا تھی آپ نے اپنے آپ کو عوام کی عدالت کے سامنے پیش کر دیا تھا اگر مجھ سے کسی کے ساتھ کسی قسم کی کوئی زیادتی ہو رہی ہو تو وہ مجھ سے پورا بدلہ لینے کا حق دار ہے۔ واقعہ کی تفصیل کا موقع نہیں لیکن یہ حقیقت کھل کر سامنے آگئی کہ آپ کی شخصیت گرامی عدل وانصاف کا مکمل ترین نمونہ عمل ہے۔ اس لیے کسی کے ذہن میں آپ سے زیادتی کا تصور بھی نہ تھا۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں ایک عام آدمی ہوں اگر میں قانون الٰہی سے روگردانی کروں تو تمہیں یہ حق ہے کہ مجھے معزول کر دیا جائے اگر اس کے مطابق کرم کروں تو مجھ سے تعاون کرو۔ میرے نزدیک ظالم شخص وہ ہے جو کسی مجبور کا حق غصب کر لے میں اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھوں گا جب تک کمزور کا حق طاقتور سے چھین کر محروم کو واپس نہ کر دوں۔ وہ اپنے تمام دور خلافت میں اس سٹیٹ پالیسی پر کاربند رہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں عدلیہ کو انتظامیہ سے الگ کر دیا تا کہ وہ آزادانہ فیصلہ کر سکے۔ اس دور کے مشہور قاضی شریح نے ایک شخص کی شکایت پر انہیں اپنی عدالت میں طلب کیا جہاں وہ بحیثیت فریق پیش ہوئے۔ معاملہ خوش اسلوبی کے ساتھ طے پایا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں اپنی زرہ کے لیے جو ایک یہودی کے ناجائز قبضہ میں تھی اسی قاضی شریح کی عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا۔ وہاں عجیب واقعہ پیش آیا۔ قاضی عدالت نے جناب علی رضی اللہ عنہ کو

مخاطب کرتے ہوئے کہا ''ابوالحسن اپنے دعویٰ کے ثبوت میں شہادت پیش کریں'' یہ سن کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے چہرے سے ناگواری کی کیفیت ظاہر ہوئی۔ عدم ثبوت کی وجہ سے امیر المؤمنین کا دعویٰ خارج ہو گیا اور مقدمہ کا فیصلہ یہودی کے حق میں صادر ہوا۔ یہودی نے پہنی ہوئی زرہ اتار کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قدموں میں ڈال دی اور کہنے لگا زرہ تو دراصل امیر المؤمنین کی تھی۔ میں نے عدالت میں انکار اس لیے کیا تھا کہ میں مسلمانوں کے انصاف کو دیکھنا چاہتا تھا کہ آیا وہ اس پر کاربند ہیں یا نہیں؟ یہ فیصلہ سن کر یقین ہو گیا کہ اس معاملہ میں وہ پوری طرح کامیاب ہیں۔ اس نے کہا ''جب تک مسلمانوں کی سلطنت عدل وانصاف پر قائم رہے گی ان کا ملک اور حکومت بھی قائم رہے گی۔ ورنہ ہماری طرح ان سے بھی حکومت وریاست چھین لی جائے گی۔ اس سے بھی عجیب تر بات یہ ہوئی جب قاضی نے امیر المؤمنین سے دریافت کیا کہ جب میں نے آپ کو ثبوت پیش کرنے کے لیے کہا تو کیا یہ بات آپ کو ناگوار گزری؟

آپ نے فرمایا ثبوت کے مطالبہ پر نہیں بلکہ تمہارے طرز تخاطب سے کاروائی انصاف میں نقص محسوس ہوا کیونکہ تم نے مجھے میرے نام کی بجائے میری کنیت ''ابوالحسن'' سے مخاطب کیا (عرب میں کنیت کے خطاب میں تعظیم کا پہلو نکلتا ہے) حالانکہ عدالت کے سامنے ہم دونوں یکساں فریق تھے۔

انصاف کو شفاف طور پر نظر آنے کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نظر انسانی نفسیات کی ان گہرائیوں تک پہنچی تھی جہاں انسانی دماغ کی رسائی ممکن نہیں۔ اس سے آئندہ نسلوں کو یہ بتلانا مقصود تھا کہ عدل وانصاف کا کوئی پہلو انسان کی نظر سے پوشیدہ نہ رہے کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ وہ تو مقربین یادگار نبوت تھے آدمی ان سا قلب وجگر کہاں سے لائے مگر یہ بات فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ ان ہستیوں نے وقت کے رگ روان پر اپنے نقش پا اس لیے نہیں چھوڑے کہ ان کا تذکرہ صرف بطور تبرک کیا جائے۔ خیر ان

کے علاوہ بھی تاریخ نے مسلمان حکمرانوں اور عدالت کے سربراہوں کے واقعات کو زندہ رکھا ہوا ہے جو ان کے نظام حکومت و عدالت کی ناقابل تردید شہادت ہے۔ یوں تو واقعات بے شمار ہیں یہاں ہم صرف دو واقعات کا ذکر کریں گے۔

ایک واقعہ تو اس دور حکومت کا ہے جب خلافت باشادہت میں تبدیل ہو چکی تھی۔ ایک مسلمان حکمران کی تیراندازی سے ایک بیوہ ماں کا بیٹا مر گیا۔ سلطان کے خلاف کوئی شہادت موجود نہ تھی۔ بیوہ قاضی وقت کی عدالت میں پہنچ گئی اور اس کو اپنی دردناک داستان سنائی۔ قاضی نے عدالت کے کارندے کو بادشاہ کے پاس بھیجا کہ وہ جا کر ان کو عدالت میں حاضر ہونے کا حکم سنائے' اگر تعمیل سے انکار کرے تو عمامہ سے ہاتھ باندھ کر ہماری عدالت میں لائے۔ یہ انتہائی سخت ترین مرحلہ تھا۔ عدالتی کارندے کو دربار میں پہنچنے سے پہلے روک دیا گیا جس پر اس نے دربار کے باہر اذان دینا شروع کر دی۔ بے وقت اذان پر اسے دربار میں طلب کیا گیا جہاں اس نے قاضی کے طلبی عدالت کا حکم سنایا۔ سلطان اس کے ساتھ عدالت پہنچا۔ بیوہ نے قصاص کا مطالبہ کیا۔ سلطان نے بیوہ کو خون بہا دے کر اسے رضامند کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے خون بہا لینے سے انکار کر دیا اور بغیر کسی معاوضہ کے سلطان کو معاف کر دیا۔ اس طرح سلطان کو عدالت میں رہائی ملی۔

دوسرا مشہور واقعہ سلطان مراد کا ہے جو ترکی کا فرمانروا تھا (۱۳۲۶ء تا ۱۳۸۸ء) جس کی سلطنت مشرق اور یورپ کے اندر تک پھیلی ہوئی تھی اس نے دارالحکومت میں ایک شاندار مسجد کی تعمیر کے لیے ایک ماہر معمار کو مقرر کیا۔ مسجد بادشاہ کی منشا کے مطابق تعمیر نہ ہو سکی اور اس میں کچھ نقص رہ گیا جس پر سلطان نے مشتعل ہو کر معمار کا ہاتھ قلم کر دیا۔ معمار قاضی کی عدالت میں پہنچا اور اس نے دادرسی طلب کی۔ قاضی نے شہنشاہ وقت کو عدالت میں حاضر ہونے کا حکم دیا۔

سلطان مراد نے جس کے نام سے یورپ کے بادشاہ خوف کے مارے لرز جاتے تھے۔ قاضی کی عدالت میں بطور مجرم حاضر ہو کر اعتراف جرم کر لیا۔ قاضی نے فیصلہ سنایا کہ تمہارا ہاتھ بھی قصاص میں کاٹ دیا جائے گا۔ سلطان نے اپنا ہاتھ معمار کے سامنے پیش کر دیا لیکن معمار نے سلطان کو حکم الٰہی کی تعمیل کرتے ہوئے دیکھا تو اسے معاف کر دیا مگر قاضی نے سرزنش کی کہ حکمران کو اپنے اختیار سے تجاوز کا حق حاصل نہیں اسلام کے قانون عدل میں شاہ و گدا سب برابر ہیں۔

علامہ اقبال نے اس تاریخی واقعہ کو اپنی مثنوی ''اسرار و موز'' میں اس طرح نظم کیا ہے کہ سارا منظر حقیقت بن کر آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ آخر میں کہتے ہیں ''یافت مورے پر سلیمانے ظفر سطوت آئین پیغمبر نگر'' ساری اسلامی تاریخ میں کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں کہ کسی حکمران بادشاہ یا شہنشاہ کو کسی قاضی نے اپنے دربار میں طلب کیا ہو اور اس حکمران نے عدالت میں حاضر ہونے سے انکار کیا ہو۔ اس سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ اسلام میں عدلیہ کا کتنا اعلیٰ مقام اور کتنا احترام ہے۔

اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کسی دور میں بھی ملزم یا مدعی کے مقدمے کی کاروائی بند کمرے میں کی گئی ہو۔ تمام کاروائی ہمیشہ کھلی عدالت میں ہوتی رہی ہے تا کہ جو بھی کاروائی ہو ہر کسی کو عین قانون کے مطابق ہوتی نظر آئے۔ اسی بات سے یورپ میں یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ انصاف نہ صرف کیا جائے بلکہ انصاف کو ہوتے ہوئے بھی نظر آنا چاہیے مگر مملکت اسلامی جمہوریہ میں عدلیہ اور اس کے سربراہ کے ساتھ جو سلوک کیا گیا ہے وہ اسلام کے بینادی اصولوں سے سراسر انحراف ہے۔ عدلیہ کی بے حرمتی خود حکومت اور حکومت کے اپنے کارندوں کی تذلیل ہے جسکا بروقت تدارک ضروری ہے۔

جنرل مشرف عوام سے اس انداز سے مزید مہلت مانگ رہے ہیں جیسے عوام نے

ہی انہیں اقتدار سونپا ہے؟ کیا وہ گزشتہ کئی سالوں سے عوام کی مرضی سے حکومت کر رہے ہیں؟ دنیا جانتی ہے کہ وردی کے ذریعے انہوں نے ذاتی اختلاف کی بنا پر میاں نواز شریف کی منتخب حکومت کو برطرف کر کے اقتدار پر قبضہ کیا تھا۔ وردی اب بھی ان کے پاس ہے جبکہ انہوں نے ٹیلی ویژن پر آ کر قوم سے وردی اتارنے کا وعدہ کیا تھا لیکن وہ وعدہ ابھی تک ایفا نہیں ہوا۔ ایسی صورت میں عوام ان پر کس طرح اعتماد کر سکتے ہیں حکومتی حلقے یہ کہنے میں کوئی شرم نہیں کرتے کہ ہم اپنی کارکردگی کی بناء پر عوام سے ووٹ اور اعتماد کے حقدار ہیں۔

ہم نا حق مجبوروں پہ تہمت ہے مختاری کی

جو چاہیں سو آپ کرے ہیں، ہم کو عبث بدنام کیا

جنرل پرویز مشرف یہ بھی کہتے ہیں کہ وردی کی وجہ سے جمہوریت مضبوط ہوئی ہے۔ حالانکہ ملک کی انتظامیہ، مقنّنہ اور عدلیہ فرد واحد کی زد میں ہے دو مہینوں میں تین وزرائے اعظم کا اقتدار سب نے دیکھ لیا ہے بلوچستان اور قبائلی علاقوں میں گھمسان کا رن پڑا ہوا ہے قوم کے عظیم محسن اور نامور سائنسدان عبدالقدیر خان گھر میں نظر بند ہیں جبکہ بھارت کا سائنسدان ملک کا صدر بنا ہوا ہے۔ پاکستان کے چیف جسٹس کی غیر قانونی جبری معطلی اور ان کے ساتھ شرمناک سلوک حکومت کا سیاہ کارنامہ ہے جس سے دنیا میں پاکستان کی رسوائی ہو رہی ہے۔

نصاب تعلیم سے اسلامیات کے مضامین اور قرآنی آیات کا اخراج شرمناک واقعہ ہے۔ حقیقی بات یہ ہے کہ ملک کو سیکولر بنانے کی سازشیں کی جا رہی ہیں۔ رسوائے زمانہ حقوق نسواں ایکٹ کے ذریعے حدود اللہ کا حلیہ بگاڑ کر غیر اسلامی دفعات شامل کی گئی ہیں۔

باوردی حکومت جمہوری بنیادوں پر صحت مند سیاسی اور اقتصادی نظام قائم کرے

میں ناکام رہی ہے۔ عالمی سیاست میں ہماری جانبداری اور مغرب دوستی بلکہ امریکہ کی غلامی کسی کام نہ آئی۔ ہم نے امریکہ کے اشارے پر افغانستان کی بربادی اور مسلمانوں کی تباہی میں اس کا ساتھ دیا۔ بلوچستان اور قبائلی علاقوں پر فوجی آپریشن ہو رہے ہیں جن سے ہماری مغربی سرحدیں غیر محفوظ ہوگئی ہیں۔ ابھی تک ہمارے کئی ہوائی اڈے امریکہ کے کنٹرول میں ہیں۔ ملکی دفاع کے نقطہ نظر سے اپنے ہوائی اڈوں پر غیر کا کنٹرول زہر قاتل ہے۔

آج کل ملک میں آئین کی بالادستی کے لیے وکلاء کی احتجاجی تحریک اور مظاہروں میں عوام کی شرکت نہ صرف حکومت کے خلاف عدم اعتماد کا اظہار ہے بلکہ مستقبل میں ایک صحت مند تبدیلی کی غماز ہے۔ باوردی حکمران اگر عقل کے ناخن لیں تو فوج اپنے فرائض منصبی کے لیے بیرکوں میں چلی جائے اور ایک عبوری حکومت قائم کرے ایک آزادانہ الیکشن کمیشن کی زیر نگرانی منصفانہ انتخابات عمل میں لائے جائیں اور اقتدار حقیقی نمائندوں کے سپرد کر دیا جائے۔ ایسی صورت میں ملک ترقی و خوشحالی کی راہ پر گامزن ہو سکے گا۔ ان شاء اللہ

چیف جسٹس کی بحالی

جسٹس خلیل الرحمن رمدے کی سربراہی میں عدالت عظمیٰ کے ۱۳ رکنی بنچ کا چیف جسٹس افتخار چوہدری کے خلاف ریفرنس کا تاریخ ساز فیصلہ ''نظریہ ضرورت'' کے کلنک کو ہمیشہ کے لیے دھونے کا باعث ثابت ہوگا۔

یہ فیصلہ تاریخ ساز ہے اس میں کوئی شبہ نہیں فیصلے نے پاکستان کی عدلیہ کے کردار کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ کسی کو مجال انکار نہیں۔ فیصلے نے نظریہ ضرورت جیسے مکروہ فلسفے اور پے در پے فوجی حکومتوں کو جواز بخشنے والے ہتھیار کو ناکارہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ اس پر

بھی دورائے نہیں پائی جاتیں۔ جمعہ ۲۰ جولائی سپریم کورٹ آف پاکستان نے چیف جسٹس کو ان کے عہدے پر بحال کر کے اور ۹ مارچ کو جنرل کی طرف سے ان کی برطرفی کے اقدامات کو غیر آئینی اور غیر قانونی قرار دے کر ثابت کر دیا ہے کہ آئین پاکستان کے مقابلے میں فوجی آمریت کے فیصلے ناقابل قبول ہیں اور مسترد کر دیئے جانے کے قابل پاکستان عوام نے سپریم کورٹ کے شارٹ آرڈر سے پہلے اور ۹ مارچ کے رعونت فکر وعمل والے اقدام کے فوراً بعد اپنا روعمل ظاہر کر کے اپنا فیصلہ دے دیا تھا۔ یوں اپنے اعلیٰ آئینی وقانونی اور قومی شعور کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ اس کے بعد سپریم کورٹ کا عہد ساز فیصلہ نہ صرف آئین وقانون کی بالادستی کا مظہر ہے بلکہ پاکستان کے عوام کے خیالات، جذبات اور امنگوں کا عکاس بھی۔ ہمارے ملک کی ۶۰ سالہ تاریخ میں بار بار صدموں سے دوچار ہونے والی قوم نے دوسری مرتبہ قومی سطح کے ایک فیصلے پر بے پناہ خوشی ومسرت اور والہانہ جوش وجذبے کا اظہار کیا ہے۔ پہلی بار ۲۸ مئی ۱۹۹۹ء کو یہ ساعت نصیب ہوئی تھی۔ جب ایک منتخب اور آئینی وقانونی مینڈیٹ رکھنے والے وزیراعظم نے امریکہ کے سخت دباؤ اور کچھ حاضر سروس جرنیلوں کے مشورے کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے پاکستان کے ایٹمی طاقت ہونے کا اعلان کیا۔ دوسری مرتبہ یہ موقع ملا ہے۔ ملک کی سب سے بڑی عدالت انصاف کے ۱۳ رکنی بڑے اور فل بینچ نے وردی پوش اور خود کو غیر آئینی طور پر مسلط کرنے والے حکم وقت کے حکم پر خط تنسیخ پھیر دیا ہے۔ نئی تاریخ رقم کی ہے۔ آئین مملکت کی بالادستی منوائی ہے۔ قانون کی حکمرانی کا پرچم بلند کیا ہے۔ پاکستان اس کے عوام اور اعلیٰ ترین عدالتی ادارے کی جانب سے دنیا بھر کو یہ پیغام بھیجا ہے کہ ہماری قوم کا شعور زندہ وتوانا ہے۔ اس کا ضمیر جاگ رہا ہے اس کے آئینی ادارے یکسر مر نہیں گئے۔ اس کے اندر مہذب آئین کی مکمل پیروی اور جمہوری عمل کے ساتھ زندہ رہنے کی تمنا پوری آب وتاب کے ساتھ موجود ہے۔ یہ

فوج یا کسی بھی غیر منتخب ادارے کی حکمرانی کو ہر صورت میں مسترد کرتی ہے۔ پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ سب سے بڑی عدالت انصاف کی جانب سے فوجی حاکم وقت کو آئینہ دکھایا گیا ہے۔ یہ دن دیکھنے کے لیے ہماری قوم ترس گئی تھی۔ ۵۴۔۱۹۵۵ء کو نظریہ ضرورت کے بانی جسٹس منیر کے پہلی آئین ساز اسمبلی کو تحلیل کر دینے کے حق میں فیصلے پھر دوسو بمقابلہ وفاق جس نے ۱۹۵۸ء کے پہلے مارشل لاء کو جواز بخشا اس کے بعد ۱۹۷۷ء کا نصرت بھٹو، بمقابلہ وفاق کا فیصلہ جس کے ذریعے نظریہ ضرورت کو از سرنو زندہ کیا گیا۔ آخر میں ۲۰۰۰ء کا ظفر علی شاہ کیس جس میں جسٹس ارشاد نے جنرل مشرف کے اقتدار پر فوجی قبضے کو جائز قرار دینے کے لیے نظریہ ضرورت کے مردے کو ایک مرتبہ پھر قبر سے نکالا۔ ان تمام فیصلوں نے پاکستان کی اعلیٰ عدالتوں کے کردار کو منفی طور پر متاثر کیا تھا اور ملک وقوم کو بھی فوجی حکومتوں کے اندھے غار میں دھکیلا۔ عوام کو مایوس کیا۔ اس دوران ۱۹۹۳ء میں اگرچہ سپریم کورٹ نے (B)۲،۵۸ کی فوجی ترمیم کے تحت صدر غلام اسحاق کے ہاتھوں برطرف ہوئے نواز شریف کی منتخب حکومت کو بحال کر دیا تھا لیکن مرحوم صدر اور اس وقت کے چیف آف دی آرمی سٹاف جنرل عبدالوحید کاکڑ نے ٹھان لی تھی کہ اس فیصلے کو عملی طور پر قائم و دائم نہیں رہنے دیا جائے گا چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

اب جو سپریم کورٹ نے فل بنچ نے پچھلی تمام شکایات کو رفع کر دیا ہے۔ شاندار فیصلہ صادر کیا ہے۔ امید رکھنی چاہیے پاکستان کی ہیت اجتماعی پر اس کے مثبت اثرات، گہرے دورس، ہمہ گیر اور پائیدار ہوں گے۔ جنرل مشرف اور وزیر اعظم شوکت عزیز کی جانب سے فوری ردعمل آیا ہے کہ فیصلے کا احترام کریں گے لیکن ملک بھر کے عوام قانونی اور سیاسی حلقوں کی جانب سے یہ مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ یہ دونوں عہدیدار مستعفی ہو جائیں۔ ان کے ۹ مارچ والے اقدام نے پاکستان کو اتنے بڑے

عدالتی بحران میں مبتلا کر دیا۔ چیف جسٹس آف پاکستان کی سرعام بے حرمتی کی گئی۔ ان پر وردی اور ایجنسیوں کا رعب ڈالا گیا۔ بے تکے الزام لگائے گئے محض اس لیے کہ دوسرے جرات مندانہ فیصلوں کے علاوہ چیف جسٹس جناب افتخار محمد چودھری نے سٹیل مل کا پاکستان کو کوڑیوں کے مول پر مرضی کے گاہکوں کے سامنے بیچ دینے اور اس ضمن میں چوٹی کے حکومتی عہدیداروں کا اربوں روپے کی کرپشن سے مالا مال ہونے کا منصوبہ خاک میں ملا کر رکھ دیا تھا۔ جنرل مشرف اور شوکت عزیز صاحب مستعفی ہوتے ہیں یا نہیں لیکن فیصلے کی روح تقاضا کرتی ہے پاکستان میں فوجی اور ہر قوم کی غیر آئینی حکمرانی سے نجات حاصل کر لی جائے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ آئندہ انتخابات جو جنوری ۲۰۰۸ء ہونے ہیں ان کو ہر صورت میں منعقد کیا جائے۔

لال مسجد اور حکومتی مؤقف!

سانحہ لال مسجد پورے ملک کے مسلمانوں کے لیے شرمندگی اور پریشانی کا باعث بن گیا ہے۔ ہر فرد یہ سوچ رہا ہے کہ یہ آخر کیا ہوا اور کیوں ہوا؟ اس میں کس کی غلطی تھی یہ کس کی سازش؟ غازی عبدالرشید کی کوشش کو ہم غلط نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ وہ مرد مجاہد حق پر کھڑا تھا اور حکومت کی طرف سے ملنے والی دھمکیوں کے آگے جھکنے کی بجائے انہوں نے کہا کہ میں جھکنے کی بجائے دلیرانہ انداز میں مرنے کو ترجیح دوں گا۔

حکومتی نمائندوں اور فوج نے لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے خلاف وہ جنگی حکمت عملی استعمال کی ہے جو عام طور پر دشمنوں کے خلاف استعمال کی جاتی ہے جس سے عوام کے دلوں کو دشمن کے خلاف کیا جاتا ہے اور ان کے دلوں میں ان کے لیے ہمدردیاں ختم کی جاتی ہیں اسی حکمت عملی کے تحت حکومت نے آپریشن کے دوران مختلف بیانات دیے جو ایک ایک کر کے سب جھوٹے ثابت ہو رہے ہیں۔ پہلے حکومت نے یہ الزام

لگایا کہ لال مسجد انتظامیہ نے جامعہ حفصہ کے طلبہ وطالبات کو یرغمال بنا رکھا ہے اورانہیں باہر آنے نہیں دیا جارہا جبکہ لال مسجد اور جامعہ حفصہ سے باہر آنے والے طلبہ اور طالبات کے بیان کے مطابق ان لوگوں کو لال مسجد انتظامیہ نے زبردستی باہر بھیجا ہے جبکہ وہ باہر آنا نہیں چاہتے تھے پھر غازی عبدالرشید کا چوہدری شجاعت حسین سے یہ مطالبہ کرنا کہ ہمارا جو بھی ہوا اس کے بعد جامعہ کے طلبہ اور طالبات کی کفالت وہ اپنے ذمہ میں لیں۔ یہ بات بھی اس کو ظاہر کرتی ہے کہ جو طلبہ وطالبات لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے اندر باقی تھے وہ اپنی مرضی سے تھے نہ کہ یرغمال کیونکہ یرغمال بنانے والا یرغمالیوں کو اپنی حفاظت کے لیے رکھتا ہے وہ ان کی ذمہ داری کسی کو سونپنے کی بات نہیں کرتا۔ اور غازی عبدالرشید کی اس وصیت کے مطابق چوہدری شجاعت حسین نے ان بچیوں کی کفالت قبول بھی کرلی۔

اس کے علاوہ حکومت یہ بیان بھی دے رہی تھی کہ غازی عبدالرشید اپنے آپ کو حکومت کے حوالے کرنا چاہتے ہیں مگر اندر موجود لوگوں نے انہیں یرغمال بنا رکھا ہے کیونکہ جب ان سے کوئی مطالبہ کیا جاتا ہے یا انہیں کوئی تجویز دی جاتی ہے تو وہ اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرکے ''ہاں'' یا ''ناں'' میں جواب دیتے ہیں محض مشورہ کرنے سے یرغمال ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ فرد واحد کی زندگی کا سوال ہو تو انسان خود فیصلہ کر لیتا ہے لیکن جب اس کے ساتھ ہزاروں معصوم جانیں بھی داؤ پر لگی ہوں تو اکثریت کی رائے کا احترام کیا جاتا ہے فرد واحد کا خود فیصلہ کرنا اخلاقاً بھی درست نہیں ہوتا۔ پھر حکومت کا الزام لگانا کہ لال مسجد میں غیر ملکی دہشت گرد موجود ہیں اور ان کے پاس بڑے پیمانے پر خطرناک اور جدید اسلحہ موجود ہے لیکن لال مسجد کے آپریشن کے مکمل ہوجانے بعد حکومت کا یہ جھوٹ بھی کھل کر عوام کے سامنے آگیا جب اپنے ملک کے اخباری نمائندوں اور خصوصاً سی این این (جو کہ حکومت کے اس آپریشن کا سب سے

بڑا حمایتی تھا) کے بیان کے مطابق حکومت کی طرف سے لگائے گئے تمام الزامات اور دعوے غلط ہیں کیونکہ لال مسجد میں یا جامعہ حفصہ میں نہ تو غیر ملکی دہشت گردوں کا کوئی سراغ ملا، نہ کوئی سرنگ، نہ اسلحہ کے ذخیرے، اگر ملے تو لال مسجد اور جامعہ حفصہ کی دیواروں پر گولیوں کے سوراخ، دھویں سے کالی چھتیں، نورانی قاعدے، قرآن اور حدیث کے بکھرے اوراق، پلاسٹک کی پلیٹیں، جلی ہوئی چارپائیاں اور وہ فوجی جوان کو مسجد اور مدرسہ میں دندناتے پھر رہے تھے جو لاشیں وہاں سے ملی وہ شناخت کے قابل نہیں تھیں کیونکہ اس آپریشن میں فوج نے اپنی فوجی مہارت ثابت کرنے کی کوشش ہی نہیں کی اور اپنی جانوں کو خطرے میں ڈال کر لال مسجد انتظامیہ کو زندہ پکڑنے کی بجائے دشمنوں کی طرح ان کو ہلاک کرنے کی پالیسی پر عمل کیا اسی بنا پر آمنے سامنے لڑنے کی بجائے گن شپ ہیلی کاپٹر، ٹینک، اور کثیر تعداد میں بموں کا استعمال کیا گیا گویا ان کے لیے لال مسجد والے اپنے مسلمان یا ملکی عوام نہیں بلکہ غیر ملکی دشمن تھے اس لئے مفاہمت کی طرف سنجیدگی سے توجہ ہی نہیں دی گئی۔

حکومت کا دعویٰ یہ ہے کہ انہوں نے آخر وقت تک لال مسجد والوں کے ساتھ مفاہمانہ طرز عمل اختیار کیا مگر لال مسجد والوں نے کوئی پیش رفت نہیں دکھائی لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے جبکہ علماء وفد کی کوششوں سے حکومت کے نمائندوں اور عبدالرشید غازی کے درمیان ایک مصالحتی فارمولہ طے ہو چکا تھا جس فارمولے پر بظاہر وزیر اعظم شوکت عزیز نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا لیکن پھر اس مصالحتی فارمولے کو حتمی منظوری کے لیے ایوان صدر بھیجا گیا۔ جبکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی کیونکہ ملک کا چیف ایگزیکٹو کا عہدہ وزیر اعظم کو حاصل ہے نا کہ صدر کو، صدر اپنے معاملات میں وزیر اعظم سے مشورہ کرنے کا پابند ہے نا کہ وزیر اعظم کو صدر سے مشورہ کرنے کا۔ لیکن صدر مشرف نے اس مصالحتی فارمولہ میں تبدیلی

کردی۔ جو ان کے دوغلے پن کی عکاسی کرتا ہے۔

حکومتی نمائندے وزیر اطلاعات ونشریات طارق عظیم ایک بیان میں کہتے ہیں کہ حکومت اور علماء وفد کے درمیان آخری رات تک کسی فارمولہ پر اتفاق نہیں ہوا تھا اور پھر دوسرے بیان میں کہتے ہیں کہ ایوان صدر سے آنے والے مسودے اور پہلے مسودے (جو وہ لے کر ایوان صدر گئے تھے) میں کوئی فرق نہیں۔ اس سے ان کا جھوٹ ثابت ہوتا ہے کہ اصولی طور پر کوئی فارمولہ ایوان صدر اسی وقت جا سکتا ہے جب اس پر اتفاق ہو چکا ہو لیکن بقول طارق عظیم کہ جب کسی فارمولہ پر اتفاق ہی نہیں ہوا تو پھر اسے ایوان صدر بھیجنے کا کیا مقصد تھا۔ دوسری طرف چوہدری شجاعت حسین نے گول مول انداز میں یہ بیان دیا کہ الفاظ میں تبدیلی ضرور کی گئی ہے مگر مفہوم وہی ہے۔ یہ بھی ان حکومتی نمائندوں کی مکاری اور عیاری کا ثبوت ہے کیونکہ الفاظ کی تبدیلی اسی لیے کی جاتی ہے کہ مفہوم کو بدلنا مقصود ہوتا ہے اگر مفہوم کو بدلنے کا ارادہ نہ ہو تو الفاظ میں تبدیلی کرنے کی کوئی وجہ سمجھ نہیں آتی۔ ان تمام باتوں کے پیش نظر ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ حکومت لال مسجد انتظامیہ کے ساتھ حقیقتاً کوئی مفاہمت کرنا ہی نہیں چاہتی تھی وہ صرف پاکستانی عوام کو دھوکہ میں رکھ کر اپنا مقصد پورا کرنا چاہتے تھے۔ جس کی عکاسی خود پرویز مشرف نے اپنے بیان سے کر دی تھی کہ ''لال مسجد والے باہر آجائیں ورنہ مارے جائیں گے۔''

سابق آرمی چیف جنرل مرزا اسلم بیگ کے بیان کے مطابق پرویز مشرف پہلے دن ہی سے لال مسجد کے خلاف خونی آپریشن کے لیے مائنڈ سیٹ کر چکا تھا۔

جنرل حمید گل کے مطابق بھی لال مسجد میں غیر ملکی دہشت گردوں کا شوشا چھوڑنا فوج کو اس خونی آپریشن کے لیے تیار کرنے کا منصوبہ بھی پرویز مشرف کا تیار کردہ تھا۔

ان حقائق سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حکومت پہلے دن ہی سے مفاہمت کے حق میں نہیں تھی بلکہ اس کی منصوبہ بندی کچھ اور ہی تھی۔ جس کی بنا پر یہ خونی آپریشن ہوا لیکن اب مرنے والوں کی صحیح تعداد کو بھی چھپایا جارہا ہے۔ اس کے علاوہ جن لوگوں نے ہتھیار ڈال کر خود کو حکومت کے حوالے کیا تھا ان کا بھی کچھ پتہ نہیں۔ عدالتی حکم سے ان کو کیسے واپس لایا جا سکے گا؟ ان کا مقدمہ کون سنے گا؟ اور ان کا فیصلہ کب ہوگا؟

دوبارہ صدر.... کیوں اور کیسے؟

صدر جنرل پرویز مشرف نے سپین کے ایک اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا ہے کہ وہ موجودہ اسمبلیوں سے ہی دوبارہ صدر منتخب ہو جائیں گے۔ انہوں نے کہا کہ عام انتخابات نومبر میں ہو جائیں گے' انتخابات جمہوری اور آزادانہ ہوں گے۔

یہ پہلا موقع ہے کہ صدر جنرل پرویز مشرف نے اس قدر اعتماد سے واضح طور پر کہا ہے کہ وہ موجودہ اسمبلیوں سے ہی دوبارہ منتخب ہو جائیں گے۔ ان کے صدارتی عہدہ کی میعاد ستمبر میں ختم ہو رہی ہے اور ان کی خواہش ہے کہ سترھویں ترمیم سے ملنے والی گنجائش کے مطابق وہ ستمبر میں انہی اسمبلیوں سے وردی سمیت منتخب ہو جائیں۔ صدر جنرل پرویز مشرف کی خواہش پر کوئی پابندی تو نہیں لگائی جا سکتی مگر انہیں خود اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ جو اسمبلیاں اپنی آئینی میعاد پوری کر رہی ہیں وہ اخلاقی طور پر آنے والے صدر کا انتخاب کس طرح کر سکتی ہیں؟ اگر عام انتخابات سے قبل صدر مملکت کے عہدہ کی میعاد ختم ہو رہی ہے تو اس کے لیے کوئی آئینی حل ڈھونڈا جائے یا آئین میں دی گئی گنجائش کے مطابق چیئرمین سینٹ کو منصب سونپ کر اور نو منتخب اسمبلیوں کے اجلاس کے بعد آئینی طریق پر عمل کرتے ہوئے باقاعدہ صدر کے عہدہ کا

انتخاب کیا جائے اور اسمبلی میں اس بات کا جائزہ لیا جائے کہ صدر مملکت باوردی یا وردی اتار کر بھی الیکشن میں حصہ لینے کے اہل ہیں یا نہیں؟

جنرل پرویز مشرف تقریباً گزشتہ آٹھ برسوں سے چیف ایگزیکٹو اور صدر کے عہدہ پر متمکن اور عملاً سیاہ وسفید کے مالک ہیں مگر مزید پانچ برس تک مسلسل اقتدار میں رہنے کی ان کی خواہش انسانی فطرت کے مطابق تو ہوسکتی ہے مگر انہیں اس پر بھی غور کرنا چاہیے کہ کیا یہ خواہش آئین قانون اور جمہوریت کے اصولوں کے مطابق بھی ہے یا نہیں ان کے اس عرصہ اقتدار پر دنیا کے جمہوری حلقوں میں تنقید ہو رہی ہے اور پاکستان کے عوام کی معاشی حالت کمزور ہوئی قرضے بڑھ گئے ہیں' خط افلاس سے نیچے زندہ رہنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ بے روزگاری بڑھ گئی ہے ملک بھر میں بے چینی اور بے اطمینانی میں اضافہ ہوا ہے۔ روپے کی قیمت میں اس قدر کمی ہوگئی ہے کہ عملاً پاکستانی روپیہ ٹیڈی پیسے سے بھی کم تر ہوگیا ہے۔ انہوں نے ملک میں کسی ڈیم کی تعمیر بھی شروع نہیں کی اور نہ ہی کوئی ایسا پروگرام شروع کیا ہے جس سے عوام کی حالت سدھر سکے۔ پاکستان میں امن وامان کی صورتحال اتنی خراب ہے کہ تاریخ میں پہلے کبھی ایسی نہ تھی اور پاکستان خارجہ تعلقات کے لحاظ سے یکا وتنہا ہے۔ ناکام ترین خارجہ پالیسی نے پاکستان کو بدنام کر دیا ہے۔ ایسے حالات میں صدر پرویز مشرف اور ان کی حمایت یافتہ حکومتی جماعت کو سوچنا چاہیے کہ وہ ایک دفعہ مزید صدر منتخب ہوکر کیا کریں گے؟

بندۂ عاجز ناکارہ
محمد علی جانباز
خادم جامعہ رحمانیہ، سیالکوٹ



مکتبہ رحمانیہ

ناصر روڈ سیالکوٹ

Ph:052-4591911 Mob:03006161913